

من اور دو شیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

فروری 2013

خواتین کا مجلہ

PDFBOOKSFREE.PK





### پکوان

- 284 آپ کا باورچی خانہ شائستہ الحسن  
286 موم کے پکوان خالدہ جیلانی

### نفسیات

- 288 نفسیاتی ازدواجی مجھین عدنان

### بیوٹی بکس

- 290 بیوٹی بکس کے مشورے امت الصبور

### رنگارنگ پھول

- 264 رنگارنگ سلسلہ شگفتہ حیاہ  
281 خبریں و بریں تبصر نشاط  
271 روشن حرف آئینہ مقدرہ

### میری بیاض ہے

- 267 آپ کی بیاض ہے خالدہ جیلانی

فروری 2013

جلد 40 نمبر 10  
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ٹائم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

### مکمل ناول

- 162 زمیں کے آنسو نگہت سیما  
102 صحیح فیصلہ اسیر رزاقی

### ناولٹ

- 74 اہماں کا شفق سید عذرا آفریدی  
134 مسترد سائرہ رضا  
208 امید صبح بہار سمیرا شریف طوڑ

### افسانے

- 98 زندگی ایک ٹوٹ قانتہ رابعہ  
68 ایک سوچ نازیہ جمال  
150 حقیقت افراج خان  
259 وہ اک لڑکی عتیقہ مجیب

### نقصیں غریبیں

- 262 غزل انشاء اللہ خان انشا  
262 غزل احسان دانش  
263 غزل سحر انصاری  
263 غزل نظر سمک ارشد ملک

### سیر

- 12 سیر  
13 ادارہ  
274 نادرہ خاتون

### آپ

### کیا پردہ

- 19 انشائیج

### خاتون کی ڈائری

- 269 میری ڈائری سے امت الصبور

### مجھ سے ملے

- 22 باتیں مکارا سے شاہین رشید

### انٹرویو

- 28 مہناز سے ملاقات شاہین رشید  
272 خامشی کو زبان ملے ادارہ

### ناول

- 240 میرے خواب لوٹا دو نگہت عبداللہ  
32 گوہ گراں تھے ہم عنینہ سید

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے ریجن ماہنامہ شائع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق منسلک ہیں اور محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ویب سائٹ پر ڈرلنگ اور مالی تکمیل اور سلسلہ وار قطع کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



خواتین ڈائجسٹ کا فروری کا شمار ہلے حاضر ہیں۔

اسلامی سال کے لحاظ سے یہ ربیع الاول کا مہینہ ہے۔ وہ مبارک مہینہ جس میں کائنات کی عظیم ترین ہستی، محمد مصطفیٰ، سرور کائنات، خاتم الانبیاء و رحمۃ العالمین بن کر آئے۔ وہ عظیم شخصیت جس کی عظمت پر مسلمان ہی نہیں دنیا بھر کے دانش ور متفق ہیں کائنات کی وہ عظیم ہستی جن کائنات کوئی بے اور نہ کوئی ہوگا۔ انسانی تاریخ کی واحد ہستی جن کی حیات طیبہ کا ایک ایک لمحہ مستند حالت میں محفوظ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن پاک نازل کیا گیا جس میں چودہ سو سال گزرنے کے باوجود کوئی تحریف نہیں کی جاسکتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت باسعادت حسب روایت پوری شان و شوکت سے منایا گیا۔ میرٹ لیدی کی محافل منعقد کی گئیں۔ ذیل ایلار نے خصوصی نشریات کا اہتمام کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت پر مسلمان کا ایمان ہے لیکن یہ محبت اسی وقت حقیقی ہوگی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر پوری طرح عمل کیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انسانی علاقائی لسانی تعصبات کا خاتمہ کر کے اعلان کیا کہ کسی انسان کو دوسرے پر برتری حاصل ہے تو صرف تعزیری کی بنیاد پر وہ لوگ جو اللہ سے ڈرتے ہیں، اس کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔

تاریخ انسانی گواہ ہے کہ دنیا میں وہ قومیں تباہ و برباد ہو گئیں جنہوں نے طاقت کو عزت و شرف کا معیار بنایا۔ اس وقت ہمارا معاشرہ جس شکست و ذلت کا شکار ہے اگر عزت کا معیار دیادی شان و شوکت اور اقتدار کے بجائے تعزیری کو بنیاد بنائے حقیقی انقلاب آسکتا ہے۔

### ست الکرہ نمبر

خواتین ڈائجسٹ کی عمریں ایک اور سال کا اضافہ ہونے لگی ہیں۔ اپریل کا شمار ست الکرہ نمبر ہوگا۔ ست الکرہ نمبر کی تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں۔ معنی میں سے دعا مست ہے اپنی تحریریں جلد از جلد جو ادین تاکہ ست الکرہ نمبر میں جگہ پاسکیں۔

ست الکرہ نمبر کے حوالے سے ایک خوشخبری تاریخ کو سناتے ہیں۔ اس میں آپ کی پسندیدہ معنی میں کی تحریروں کے ساتھ معنی میں کے حوالے سے ایک نیا سلسلہ بھی شامل ہوگا۔

### اس شمارے میں،

- آپ رضائی کا مکمل ناول۔ صحیح فیصلہ،
- نگہت سہا کا مکمل ناول۔ زمین کے آنسو،
- سعید عزیز آفریدی، ساثرہ رضا اور سمیرا شریف طوہ کے ناول،
- نازیر جمال، فائزہ راجہ، افراخ خان اور عنیقہ محمد بیگ کے افسانے،
- بازیں ماورائے،
- وہ جواب ہم میں نہیں۔ گلوکارہ مہناز بیگم کی باتیں،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسانی ازدواجی الجینس اور عدنان کے مشورے،
- نئے سال کا پہلا شمارہ آپ کو کس سال کا؟ آپ کی لائے کا انتظار رہے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی ناممکن اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتاب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو تمام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

## کرن کرن روشنی

ادارہ

### وصیت کے متعلق احکام و مسائل

#### وصیت کی ترغیب

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”مسلمان کا یہ حق نہیں کہ اگر اس کے پاس کوئی ایسی چیز موجود ہو جس کے بارے میں وہ وصیت کرنا چاہتا ہو تو وہ دیراتیں بھی اس حال میں گزارے کہ اس کی وصیت اس کے بارے میں لکھی ہوئی اس کے پاس موجود نہ ہو۔“

#### قوائد و مسائل :

- 1- وصیت ایسی چیز ہے کہ اس کا فائدہ اور ثواب مرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے، جب وصیت پر عمل کیا جاتا ہے۔
- 2- انسان کو اپنی موت کے وقت کا علم نہیں، ممکن ہے بندے کو اس حال میں موت آجائے کہ اسے وصیت کرنے کا موقع نہ ملے، اس لیے بہتر ہے کہ

وصیت ہر وقت تیار رکھی جائے۔

- 3- پہلے سے وصیت لکھ رکھنے کا یہ بھی فائدہ ہے کہ انسان اس میں حسب خواہش تبدیلی کر سکتا ہے۔
- 4- قرض اور امانت وغیرہ کی تفصیل ہمیشہ لکھ کر رکھنی چاہیے۔

#### محروم کون

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”محروم وہ ہے جو اپنی وصیت کرنے سے محروم رہا۔“

#### فائدہ :

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص وصیت کیے بغیر فوت ہو گیا، وہ ان فوائد سے محروم رہ گیا جو اسے وصیت سے حاصل ہو سکتے تھے۔ مثلاً ”صدقہ کرنے کی وصیت کرنا تو اسے بعد میں اس کا ثواب ملتا، قرض کی ادائیگی کی وصیت کرنا تو وارث اس کا قرض ادا کر دیتے



اور وہ بری الذمہ ہو جاتا۔ فوت ہونے کے بعد اس کو تہی کی تلافی ناممکن ہے، اس لیے ایسا شخص بہت سی خیر سے محروم رہ گیا۔

### شہادت کی موت

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص وصیت کر کے فوت ہوا، وہ سیدھی راہ پر اور سنت طریقہ پر (عمل کرتا ہوا) فوت ہوا۔ وہ تقویٰ اور شہادت کی موت مرا۔ اور اس حال میں مرا کہ اس کی بخشش ہو چکی تھی۔“

### وصیت میں نا انصافی کرنا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص اپنے وارث کو ترکہ دینے سے بھاگے گا (ایسی وصیت کرے گا جس سے جائز وارث کو حصہ نہ ملے یا اس کے اصل حصے سے کم ملے) تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اس کی جنت کی میراث سے محروم فرما دے گا۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”آدمی ستر سال تک نیک لوگوں والے کام کرتا رہتا ہے، پھر جب (مرنے وقت) وصیت کرتا ہے تو وصیت میں نا انصافی کرتا ہے، اس طرح اس کا انجام بڑے کام پر ہوتا ہے، چنانچہ وہ جہنم میں چلا جاتا ہے اور ایک آدمی ستر سال تک بڑے لوگوں والے کام کرتا رہتا ہے پھر (مرنے وقت) وصیت میں انصاف سے کام لیتا ہے تو اس طرح اس کا انجام نیک کام پر ہوتا ہے، چنانچہ وہ جنت میں چلا جاتا ہے۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو۔

”یہ حدیث اللہ کی (مقرر کی ہوئی) ہیں اور ہو اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برواری کرے، اے اللہ تعالیٰ جنتوں میں لے جائے گا

جن کے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرے اور اس کی (مقررہ) حدوں سے آگے نکلے۔ اسے وہ جہنم میں ڈال دے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔“

(سورہ نساء آیت 13-14)

### کفارہ

حضرت معاویہ بن قرقہ اپنے والد (حضرت قرقہ بن ایاس بن ہلال مزی رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس کی وفات کا وقت آیا تو اس نے وصیت کی اور اس کی وصیت اللہ کی کتاب کے مطابق تھی، اس کا یہ عمل اس کی زندگی میں ترک شدہ زکوٰۃ کا کفارہ بن جائے گا۔“

### زندگی میں بخل اور مرتبہ وقت فضول خرچی کی ممانعت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی:

”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے بتائیے کہ میرے حسن سلوک کا مستحق کون ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہاں! قسم ہے تیرے باپ (کے رب) کی! تجھے ضرورتاً توں گا۔ تیری ماں (تیرے حسن سلوک کی سب سے زیادہ) مستحق ہے۔“

اس نے کہا: ”پھر کون؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”پھر تیری ماں۔“

اس نے کہا: ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے میرے مال کے بارے میں بتائیے کہ میں اس میں سے کس طرح صدقہ کروں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہاں! قسم ہے اللہ کی! تجھے ضرورتاً توں گا۔ (وہ اس طرح ہے کہ) تو اس وقت صدقہ کرے جب تو تندرست ہو اور مال سے محبت رکھتا ہو تجھے زندہ رہنے کی امید ہو اور فقر کا اندیشہ ہو۔ (یہ صدقہ کا صحیح وقت ہے) اور مؤخر نہ کرنا حتیٰ کہ جب تیری جان ہمال (حلق نیک) پہنچ جائے، پھر تو کے میرا مال فلاں کو دے دینا، میرا مال فلاں کو بھی دے دینا۔ وہ تو ان ہی کا ہو چکا اگرچہ تجھے یہ (حقیقت) ناگوار محسوس ہو۔“

### فوائد و مسائل :

1- اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے قسم کھانا جائز ہے۔

2- جواب دینے سے پہلے تمہید کے طور پر کوئی بات کہنے سے مسائل جواب کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتا ہے، جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا ”میں تجھے ضرورتاً توں گا۔“

3- قسم صرف اللہ کی ذات کی کھانا جائز ہے جیسا کہ صحیح احادیث میں وارد ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ”اللہ تعالیٰ تمہیں پاپوں کی قسم کھانے سے منع فرماتا ہے، پس جو شخص قسم کھائے، وہ اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔“ اس لیے حدیث میں

”باپ کی قسم“ سے مراد ”باپ کے رب کی قسم ہے۔“

عربی زبان میں قرینہ کی موجودگی میں الفاظ حذف کر دینا عام ہے۔

4- حسن سلوک میں ماں کا حق زیادہ ہے کیونکہ وہ باپ کی نسبت زیادہ نرم دل اور زیادہ حساس ہوتی ہے، تاہم اگر ماں کسی ایسے کام کا حکم دے جو شرعاً ممنوع یا مکروہ ہو اور باپ اس غلط کام سے منع کرے تو باپ کا حکم ماننا ضروری ہے اور یہ ماں سے حسن سلوک کے منافی نہیں۔

5- صحت کی حالت میں صدقہ زیادہ افضل ہے کیونکہ اس وقت دل میں مال کی محبت زیادہ شدید ہوتی ہے اور اسے خرچ کرنا اس لیے بھی مشکل محسوس ہوتا ہے کہ مستقبل میں حالات خراب ہونے کا خطرہ

محسوس ہوتا ہے جبکہ موت کے وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ اب میں اسے استعمال تو نہیں کر سکوں گا، لہذا صدقہ کر کے فائدہ حاصل کر لوں۔ اس وقت دل میں مال کی محبت نہیں رہتی۔

6- زندگی کے آخری ایام میں صدقہ کرنا یا وصیت کرنا شرعاً درست ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عام حالات میں بھی صدقہ کا اہتمام کرنا چاہیے۔

صدقہ کا وقت

حضرت بسر بن جاش قرظی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہتھیلی پر لعاب مبارک ڈالا، پھر اپنی سبائے انگلی (اس کی طرف اشارے کے طور پر) رکھی اور فرمایا: ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے آدم کے بیٹے! تو مجھے کیسے عاجز کر سکتا ہے، حالانکہ میں نے تجھے اس جیسی چیز سے پیدا فرمایا، پھر جب تیری جان ہمال پہنچ جاتی ہے، یہ فرماتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حلق کی طرف اشارہ فرمایا۔

”تب تو کہتا ہے میں صدقہ کرتا ہوں۔ اب صدقہ کا وقت کمال ہے؟“

فوائد و مسائل :

1- اللہ تعالیٰ انسان کا خالق ہے، وہ ہر لحاظ سے بندے پر قدرت رکھتا ہے جب کہ بندہ ہر لحاظ سے اس کا محتاج ہے۔

2- یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے انسان کو ایک ناقابل ذکر حقیر چیز سے پیدا کر کے اسے اشرف المخلوقات بنا دیا۔

3- بعض مقالات پر صراحت کے بجائے کنائے کے الفاظ بولنا بہتر ہوتا ہے۔

تمہاری ترکے کی وصیت

حضرت عامر بن سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے والد (حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ) سے روایت کیا: انہوں نے فرمایا: ”خمس مکہ کے سال میں بیمار ہو گیا، موت کے



کنارے پہنچ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا۔ ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرا مال بہت زیادہ ہے اور میری وارث میری صرف ایک بیٹی ہے تو کیا میں اپنا وہ تمام مال صدقہ کروں؟“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”آؤھا؟“

فرمایا ”نہیں۔“

میں نے کہا ”تمہاری؟“

فرمایا ”تمہاری (جائز ہے) اور تمہاری بھی زیادہ ہے۔ تیرا اپنے وارثوں کو خوش حال چھوڑنا ایسے مفلس چھوڑ جانے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔“

فوائد و مسائل :

- 1۔ بیمار کی عیادت کرنا مسلمان کے حقوق میں شامل ہے اور یہ بہت بڑا نیک عمل ہے۔
- 2۔ جب انسان محسوس کرے کہ اس کا آخری وقت قریب ہے تو اس وقت اسے ترکے کے ایک تہائی حصے سے زیادہ صدقے کی وصیت نہیں کرنی چاہیے۔
- 3۔ اگر کوئی شخص تہائی حصے سے زیادہ کی وصیت کر کے فوت ہو جائے تو اس کی وصیت پر صرف تہائی ترکے تک عمل کیا جائے گا۔
- 4۔ بہتر یہ ہے کہ تہائی مال سے کم وصیت کی جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہائی کی اجازت دینے کے باوجود اسے ”زیادہ“ فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس حدیث سے یہی سمجھا ہے۔

دو چیزیں

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے آدم کے بیٹے! دو چیزیں (میں نے تجھے دی ہیں) ان میں سے ایک بھی تیرے ہاتھ

میں نہیں تھی۔ میں نے تیرے مال میں اس وقت تیرا حصہ مقرر کر دیا جب میں تیری سانس بند کرنا ہوں۔ (یہ اس لیے) تاکہ تجھے ایک صاف کروں اور (دوسری چیز) تیری زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد میرے بندوں کا تجھ پر نماز جنازہ ادا کرنا۔“

وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں

حضرت عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ”انہوں نے کہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب فرمایا جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری (اونٹنی) پر سوار تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری خوب جنگلی کر رہی تھی اور اس کا لعاب میرے کندھوں کے درمیان (پشت پر) گر رہا تھا۔ (اس موقع پر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ نے ہر وارث کو ترکے کا حصہ تقسیم کر کے دے دیا ہے، لہذا وارث کے لیے وصیت جائز نہیں۔ پھر بستر والے کا ہے اور بدکار کے لیے پتھر ہے۔ جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کا بیٹا ہونے کا دعو کرے یا اپنے آزاد کرنے والوں کے سوا کسی اور کی طرف آزادی کی نسبت کرے تو اس پر اللہ کی فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ اس کا نہ فرض قبول ہو گا اور نہ نفل۔“

یا فرمایا۔ ”نہ نفل قبول ہو گا نہ فرض۔“

فوائد و مسائل :

- 1۔ ترکے میں جن رشتے داروں کا حصہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے، انہیں ان کا مقررہ حصہ ضرور ملنا چاہیے۔
- 2۔ جن رشتے داروں کا وارث میں حصہ نہیں ان کے حق میں مناسب وصیت کرنا بہتر ہے۔
- 3۔ بعض لوگ یتیم پوتے کی وارث کا مسئلہ لے کر شریعت کے نظام میراث پر اعتراض کرتے ہیں، مثلاً ”ایک شخص فوت ہوتا ہے، اس کا ایک بیٹا زندہ ہے، دوسرا بیٹا فوت ہو چکا ہے، لیکن اس فوت شدہ بیٹے کا ایک بیٹا جو اب فوت ہونے والے کا پوتا ہے، وہ

موجود ہے۔ اصول میراث کے مطابق یہ پوتا محروم ہے کیونکہ قریبی عصبہ کی موجودگی میں دور کا عصبہ رشتے دار محروم ہوتا ہے۔ اس قسم کی استثنائی اور نادر صورتوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون میں تبدیلی کرنا بہت بڑی جسارت ہے۔

شرعی طور پر اس کا حل موجود ہے اور وہ یہ کہ فوت ہونے والا اپنے غیر وارث پوتے کے حق میں کچھ وصیت کر جائے، اگر وصیت نہ ہو تو وارثوں کے لیے مستحب اور بعض علما کے نزدیک واجب ہے کہ وارث محروم الارث پوتوں وغیرہ کو وارث میں سے کچھ نہ کچھ حصہ دیں۔ قرآن کریم کی سورہ النساء کی آیت 8۔ ”وارث کی تقسیم کے وقت رشتے دار یتیم اور مساکین آ حاضر ہوں تو تم مال و وارث میں سے انہیں کچھ دے دو۔“ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

اکثر لوگ اس حکم قرآنی کو محض اخلاقی ہدایت سمجھ کر اسے نہایت قریبی رشتے داروں (بھتیجیوں وغیرہ) کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے اسلام کا قانون وراثت تنقید و اعتراض کا نشانہ بنتا۔ بے حالانکہ اس میں تو ایسی کوئی چیز نہیں جس پر انگشت نمائی کی جا سکے، اگر چاہے، ”تائے اپنے بھتیجیوں وغیرہ کے ساتھ شفقت، ہمدردی اور صلہ رحمی کا معاملہ کریں جیسا کہ اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے تو ایک اسلامی معاشرے میں پوتوں وغیرہ کی وارث یا عدم وارث کا مسئلہ زیر بحث ہی نہ آئے کیونکہ صلہ رحمی کے اعتبار سے ان کی محرومی وراثت کا ازالہ خوش اسلوبی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔

علامہ ازہرین تعجب کی بات ہے کہ اس قسم کے اعتراضات ان غیر مسلموں کی طرف سے بھی پیش کیے جاتے ہیں جن کے ہاں وراثت کا کوئی اصول و ضابطہ سرے سے موجود ہی نہیں، سوائے اس کے کہ مرنے والے کا بڑا بیٹا یا بیٹی تمام ترکے کی مالک بن جاتی ہے، خواہ یہ کروٹوں کی جائیداد ہو۔ میت کی باقی اولاد بالکل محروم ہو جاتی ہے، حالانکہ اولاد ہونے کے لحاظ سے وہ اس کے برابر کے حق دار ہیں۔

انصاف سے اس قدر بعد رواج پر عمل کرنے والوں کی طرف سے اسلام کے استثنائی عادلانہ نظام وراثت کی ایک شق تلاش کر کے اس پر غلط مصلط اعتراض کرنا اور اس طرح پوری شریعت کو ناقابل عمل قرار دینے کی کوشش کرنا معقول طرز عمل نہیں۔ افسوس ہے کہ بعض نام نہاد مسلمان بھی غیر مسلموں سے متاثر ہو کر ان ہی کی زبان بولنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنا ایمان خطرے میں ڈال لیتے ہیں۔

4۔ وارث کے حق میں وصیت سے منع کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اگر وہ وصیت قرآن و سنت کے مطابق ہو تو وصیت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان وارثوں کو شرعاً وہی حصہ ملے گا، خواہ وصیت کی جائے یا نہ کی جائے اور اگر اس کی وصیت قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اس وصیت پر عمل کرنا جائز نہیں۔ اس طرح وہ کاہل ہے۔

5۔ نسبی تعلق ایک ناقابل تبدیل تعلق ہے، اسی وجہ سے اسلام کی نظر میں متنبی (منہ بولے بیٹے) کو اصل باپ کے بجائے اپنی طرف منسوب کرنا اور ظہار (بیوی کو مال بہن قرار دینا) غیر قانونی بلکہ گناہ ہے۔

7۔ ولاء (آزادی) کا تعلق بھی ناقابل تبدیل ہے، جس نے کسی کو آزاد کیا ہے، اسی کا آزاد کردہ (مولیٰ) کہنا چاہیے۔ آزاد کرنے والے کے احسان کو فراموش کر کے کسی اور کو مولیٰ قرار دینا بہت بڑا گناہ ہے۔

وارث کے لیے وصیت نہیں

حضرت ابوامامہ (صدی بن عجلان) بابلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ”انہوں نے فرمایا۔ میں نے حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے خطبہ مبارک میں یہ فرماتے سنا۔ ”اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے، لہذا وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔“

جائے





”یہ میرے دوست ہیں، بہت شریف آدمی ہیں۔  
آپ کی قلم میں جگہ مل سکے تو۔۔۔  
مشی رکھ دیجئے، جو شاندار کوٹے چھانے کا تجربہ  
رکھتے ہیں۔ لہذا آپ کے ہاں میڈیکل افسر بھی ہو سکتے  
ہیں۔ علم نجوم میں دخل ہے۔ آپ کے اسٹاف کے  
ہاتھ دیکھ دیا کریں گے۔“  
”کیا نام ہے؟“  
”سید فصاحت حسین۔“  
”والد کا نام؟“  
”جے کے جنجوعہ چودھری، جھنڈے خان جنجوعہ۔“  
”کیا کرتے ہیں ان کے والد؟“

## کیچھڑا دھسے کدو انشائیج

اپنے فن میں وہ دست گاہ بہم پہنچائی تھی کہ بڑے  
بڑے ان کے آگے کان پکڑتے تھے۔ وہ تو ان کا ایک  
شاگرد کیا نکل گیا۔ اوجھا ہاتھ بڑا اس کا۔ بڑے میں  
سے کچھ نکلا بھی نہیں اور اس کی نشان دہی پر فصاحت  
صاحب مفت میں پکڑے گئے۔  
”ہمارے ہاں نوکری کے لیے چال چلن کے  
سرٹیفکیٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔“  
”وہ ہم داروغہ جیل سے لے لیں گے۔ نیک چلنی  
کی بنا پر ان کو سال بھر کی چھوٹ بھی تو ملی تھی۔ اس کا  
سرٹیفکیٹ بھی موجود ہے۔“  
”تعلیم کہاں تک ہے؟“  
”اجی تعلیم یہ آج کل کے اسکولوں کالجوں میں جو  
پڑھایا جاتا ہے، وہ تعلیم ہوتی ہے کیا؟ ہم نے بڑے  
بڑے میٹرک پاسوں اور ڈگریوں والوں کو دیکھا ہے۔  
گنوار کے گنوار رہتے ہیں۔“  
”اچھا تو فصاحت صاحب! آپ عرضی لائے ہیں

”جی ان کے والد زندہ ہوتے تو ان کو کام کرنے کی کیا  
ضرورت تھی۔ بے چارے یتیم ہیں۔ ان کے والد تو  
ان کی پیدائش سے کئی سال پہلے فوت ہو گئے تھے۔“  
”والدہ؟“  
”جی، ان کا سایہ بھی ان کی پیدائش سے دو سال  
قبل ان کے سر سے اٹھ گیا تھا۔“  
”اور رشتہ دار تو ہوں گے؟“  
”جی نہیں۔۔۔ اور رشتہ دار بھی نہیں، کیونکہ ان  
کے دادا لالہ مرے اور پردادا نے شادی نہیں کی تھی۔  
یہ تہاں اس بھری دنیا میں۔  
حال ہی میں سات سال کی طویل اقامت کے بعد  
جیل سے رہا ہوئے ہیں۔ وہ تو اب آکر ان پر وقت پڑا  
ہے تو نوکری تلاش کر رہے ہیں، ورنہ وہ پیسوں میں  
کھیلے تھے۔“  
”کیا کرتے تھے؟“  
”بس! دست کاری ایسے ہاتھ کی محنت کا کھاتے تھے

جو شخصیت وصیت کے بغیر فوت ہو جائے کیا  
اس کی طرف سے صدقہ کیا جاسکتا ہے؟  
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،  
ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال  
کیا: میرا والد فوت ہو گیا ہے اور اس نے مال چھوڑا  
ہے لیکن وصیت نہیں کی۔ اگر میں اس کی طرف سے  
صدقہ کروں تو کیا اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے؟“  
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہاں۔“  
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے،  
ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں  
حاضر ہو کر عرض کیا:۔  
”میری والدہ اچانک فوت ہو گئی ہیں اور انہوں نے  
وصیت نہیں کی اور میرا خیال ہے کہ اگر انہیں بات  
چیت کرنے کا موقع ملتا تو صدقہ کر لیں۔ اگر میں ان کی  
طرف سے صدقہ کروں تو کیا انہیں ثواب ملے گا اور کیا  
مجھے بھی ثواب ملے گا؟“  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہاں۔“  
فوائد و مسائل:  
1- انسان کو مرنے کے بعد جس طرح ان اعمال کا  
ثواب پہنچتا رہا ہے جو اس نے زندگی میں کیے تھے اور  
ان کے نیک اثرات بعد میں جاری رہے، اسی طرح  
اس صدقے وغیرہ کا ثواب بھی پہنچتا ہے جو والدین کی  
وفات کے بعد اولاد ان کی طرف سے کرے۔  
2- فوت شدہ والدین کی طرف سے صدقے کے  
لیے یہ شرط نہیں کہ انہوں نے وصیت کی ہو۔  
3- آج کل ایصال ثواب کے نام سے جو محفلین  
منعقد کی جاتی ہیں اور کھانے کھلائے جاتے ہیں ان کی  
حیثیت محض ایک رسم کی ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ  
خاموشی سے کسی مستحق کی مناسب امداد کردی جائے۔  
4- قرض اور دوسرے مالی حقوق کی ادائیگی میں جس  
طرح زندگی میں زیات ممکن ہے اس طرح وفات کے  
بعد بھی کسی کا قرض دوسرا آدمی ادا کر دے تو فوت شدہ  
فخص بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں  
نے فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت  
پوری کرنے سے پہلے قرض ادا کرنے کا حکم دیا اور تم یہ  
آیت پڑھتے ہو۔“ اس وصیت کے بعد جو وہ وصیت  
کرے یا قرض کے بعد۔“ (سورہ النساء آیت نمبر 8) اور  
سگے بھائی، ایک ماں کے بیٹے وارث ہوں گے، سوتیلے  
بھائی نہیں۔“  
فوائد و مسائل:  
1- قرض کی اہمیت وصیت کے مقابلے میں اس  
 لحاظ سے زیادہ ہے کہ قرض زندگی میں بھی واجب الادا  
ہوتا ہے اور موت کے بعد بھی جبکہ وصیت موت کے  
بعد ہی قابل عمل ہوتی ہے۔ قرض جتنا بھی ہو ادا کرنا  
ضروری ہوتا ہے جب کہ وصیت اگر تہائی ترکے سے  
زیادہ ہو تو تہائی تک قابل عمل ہوتی ہے، زائد نہیں۔  
2- میت کے مال میں سے سب سے پہلے نقود  
پر خرچ کیا جاتا ہے، پھر قرض ادا کیا جاتا ہے، پھر جو کچھ  
بچے اس کے تہائی مال یا اس سے کم کی جو وصیت ہو وہ  
پوری کی جاتی ہے۔ اس کے بعد باقی ترکہ وارثوں میں  
تقسیم کیا جاتا ہے۔  
3- آیت میں وصیت کا ذکر قرض سے پہلے ہونے کا  
یہ مطلب نہیں کہ پہلے وصیت پوری کی جائے پھر  
قرض ادا کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ دونوں چیزیں  
واجب ہیں، ان میں سے جو چیز باقی جائے وہ ادا کی  
جائے اگر دونوں (وصیت اور قرض) موجود ہوں تو  
ترکے میں سے دونوں کی ادائیگی کرنے کے بعد باقی ترکہ  
تقسیم کیا جائے۔ علاوہ ازیں وصیت کا ذکر پہلے کرنے  
میں یہ نکتہ بھی ہو سکتا ہے کہ وصیت پر عمل کرنے کو  
زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی جب کہ قرض تو لوگ  
زبردستی بھی وصول کر لیتے ہیں۔ وصیت کو پہلے بیان کر  
کے واضح کر دیا کہ اس پر عمل کرنے میں بھی کوتاہی  
نہیں ہونی چاہیے، جو اس پر عمل قرض کی ادائیگی کے بعد  
ہی کیا جائے گا۔  
4- میت کے سگے بہن بھائی اس کے سوتیلے بہن



فروری 2013  
کے شمارے کی ایک جھلک

# بہنوں شعاع کا آپنا مابینامہ

فروری 2013  
کا شمارہ شائع  
ہو گیا ہے



”جنت کے پتے“ نثر احمد کا ناول تکمیلی مراحل میں،  
”اس راوی کی طلب میں“ عائشہ نصیر احمد کا مکمل ناول،  
”ایک نئی مثال“ رخسان نگار عدنان کا نیا ناول،  
”دیوار شب“ عالیہ بخاری کا ناول،  
”ستارہ شام“ آمنت ریاض کے ناول کی آخری قسط،  
”ہر جا کی قصائی“ ام طیفور کا ناول،  
”سعدیہ عزیز آفریدی“ مصباح خادم، صباحت یاسمین اور  
ایلیا یقین کے افسانے،  
”بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا“ کرنل اشفاق حسین  
کی کتاب پر تبصرہ،  
”دستک“ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ،  
”پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں“  
احادیث مبارک کا سلسلہ،  
”خط آپ کے“ شاعری سچ بولتی ہے اور دیگر مستقل  
سلسلے شامل ہیں،

شعاع فروری 2013 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

بازار میں کوئی دو سرادکان دار نہیں ملتا۔ یہی تو وجہ ہے  
کہ ہمارے خریدار ہمیشہ خزانے بھرتے چلتے ہیں، بلکہ  
دوڑ کے مقابلوں میں اول آتے ہیں۔“  
”میاں جی! کھی تو اصل میں غذا ایت کے لیے کھایا  
جاتا ہے۔“  
”وہ خونی بھی ہمارے گھی میں ہے حضور! آلوؤں  
سے زیادہ غذا ایت اور کسی چیز میں ہوگی؟“

☆☆☆

”فیض صاحب آج کل کیا کر رہے ہیں؟“  
”کچھ نہیں! بس شاعری کر رہے ہیں۔“  
”شاعری؟ بہت دن سے ان کی کوئی چیز نظر سے  
نہیں گزری، حالانکہ میں ریڈیو کا کمرشل پروگرام  
باقاعدگی سے سنتا ہوں۔“  
”انہوں نے فی الحال بنا سیتی گھی اور صابن کے  
متعلق کچھ کہنا شروع نہیں کیا۔“  
”پھر کس موضوع پر کہتے ہیں؟“  
”وہی انقلاب اور ہندو قبائے موضوعات پر۔“  
”کوئی تازہ مجموعہ آ رہا ہے ان کا؟“  
”دست تہ سنگ۔“  
”اس کے بعد کا پوچھ رہا ہوں۔ وہ تو دیکھا ہے۔“  
”اس کے بعد کا تیار ہے۔ فقط نام کی وجہ سے دیر ہو  
رہی ہے۔“

”فیض صاحب کو ایسا نام چاہیے جو دست سے  
شروع ہوتا ہو جیسے دست صبا، دست تہ سنگ۔“  
”میں عرض کروں ایک نام؟ اگر آپ فیض صاحب  
تک پہنچادیں تو۔“  
”ہاں ہاں! ضرور فرمائیے، لیکن ان کی شاعری سے  
مناسبت رکھنے والا ہو، درد دل یا گلدستہ فیض قسم کا نہ ہو۔“  
”دست سے شروع ہونے والوں میں ”دست پناہ“  
کیسا رہے گا؟“

☆☆☆

تو کر کے لیے؟“  
”جی! لایا ہوں۔ یہ لیجئے۔“  
”پڑھ کر سنائیے۔“  
”جی! اینک میں گھر بھول آیا ہوں۔“  
”اچھا تو سنجئے۔ اس پر تو دستخط آپ نے کیے ہی  
نہیں اور یہ کیا سیانی کا دھبہ ڈال دیا ہے۔ درخواست  
کے نیچے۔“  
”حضور یہ دھبہ نہیں ہے، میرا نشان انگشت ہے۔  
دیکھیے نا! بات دراصل یہ ہے۔۔۔“

☆☆☆

”دیکھو میاں! ہمیں خالص دودھ چاہیے ہو گا۔“  
”جی! خالص، بالکل خالص ہو گا۔“  
”اور صبح پانچ بجے نہا ہو گا۔“  
”جی! پانچ بجے کیسے ہو سکتا ہے۔ کیٹی کے تل توچہ  
بچ کھاتے ہیں۔“  
”تنی! جینیس ہیں تمہاری؟“  
”جی! جینیس، تینی جینیس؟“  
”ہاں! ہاں! میں بھول گیا تھا کہ تم کو الے ہو۔“  
”جی! لٹان میں برسوں گوشت ہی بیچتا رہا۔ پھر اخبار  
والے پیچھے پڑ گئے تو ہمارا چلا آیا۔“  
”یہاں کام کیوں نہیں کیا؟“  
”جی! یہاں جانور پکڑنے کا ٹھیکہ کار پوریشن والوں  
نے کسی اور کو دے دیا ہے۔“

”گو گویا اب تمہارا صرف دودھ بیچنے پر گزارہ ہے؟“  
”جی نہیں! گھری دکان بھی کر رہی ہے۔ آپ کو  
چاہیے تو رعایت سے دوں گا۔ گھری کی بات ہے۔“  
”وہ بھی خالص ہے نا؟“  
”خالص سا خالص؟ ایسا خالص تو گائے، بھینس  
کے دودھ سے بھی نہ بنتا ہو گا۔ اسے چننا کرنے کے  
لیے ہم ولایتی گریں ڈالتے ہیں۔ یہاں کا دیسی مال  
نہیں ڈالتے۔ پھر جسم میں تیزی، طراری اور چستی پیدا  
کرنے کے لیے اس میں موہل آئل بھی ملاتے ہیں جو



# باتیں مناوڑسے

شاہین رشید



1 اصلی نام؟

مادرا۔

2 پیار کا نام؟

عروہ مجھے ”بیلو“ بلاتی ہے اور ماما مجھے ”چنگی“ بلاتی ہیں۔

میری ماما نے میرے پندرہ تک نیم رکھے ہوئے ہیں۔

3 سن پیدائش/شہر؟

28 جنوری 1992ء/پشاور۔

4 قد بغیر تیل کے/ستارہ؟

5 فٹ 7 انچ/لمبا۔

5 بہن بھائیوں کی تعداد/آپ کا نمبر؟

دو بہنیں ایک بھائی/میں دوسرے نمبر پر ہوں۔

6 تعلیمی قابلیت؟

فیشن ڈیزائننگ میں گریجویشن کر رہی ہوں اسلام آباد سے۔

7 شادی؟

ابھی تو نہیں سوچا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ لوہمیں ج کروں۔ باقی جو اللہ کو منظور ہو گا۔

8 شو بزنس میں آمد؟

عروہ وی جے تھی اے آر وائی میں، تو اسی کے ذریعے سے آئی۔

9 پہلا ڈراما/شہرت کس نے دی؟

میرے حضور/یہاں پیار نہیں ہے۔

10 شو بزنس کی پہلی کمائی/خرچہ؟

میں نے سیکسلا میں ایک شو ہوٹ کیا تھا۔ اس وقت

میں 9th گریڈ میں تھی۔ مجھے اس شو کے سولہ ہزار ملے

تھے۔ تین چار دن کی میزبانی تھی۔ اب تو ٹھیک طرح سے

یاد بھی نہیں ہے۔

11 آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟

شوٹ کے دنوں میں آٹھ بجے اور یونیورسٹی کے دنوں میں سات بجے اور چھٹی کے دن تو آرام ہوتا ہے۔

12 صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟

صبح اٹھتے ہی ماما ”بیڈی“ دیتی ہیں۔ سر دیوں میں چائے اور گرمیوں میں لی دیتی ہیں ماما۔

13 گھروالوں کی کون سی بات موڈ خراب کر دیتی ہے؟

موڈ خراب اتنی آسانی سے نہیں ہوتا، بلکہ میں تو دوسروں کا موڈ بھی ٹھیک کر دیتی ہوں۔

14 اپنے ملک کا کون سا قانون برا لگتا ہے؟

بھئی! بڑوں پر رول لپاتی نہیں ہوتے اور چھوٹے مارے جاتے ہیں۔ اس لیے کیا بتاؤں۔

15 قومی تہوار منانے کے بارے میں کیا کہیں گی؟

میں سمجھتی ہوں کہ جب میں چھوٹی تھی تو ملک میں قومی تہوار اہتمام سے منائے جاتے تھے۔ اب لوگ اپنی

روایات بھولتے جا رہے ہیں۔

16 اپنی شخصیت۔ میں کیا کی محسوس کرتی ہیں؟

کوئی بھی نہیں۔ بس سوچتی ہوں۔ تھوڑی لمبی ہوتی۔

17 شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟

بہت زیادہ چڑچی ہو جاتی ہوں۔ کیونکہ میں کھانے پینے کی بہت شوقین ہوں۔

18 ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟

گورنمنٹ کی تبدیلی ضروری ہے۔

19 کس دن کا شدت سے انتظار رہتا ہے؟

اپنی برتھ ڈے کا کیونکہ ڈیڑھ سو تھے ملتے ہیں۔

20 شدید تھکن میں کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہیں؟

مناکے پاس۔

21 خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟

گفت دے کر۔

22 بیرون ملک کس قانون سے متاثر ہوتی ہیں؟

مجھے لگتا ہے کہ وہ بہت آرگنائزڈ ہیں۔ بڑے سے لے کر چھوٹے تک۔ سکیل بھی کوئی نہیں توڑتا۔

23 بناغ کا پیکٹر کبھو متا ہے؟

کوئی غلط بات کرے یا کوئی بھوٹ بولے۔

24 کوئی لڑکا اگر مسلسل گھورے تو؟

تو میں جا کر پوچھ لیتی ہوں کہ بھئی! کیا بات ہے۔

25 پرائز بانڈ نکلنے کی منتظر رہتی ہیں؟

نہیں! بالکل نہیں۔ جو آپ بحث کرتے ہیں اسی کا صلہ ملتا ہے۔

26 آپ کا ذریعہ آمدنی؟

فی الحال تو شو بزنس ہے۔

27 گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟

بہن کے (عروہ کے)

28 کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟

شہرت۔ بہت جلدی مل گئی ہے۔

29 کوئی برا وقت جو آپ نے گزارا ہو؟

برا وقت تو اللہ کا شکر ہے کہ کوئی نہیں آیا۔

30 بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟

مجھے سارے ہی تحفے اچھے لگتے ہیں۔ چاہے کچھ بھی ہو۔

31 کون سی بات موڈ پر اچھا اثر ڈالتی ہے؟

گانے سنتی ہوں۔

32 پسندیدہ پروفیشن؟

اداکاری اور فیشن ڈیزائننگ۔

33 اپنے لیے تعریفی جملے جو بھول نہیں سکتیں؟

میرے فین پیج پہ لوگ مجھے کہتے ہیں کہ میں در سائل

اداکارہ ہوں اور یہ پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔

34 مخلص کون ہوتے ہیں اپنے پاپراے؟

اپنے ہی ہوتے ہیں۔

35 کوئی تحفہ جو ہمیشہ یاد رہے گا؟

ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے میری ماما نے مجھے کار کا تحفہ دیا ہے،

تاکہ مجھے یونیورسٹی جانے میں آسانی ہو۔ یہ تحفہ ہمیشہ یاد

رہے گا۔



# خدا

بہنوں کا اپنا ہنامہ

لاہور

فروری 2013 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

فروری 2013 کے شمارے کی ایک جھلک

☆ اداکارہ "عائشہ عمر" سے ملاقات،

☆ "زُت بھار کی ہے تو" رمنا احمد کا مکمل ناول،

☆ "ہجر کا آخری کنارہ" سمیرا عثمان گل کا مکمل ناول،

☆ "جو ملے تو بوجھوں" صفحہ اعجاز کا مکمل ناول،

☆ "کاسٹل ڈل" سندس جبین کا مکمل ناول،

☆ اس کے علاوہ فوزیہ احسان رانا، سی کرن ان، محبین اختر، سرن خالد اور

عشاء جمیل کے افسانے،

☆ "وہ ستارہ صبح اُمید کا" فوزیہ غزل کا

سطح دار ناول،

☆ "تم ہی آخری جزیرہ ہو" ام مریم کا

سطح دار ناول،

☆ اس کے علاوہ

پیارے نبی ﷺ کی باتیں، انشاء نامہ، انٹرویو اور شوہر کی دنیا کی دلچسپ معلومات کے علاوہ حنا کے بھی مستقل سطح شامل ہیں

فروری 2013ء

کا شمارہ آج ہی اپنے قریبی کتب خانوں سے طلب کریں

43 ایک کروڑ جو کر کے پچھتاہیں؟

نہیں کوئی نہیں۔

44 ایک کروڑ جو ہٹ ہوا؟

"میں پیار نہیں ہے" میں شاملہ کارکردار۔

45 ایک کروڑ جو کرنا چاہتی ہیں؟

ہر طرح کا کردار کرنا چاہتی ہوں۔

46 کسی کو فون نمبر دے کر پچھتاہیں؟

نہیں! کوئی زیادہ غلٹ کرے تو نمبر ملاک کر دیتی ہوں۔

پچھتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

47 مہمانوں کی اچانک آمد کیسی لگتی ہے؟

اچھی لگتی ہے۔۔۔ اور مجھے خود بھی دوسروں کے گھر جانا اچھا

لگتا ہے۔

48 کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟

کپڑے اور جوتے۔

49 ایک نصیحت جو بری لگتی ہے؟

عروہ مجھے کہتی ہے کہ تم تھوڑی آرٹ گالری زور دو جاؤ۔ مگر میں

ہوئی نہیں پاتی۔

50 وقت کی پابندی کرتی ہیں؟

ہاں جی! میں بہت پنکچو کل ہوں۔

51 کن لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتی ہیں؟

گھروالوں پر دل کھول کر خرچ کرتی ہوں۔

52 اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟

چیزیں قیمتی ہو ہی نہیں سکتیں۔ رشتے قیمتی ہوتے ہیں۔

53 لھانے کے لیے بہترین جگہ چٹائی یا ٹیبل؟

ڈائننگ ٹیبل۔

54 ایک ریسٹورانٹ جہاں کھانا کھانا پسند کرتی ہیں؟

اسلام آباد کا کوئی بھی ریسٹورانٹ۔

55 اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو کیا چیز لیتا

چاہیں گی؟

میں ڈیو ہو جاؤں گی۔ میں تو لوگوں کے بغیر رہی نہیں

سکتی۔

56 انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟

بہت زیادہ ہے۔ اپنے فیس بک کے قریب رہنے کا بہترین

ذریعہ ہے۔



36 چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتی ہیں؟

اگر کراچی میں ہوتی ہوں تو بہن کے ساتھ شاپنگ پہ چلی

جاتی ہوں اور اسلام آباد میں ہوتی ہوں تو ماما کے ساتھ

سب نکل جاتے ہیں، کہیں نہ کہیں۔

37 لباس میں کیا پسند ہے؟

شرقی انداز کے لباس۔

38 اپنی شخصیت کے لیے ایک جملہ؟

بہت خوش قسمت ہوں۔

39 گھر کے کس کو نے میں سکون ملتا ہے؟

ماما کے کمرے میں۔

40 ایک آرٹسٹ جس کے ساتھ ابھی تک کام نہیں

کیا؟

کافی سارے ہیں۔ جیسے عظمیٰ گیلانی، سیکند سمون، بدر غلیل

وغیرہ۔ صبا حمید کے ساتھ کام کرنے کی خواہش تھی، جو

پوری ہو گئی۔

41 کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتی ہیں؟

ایس ایم ایس کی اتنی قائل نہیں ہوں ایس ایم ایس سے

بہتر کال کرنا بہتر سمجھتی ہوں۔

42 بوریٹ دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟

فیس بک مگانے یا ہابرا جاکر ڈنکرتی ہوں۔





وہ جواب ہم میں ہیں

مرہٹا بیگم

شاہین رشید

اسی طرح کرتے ہیں جس طرح آپ کرتی ہیں۔  
نیم لہجے میں اور محبت سے بات کرنا ان کی خاص  
خوبی تھی۔

منہا کی والدہ ”کجن بیگم“ بھی ہندوپاک کی نامور  
سوز خواں تھیں اور ان کے والد ”اختر مہدی و صی علی“  
نہ صرف ایک اچھے سوز خواں تھے، بلکہ بہت اچھے  
خطاط بھی تھے اور عربی و فارسی اور اردو پر عبور رکھتے تھے  
وہ ریڈیو پاکستان میں حمد و نعت، منقبت اور غزلوں  
کے الفاظ اور صحیح تلفظ و ادائی کی تربیت بھی دیا کرتے  
تھے۔ ان کے والد کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ پاکستان  
کے قومی ترانے میں ان کی آواز بھی شامل ہے۔ مناز  
بھی اپنی والدہ اور اپنی خالہ عشرت بیگم کے ساتھ سوز و  
سلام میں حصہ لیا کرتی تھیں۔ جبکہ گائیکی کی تربیت

ساز و آواز کی دنیا کی ایک خوب صورت اور سُر ملی  
آواز منہا بیگم اب ہم میں نہیں ہیں۔ یہ مشہور لوگ  
چاہے کسی بھی فیلڈ سے تعلق رکھتے ہوں، اپنی فیملی کا  
حصہ ہی لگتے ہیں۔ اگرچہ مناز کو اس فیلڈ کو حیرا دلے  
کافی عرصہ گزر گیا تھا، مگر یہ سوچ کر کہ یہ بیچنڈ فنکار  
ہمارے درمیان موجود ہے، بہت اچھا لگتا تھا۔ مناز  
بیگم جب بھی امریکا سے آتی تھیں، ایک آدھ مرتبہ  
میری ان سے ضرور بات ہوتی تھی اور مجھے یاد ہے کہ  
طالب علمی کے زمانے میں جب ان کا عروج تھا، میں  
ان کا انٹرویو کرنے ان کے گھر گئی تھی تو وہ سبزی کاٹ  
رہی تھیں۔ میں نے انہیں گھریلو کاموں میں مصروف  
دیکھ کر حیرانی کا اظہار کیا تو انہیں کہنے لگیں کہ ”ہم بھی  
آپ کی طرح ایک انسان ہی ہیں۔ ہم بھی گھر کے کام

83 شام کو مجھ میں زیادہ انہی ہوتی ہے۔  
گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟  
کھانا مل جائے۔

84 کون سے چینلز شوق سے دیکھتی ہیں؟  
زیادہ تر پاکستانی چینلز اور میوزک کے چینل جو بھی  
ہوں۔

85 جس دن موبائل سروس آف ہوتی ہے تو؟  
تو سکون ہوتا ہے۔

86 فقیہ کو کم سے کم کتنا دینی ہیں؟  
مختصر ہے فقیر کہ وہ کتنا مستحق ہے۔ کیونکہ میرا ایمان ہے  
کہ ہم دین کے تواللہ ہمیں بھی دے گا۔

87 لائٹ چلی جائے تو بے ساختہ جملہ؟  
کیا ہے یا۔۔۔ لائٹ کو بلا علی جانے ہے بار بار۔

88 اچانک چوٹ لگ جائے تو؟  
تورونے لگتی ہوں۔

89 کس ملک کے لیے کتنی ہیں کہ کاش! یہ ہمارا بیتا؟  
جرمنی۔۔۔ ویسے اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے۔

90 ہم عموماً ”کن چیزوں سے اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟  
میں تو اپنا سارا وقت فیس بک سے ضائع کرتی ہوں۔

91 حجاب ضروری ہے یا فیشن؟  
حجاب بہت ضروری ہے۔ بس اللہ تعالیٰ جس کو توفیق دے  
دے۔

92 شاپنگ کے لیے پسندیدہ جگہ؟  
کراچی دہی۔

93 اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟  
اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو۔ لیکن اگر ایسا ہو بھی گیا تو کوئی مسئلہ  
نہیں۔

۱۰۸

پہلی مرتبہ نیا فلم استعمال کرتے وقت کیا لکھتی  
ہیں؟

لکیریں مارتی ہوں کہ چل بھی رہا ہے کہ نہیں۔  
70 کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟

نہیں نہیں۔ میرے خیال میں غصے میں زیادہ کھانا پینا  
چاہیے، تاکہ لڑنے کی مزید طاقت آئے۔

71 مارنگ شوکے لیے آپ کے اثرات؟  
مارنگ شو میں فند مصطفیٰ کا پروگرام بہت اچھا ہوتا ہے اور  
شائستہ کا بھی بہت مگر فائل ہوتا ہے۔

72 شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟  
جب آپ فیملی کے ساتھ نکلیں تب۔

73 بستر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کوٹیں لیتی ہیں؟  
میں لیٹتی ہی تب ہوں جب مجھے نیند آرہی ہوتی ہے۔

74 بیڈی سائڈ ٹیبل یہ کیا کیا چیزیں رکھتی ہیں؟  
فون کا چارجر، کوئی ایک پین اور اپنی تصویر۔

75 خدا کی حسین تخلیق؟  
مور۔

76 زندگی کب بری لگتی ہے؟  
کبھی بھی نہیں، آج کل تو بہت ہی اچھی لگ رہی ہے۔

77 ویلنٹائن ڈے منانا کیسا لگتا ہے؟  
بہت اچھا لگتا ہے۔ بہت شوق سے مناتی ہوں اور ہر تہوار  
اہتمام سے مناتی ہوں۔

78 زندگی کب بدلی؟  
جب اس فیلڈ میں آئی۔ لوگوں نے پہچانا شروع کیا۔

79 کوئی گہری نیند سے اٹھاوے تو؟  
رونا آتا ہے۔

80 جھوٹ کب بولتی ہیں؟  
بیس بولتی۔۔۔ کیونکہ میں خود کو جواب دہ نہیں سمجھتی،  
سوائے اپنے گھر والوں کے سامنے۔

81 اپنی شخصیت میں کیا بدلنا چاہتی ہیں؟  
میرا خیال ہے کہ مجھے اب عودہ جیسا ہو جانا چاہیے۔

82 دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو فریض محسوس  
کرتی ہیں؟





انہوں نے مہدی حسن کے بھائی نذرت غلام قادر خان نیاز احمد اور لعل محمد اقبال سے حاصل کی۔

مہناز بیگم 1958ء میں کراچی میں پیدا ہوئیں۔ گھر کی بڑی بیٹی اور پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ ابتدائی تعلیم ”ہمارے پارک جنگ اسکول جیل روڈ“ سے حاصل کی۔ میٹرک ”مسلم گرلز اسکول ناظم آباد نمبر 2“ سے پاس کیا اور ”مٹی کانجے سے گریجویشن“ کیا۔

والدین اور خالہ حمد و نعت اور سوز و سلام سے پرچائے جاتے تھے جبکہ آپ نے بحیثیت گلوکارہ وہ بھی فلموں کی اپنی پہچان کروائی وجہ؟ ہمارا مہناز بیگم سے پہلا سوال تھا۔ اس پر مہناز بیگم نے کہا۔

”ایسا نہیں ہے کہ میری پہچان صرف گلوکارہ ہی کی ہے۔ الحمد للہ میری پہچان بحیثیت حمد و نعت اور سوز و سلام سے بھی ہے کیونکہ میری ابتدا تو اسی سے ہوئی۔“

”بالکل ٹھیک۔ پھر اس فیلڈ میں کیسے آئیں؟“

”میں آپ کو شروع سے بتاتی ہوں۔ ہمارے گھرانے میں بہت سادگی اور بہت زیادہ مذہبی لگاؤ تھا سب کو۔ مذہبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں اور

ہمارے والدین اس بات کا خاص خیال رکھا کرتے تھے کہ ہماری تربیت خالصتاً ”مذہبی انداز میں ہو۔ جب میں والدین کو مذہب سے قریب اور حمد و نعت پڑھتے ہوئے اور سوز خوانی کرتے ہوئے دیکھا کرتی تھی تو میرا بھی دل چاہتا تھا کہ ان کا ساتھ دوں۔ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے میری والدہ اکثر مجھے اپنے ساتھ میلا اور سوز و سلام کی محفلیوں میں لے جایا کرتی تھیں۔ اسکول کانجے میں بھی دوستوں کے درمیان بیٹھ کر انہیں حمد و نعت سنایا کرتی تھی۔ خاندان میں خاصی مقبول ہو چکی تھی اور اپنی دوستوں میں بھی اس سے آگے کی شرکت کا مجھے نہ شوق تھا نہ گمان تھا۔ ہمارے زمانے میں ریڈیو پاکستان کراچی سے طالب علموں کے لیے ایک پروگرام ہر مہینہ ہوا کرتا تھا اور اس کے تحت ہفتہ طلبہ بھی منایا جاتا تھا۔ اس میں کراچی کے اور کراچی سے باہر کے کالج بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ اس کے ایک پروگرام میں ”کل پاکستان مقابلہ موسیقی“ کا انعقاد کیا گیا۔ ہمارے کانجے کی ایک لڑکی کو بھی جانا تھا۔ ہم وہ اتفاق سے بیمار ہو گئی۔ پرنسپل پریشان تھیں کہ کسی نے انہیں میرے پارے میں بتایا کہ مہناز کی آواز بھی بہت اچھی ہے۔ آپ اسے مقابلے کے لیے بھیج دیں اور ہماری پرنسپل نے بہت مجبوری میں مجھے بھیج دیا کہ چلو! انٹری تو ہو ہی جائے گی۔ کسی مقابلے میں شریک ہونے کا میرا بھی پہلا موقع تھا۔ میری باری آئی تو میں نے میڈم نور جہاں کا مشہور و معروف قومی گیت ”اے وطن کے سچیلے جوانو! گایا تو ہلکا بیٹھے ہوئے لوگوں نے اتنی داد دی کہ میں خود بھی حیران رہ گئی اور جب فائنل رزلٹ کا اعلان ہوا تو ہمارے کانجے کو پہلا انعام ملا۔ اس وقت میری جو کیفیت تھی اس کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔“

اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کراچی ریڈیو کے پروگرام میجر نے مہناز کا تعارف ڈائریکٹر جنرل سلیم گیلانی صاحب سے کروایا۔ انہوں نے اسی وقت ان کی آواز میں مزید کچھ سنا اور کہا کہ آواز بہت خوب

ہمارے والدین اس بات کا خاص خیال رکھا کرتے تھے کہ ہماری تربیت خالصتاً ”مذہبی انداز میں ہو۔ جب میں والدین کو مذہب سے قریب اور حمد و نعت پڑھتے ہوئے اور سوز خوانی کرتے ہوئے دیکھا کرتی تھی تو میرا بھی دل چاہتا تھا کہ ان کا ساتھ دوں۔ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے میری والدہ اکثر مجھے اپنے ساتھ میلا اور سوز و سلام کی محفلیوں میں لے جایا کرتی تھیں۔ اسکول کانجے میں بھی دوستوں کے درمیان بیٹھ کر انہیں حمد و نعت سنایا کرتی تھی۔ خاندان میں خاصی مقبول ہو چکی تھی اور اپنی دوستوں میں بھی اس سے آگے کی شرکت کا مجھے نہ شوق تھا نہ گمان تھا۔ ہمارے زمانے میں ریڈیو پاکستان کراچی سے طالب علموں کے لیے ایک پروگرام ہر مہینہ ہوا کرتا تھا اور اس کے تحت ہفتہ طلبہ بھی منایا جاتا تھا۔ اس میں کراچی کے اور کراچی سے باہر کے کالج بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ اس کے ایک پروگرام میں ”کل پاکستان مقابلہ موسیقی“ کا انعقاد کیا گیا۔ ہمارے کانجے کی ایک لڑکی کو بھی جانا تھا۔ ہم وہ اتفاق سے بیمار ہو گئی۔ پرنسپل پریشان تھیں کہ کسی نے انہیں میرے پارے میں بتایا کہ مہناز کی آواز بھی بہت اچھی ہے۔ آپ اسے مقابلے کے لیے بھیج دیں اور ہماری پرنسپل نے بہت مجبوری میں مجھے بھیج دیا کہ چلو! انٹری تو ہو ہی جائے گی۔ کسی مقابلے میں شریک ہونے کا میرا بھی پہلا موقع تھا۔ میری باری آئی تو میں نے میڈم نور جہاں کا مشہور و معروف قومی گیت ”اے وطن کے سچیلے جوانو! گایا تو ہلکا بیٹھے ہوئے لوگوں نے اتنی داد دی کہ میں خود بھی حیران رہ گئی اور جب فائنل رزلٹ کا اعلان ہوا تو ہمارے کانجے کو پہلا انعام ملا۔ اس وقت میری جو کیفیت تھی اس کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔“

اس کامیابی کے بعد مہناز صاحبہ کی یہ خواہش شدت پکڑی جا رہی تھی کہ انہیں فلم کے لیے بھی گانا ہے مگر کوئی آفر نہیں آ رہی تھی اور اگر کوئی آفر آ بھی جاتی تو پڑا مرحلہ گھر والوں کو راضی کرنے کا تھا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ انہیں فلم میں گانے کی اجازت کبھی بھی نہیں ملے گی۔ پاکستان ٹیلی ویژن پر

صورت ہے۔ اس میں مزید نکھار لانے کے لیے آپ کو تربیت لینا ہوگی تربیت کے لیے نام بھی انہوں نے ہی تجویز کیا اور یوں مہناز نے اس زمانے کے نامور موسیقار سے تربیت حاصل کی۔

کہتے ہیں کہ خوش قسمتی انسان کی زندگی میں صرف ایک مرتبہ دستک دیتی ہے۔ اگر انسان وہ دستک سن لے تو کامیابی کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ مہناز کی زندگی میں پہلی دستک اس وقت ہوئی جب کل پاکستان مقابلہ موسیقی میں شرکت کرنے والی لڑکی بن کر ہوئی اور مقابلے میں شرکت کرنے کے لیے مہناز کو منتخب کیا گیا۔ اگر اس وقت مہناز انکار کر دیتیں تو شاید آج ہم انہیں جانتے بھی نہ ہوتے۔

موسیقی کی تربیت مکمل ہوئی تو ریڈیو پاکستان کراچی کے پروڈیوسر رحمت حسین جعفری نے مہناز کی آواز میں ایک گانا ریکارڈ کیا۔ اس گانے کوئی وی کے پروگرام میجر نے سنا اور اس وقت کے مقبول ترین میوزک کے پروگرام ”نغمہ زار“ میں گانے کی دعوت دی اور کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے اس پروگرام کے لیے باقاعدہ گائیں۔

”اس آفر پر کیا کیفیت تھی۔ اسی کو بہت سمجھتی تھیں یا مزید آگے بڑھنے کی خواہش تھی؟“ اس سوال کے جواب میں مہناز نے کہا۔

”اتنی اچھی آفر پر بھلا کون ہو گا جو خوش نہیں ہو گا میں بھی بہت خوش تھی۔ ”نغمہ زار“ کے بعد مجھے مزید پروگراموں میں بھی ٹپک کیا جانے لگا اور میری ایک پہچان بنتی گئی۔ جب انسان کی پہچان بن جائے تو پھر اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ مزید ایسا کام کرے کہ ہر خاص و عام میں جانا پہچانا جائے۔“

ریڈیو ٹی وی یہ کامیابی کے بعد مہناز صاحبہ کی یہ خواہش شدت پکڑی جا رہی تھی کہ انہیں فلم کے لیے بھی گانا ہے مگر کوئی آفر نہیں آ رہی تھی اور اگر کوئی آفر آ بھی جاتی تو پڑا مرحلہ گھر والوں کو راضی کرنے کا تھا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ انہیں فلم میں گانے کی اجازت کبھی بھی نہیں ملے گی۔ پاکستان ٹیلی ویژن پر

بلیوٹی پکس کا تیار کردہ

Herbal

سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO



اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم

گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے

بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے

قیمت-75 روپے

رجسٹری سے منگوانے پر وارنٹی آرڈر سے منگوانے والے

دو بوتلیں-200 روپے

تین بوتلیں-275 روپے

اس میں ڈاک خرچہ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

بڑے پیمانے پر منگوانے کا پتہ

پوٹی بس 53، اورنگ زیب مارکیٹ، امام آباد، جناح روڈ، کراچی۔

دفتری خریدنے کے لیے:

مکتبہ عمران ڈسٹریکٹ 37، اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 3221636





منہاں کو نامور موسیقار سہیل رعنا نے متعارف کرایا اور فلم تک بھی وہ ان ہی کی وجہ سے آئیں۔ فلم کے لیے ان کا پہلا مقبول گانا فلم ”پہچان“ کا تھا۔ جس کے بول تھے ”تیرا پیار میرے جیون کے سنگ رہے گا“ اور یہ گانا آج بھی اسی طرح مقبول ہے، جس طرح اپنے ابتدائی دور میں تھا۔ اس کے بعد تو منہاں فلم انڈسٹری کی ضرورت بن گئیں۔ کوئی فلم ایسی نہیں تھی کہ جس میں منہاں کی آواز شامل نہیں ہوتی تھی۔

منہاں نے جس دور میں گائیکی کا آغاز کیا، وہ ملکہ ترنم نور جہاں کا دور تھا۔ اردو پنجابی گانوں کے لیے ان ہی کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں اور ان کے بعد اگر کسی کا نمبر ہوتا تھا تو وہ ناہید اختر تھیں، مگر سنجیدہ اور میلوڈی گانوں کے لیے منہاں کی ہی آواز اور گائیکی کو ترجیح دی جاتی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب ہمارے ملک میں فلمیں بھی کثرت سے بنی تھیں اور اسی لحاظ سے گانے بھی لکھے جاتے تھے۔ تاہم جہد صرف تین ہی آوازیں گوشتی تھیں۔ میڈم نور جہاں، ناہید اختر اور منہاں۔ میڈم نور جہاں بیمار ہوئیں تو پھر فلم انڈسٹری میں گائیکی کا سارا بوجھ منہاں پر آگیا اور منہاں صاحبہ نے اس ذمہ داری کو بخوبی نبھایا۔

منہاں بیگم نے اپنے اس فنی سفر میں بہت بھرپور

صورت گیت اور غزلیں گائیں۔ انہیں اس گائیکی میں اپنی والدہ کی سرپرستی تو حاصل تھی ہی اس کے ساتھ میڈم نور جہاں کی سرپرستی بھی حاصل تھی، حالانکہ مشہور تھا کہ میڈم نور جہاں کسی کی تعریف میں اتنی فخر نہ لی کہ مظاہرہ نہیں کرتی تھیں۔ صرف اسی کی تعریف کرتی تھیں، جو انہیں دل سے پسند آتا تھا اور منہاں ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھیں، جن کی تعریف میڈم نور جہاں نے بھی کی۔ منہاں کو سنجیدہ اور درد بھرے گانے میں خاصا عبور حاصل تھا۔ ان کے ایسے گانے دل پر بہت اثر کرتے تھے۔ انہیں یار یار سننے کو دل چاہتا تھا اور چاہتا ہے۔ عجیب سوز و گداز تھا اور انتہائی سریلی آواز تھی۔ منہاں کا سب سے بڑا مکمل یہ تھا کہ وہ جب بھی کسی تقریب میں گانے کے لیے بلائی جاتی تھیں تو کبھی ”پسنگ“ نہیں کرتی تھیں بلکہ ہمیشہ لائیو گاتی تھیں اور گانے میں مزید رنگ بھر دیتی تھیں۔ پنجابی منہاں کی ماوری زبان نہیں تھی، مگر انہوں نے پنجابی گانے بھی اس طرح گائے گویا ان کی اپنی زبان ہو اور یہی ایک فنکار کا مکمل ہوتا ہے۔

منہاں نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ جب انہوں نے پہلا گانا فلم کے لیے گانا تو سب نے خاندان میں بہت برا مانا اور جواز یہ پیش کیا کہ مذہبی گھرانے کی لڑکی جس کے والدین اور جو خود بھی سوز و سلام اور حمد و نعت پڑھتی ہیں وہ فلمی گانے گائے۔ یہ کہاں زیب دیتا ہے۔

منہاں بیگم نے بتایا کہ جب انہوں نے پہلا گانا گایا تو انہیں تین سو روپے ملے۔ یہ تین سو روپے انہیں ریڈیو پہ گانے کے ملے تھے چونکہ یہ ان کی پہلی کمائی تھی اس لیے انہیں بے حد خوش ہوئی تھی۔ وہ ہر ایک کو بتاتیں پھر جب فلم کا ایک گانا گائے برا انہیں پانچ ہزار ملے تو انہیں ایسا لگا جیسے دنیا جہاں کی دولت ان کی جھولی میں آگئی ہو۔ منہاں کہتی ہیں۔

”یہ وہ دور تھا جب میڈم نور جہاں اور ملا بیگم کا عروج تھا اور میرے مقابلے میں ناہید اختر تھیں۔“

منہاں بیگم نے تقریباً اٹھائیس سال اس فیلڈ میں گزارے اور بڑے کمال کی بات ہے کہ ان کے بارے میں کبھی کسی نے غلط الفاظ استعمال نہیں کیے۔ شوبز ایک ایسی فیلڈ ہے جہاں کوئی الزام تراشی اور سکیٹل سے محفوظ نہیں رہتا، لیکن منہاں شاید ان چند لوگوں میں سے تھیں جن کے خلاف نہ تو کسی سے کوئی بات سنی اور نہ ہی کوئی اسکیٹل اور یہ انسان کے اعلیٰ کردار کی ایک مثال ہے۔

شادی کے سوال پہ منہاں اکثر برا مان چلیا کرتی تھیں۔ لیکن درحقیقت بات یہ تھی کہ بھائیوں کی شادی کے بعد منہاں نے اس لیے شادی نہیں کی کہ مل اکلی ہو جائے۔ شادی کے لیے منہاں کا کھانا تھا کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور کچھ لوگوں کے نہیں بھی بنتے۔ شاید میرا جوڑ بھی نہیں بنا اور شاید اسی میں میرے لیے کچھ بہتری ہوگی۔

منہاں صاحبہ ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھیں، جنہیں ان کی زندگی میں بہت سے ایوارڈز سے نوازا گیا۔ برائڈ آف پرفارمنس کے علاوہ نور متیہ بہترین گلوکارہ کا نگار ایوارڈ اور ایک دفعہ بی بی وی ایوارڈ بھی ملا غیر ممالک میں پرفارمنس کے دوران بھی انہیں متعدد ایوارڈز مل چکے ہیں۔

منہاں اپنے بارے میں بتاتے ہوئے یہ بات ضرور کہتی تھیں کہ ”میں ایک گھریلو خاتون ہوں۔ گھر کے کام کرنا اور کھانا پکانا مجھے بہت پسند ہے۔ میرے ہاتھ میں لذت بھی ہے اس لیے خاندان بھر کے لوگ نہ صرف میرے کھانے کی تعریف کرتے ہیں، بلکہ مجھ سے فرمائش کر کے پکواتے بھی ہیں۔“

منہاں کی زندگی کا سفر 19 جنوری 2013ء کو مکمل ہوا۔ وہ بلڈ پریشر اور شوگر کی مریضہ تھیں۔ آخری چند مہینوں میں پیچھے پھرنوں کی سوزش کا شکار بھی ہو گئی تھیں۔ انسان کی زندگی کے دن پورے ہو جائیں تو پھر اس دنیا سے جانے کا بہانہ بھی بن جاتا ہے اور منہاں کی بیماری ان کے جانے کا بہانہ بنی حالانکہ یہ کوئی ایسی بیماری

نہیں تھی کہ جس کا علاج نہیں تھا۔ مگر اللہ نے مہلت دی نہیں دی۔

منہاں ایک صابر و شاکر خاتون تھیں۔ لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ اپنی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان رہتی تھیں اور اکثر کشتی تھیں کہ ”جب فنکار کسی کام کا نہیں رہتا تو سب اسے چھوڑ جاتے ہیں۔“ انہوں نے حکومتی سطح پر بھی اپنی بیماری کے علاج کی اپیل کی مگر کسی نے کان نہیں دھڑے۔ یہی ہماری قوم کا اور ہماری معروف شخصیات کا المیہ ہے کہ حکومتی سطح پر کسی کو کوئی امداد وقت پر نہیں ملتی۔

ہم جانتے ہیں کہ اس سال یقیناً ”منہاں بیگم کے لیے ایک اور حسن کارکردگی کا ایوارڈ یا نشان امتیاز کا دینے کا اعلان کیا جائے گا۔ مگر سوچئے! یہ ایوارڈ منہاں کے لیے اب کس کام کے ہوں گے؟



ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے  
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

فصل غم کا گوشوارہ  
رضیہ جمیل

قیمت 300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ  
37، اردو بازار، کراچی



# چوڑے دل کے دل

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی اس نے بدر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا، لیکن اس کے گزناسے زبردستی وہاں سے لے گئے وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے، کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد بخجندی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے، کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ اسے لگا جیسے وہ فنکار ہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ، ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں ”شہناز“ نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں، جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر بھی ملی تھی۔ سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے ”سید پور پھل شو“ میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ





ہاؤ نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نور کو اسلام آباد میں فلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ فلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئٹے سے قریش دیواروں پر تصویریں بنانے والی فلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔ مولوی سراج اور آپا راجہ قہقے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ ہے حدیثیں مولوی سراج اور آپا راجہ کو اس بات پر غرے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔ ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے نانا کا ہر جو کر

ماہ نور اور شاہ پانو "سید پور پچھل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک گھبراہٹ نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے نصب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آتا رہا تھا۔

سارہ ماہ نور سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ بہت روکھا اور خشک تھا۔ واپسی پر گاڑی میں ماہ نور نے سعدیہ سے اعتراف کیا کہ وہ اب تک جتنا سعد کو جان پائی ہے سعد اس کی نظر میں ایک قابل رشک انسان ہے، سعد نے اسے سارہ کے متعلق بتایا وہ سرس دیکھنے گیا تھا۔ سارہ خان بلندی سے نیچے گری تھی۔ اس نے اس کی ہڈیاں ٹوٹنے اور خون بکھرتے دیکھا تھا، وہ وہاں سے واپس آ گیا لیکن سارہ خان کے لیے بے چین رہا۔ وہ دوبارہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس سے ملنے پہنچا تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ ایک چھوٹا لڑکی میں پڑی موت منتظر تھی۔ اس کے زخموں پر لکھیاں بھجھکتی تھیں۔ سعد اس کو وہاں سے لایا اور اس کا علاج کرایا اور پھر اسے فلیٹ میں منتقل کیا۔

کھاری نے آپا راجہ سے نما زیادہ کر لی تھی اور بہت خوش تھا۔ سارہ خان نے پہلی بار سوچا سعد سے اس کا تعلق صرف ترس اور ہمدردی کا ہے اسے اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔ جہاں جاپانی نقش و نگار والار کی تھا۔ جس کی جاپانی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ چھو بھی کے حوالے کر گیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کر لی تو سوشل ماں کے مظالم سے تنگ آکر وہ گھر سے بھاگ گیا اور قیمت اسے سرس میں لے آئی۔ آپا راجہ نے مولوی سراج کو بتایا کہ اسکول والوں نے سعدیہ کی پیدائش کی پرچی مانگی ہے تو وہ پریشان ہو گئے۔ ماہ نور سارہ سے ملنے آئی اور اس نے سارہ کو بتایا کہ اس کی سعد سے صرف چند دن پہلے ملاقات ہوئی ہے یہ سن کر سارہ کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا۔

سعد نے اپنی بہن نادیدہ سے اس کا پربات کی۔ وہ فن لینڈ میں بہت مشقت بھری زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا شوہر اس پر بری نظر رکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ فن لینڈ آئی۔ جہاں بھکارن نے ایک بچہ اغوا کیا لیکن پولیس نے اس سے بچہ برآمد کر لیا۔ ماہ نور کی سعد سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے اختر کے پاس لے گیا۔ اختر نے ماہ نور کو دیکھ کر سعد سے کہا "یا تو زن یا من پالو" ایک کی قربانی دینی پڑے گی۔ اس نے ماہ نور سے کہا ابلی آپ کا دل بہت صاف ہے اور زندگی بہت پرسکون ہے لیکن آگے آپ کے لیے بہت مشکلات ہیں۔

فلزا ظہور سعد کو فون پر کسی تصویر کی نمائش کی دعوت دیتی ہیں۔ سعد اپنے فریگفٹ کے دورے کی وجہ سے معذرت کر لیتا ہے۔ ماہ نور فاطمہ اور خدیجہ کو فلزا ظہور سے ملاقات کے بارے میں بتاتی ہے۔ فاطمہ ماہ نور سے سعد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتی ہے۔ وہ بے دلی سے ہائی بھرتی ہے کیونکہ سید پور سے آنے کے بعد سے سعد کا فون مسلسل بند رہا تھا جبکہ سارہ خان کو اس نے اپنے جرمی جانے کی اطلاع دے دی تھی۔



تک نہیں ہوا تھا۔

کبھی کبھی تو اسے لگتا کہ اماں اور باپ صرف اس کے باپ تھے آپس میں میاں بیوی تھے ہی نہیں، اگرچہ میاں بیوی کے رشتے کو بہت زیادہ حد تک سمجھ نہیں پاتی تھی کیونکہ بیاہی کی جو کتاب وہ پڑھ رہی تھی اس میں مرد اور عورت کے تعلق کو کسی جانور یا پودے کی حیات کے ذریعے بیان کیا گیا تھا، مگر اتنا اندازہ اسے ضرور تھا میاں بیوی کے تعلق میں اتنا پردہ اور ایک دوسرے کی اتنی حیا نہیں ہوتی جتنی اس کے ماں باپ کے درمیان حا

تھی، جو وہ سردی کی دھوپ میں بیٹھ کر پڑھنے کے لیے اٹوار کی چھٹی والے دن چھت پر بیٹھ جاتی تو اسے ارد گرد کے گھروں سے رشتوں میں جذبات محبت عزائی ناراضی اور کھلکھلاہٹ کی اتنی محکم اپنی حیات تک پہنچے محسوس ہوتی وہ اس وقت اپنے محسوسات خود اپنے سامنے ہی وضاحت کرنے سے قاصر رہتی۔ کسی گھر میں میاں بیوی کی تو تکار، کسی گھر میں باپ بیٹے کی گفتگو، کسی گھر کے کھلے دروازے سے آنے والے مہمان کی آمد پر فتنے، کسی میں موت پر لعنت، آوازیں بغیر کسی کوشش کے اس کے کانوں پہنچیں اور وہ ان ہی آوازوں کے ذریعے رشتوں کی اہمیت کو سمجھتے سمجھتے اس عمر تک آپہنچی تھی کہ دل دماغ میں اٹھتے والے سوال زبان کے ذریعے آواز پانے لگے تھے۔

”اماں نے تو کبھی نہیں بتانا میں خود ہی کوشش کر کے پتا کرتی ہوں اور لازمی پتا کرتی ہوں۔“

اس نے اس سارا دن کی ذہنی کشش کے بعد فاسٹل فیصلہ کرتے ہوئے سوچا اور صبح کی نسبت بلکہ ذہن کے ساتھ اسکول کے گروانڈ میں موجود ان لڑکیوں کے گروپ میں جا بیٹھی۔ اس کی طرح جن کا تائید بھی ابھی انہیں لینے نہیں آیا تھا۔ وہ لڑکیاں اپنے درمیان ایک ہفتہ وار رسالہ پھیلانے بیٹھی تھیں، اس رسالے میں رنگ برنگ تصویریں تھیں اور فیشن کے مطابق بلوسات بھی۔

”اس رسالے میں سب کچھ ہوتا ہے، دین اسلام کی باتیں بھی، گمانیاں بھی، کھانے پکانے کی ترکیبیں بھی، ملک کے حالات کی خبریں بھی، نئی ایجادات کے بارے میں معلومات بھی، اس کی اپنی ہم جماعت فردوس خواجہ رسالہ لے کر آئی تھی اسے بتایا۔

”اگر تم ہرانو فردوس! تو آج میں یہ رسالہ گھر لے جاؤں۔“

سعیدی نے تانے میں بیٹھنے سے پہلے اچانک فردوس سے کہا۔ سعیدی کا یہ سوال فردوس کے لیے اگرچہ انوکھا تھا مگر اسے سعیدی کو وہ رسالہ دینے میں کوئی تامل نہ ہوا جو وہ ہفتے پرانا تھا اور جسے وہ الف تاپیے پڑھ چکی تھی۔ اس نے وہ رسالہ سعیدی کو دے دیا۔ اس روز سعیدی اپنے بسترے میں ایک نیا جہان لے کر گھر پہنچی تھی۔

\*\*\*

”تمہیں روزگار کے جھنجھٹ سے بول آزاد دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے۔ کیا تم جانتی ہو؟“ شیکھر نے بہت دن بعد نادبہ کے نظر آنے پر اس سے کہا۔

”شکر ہے۔“ نادبہ ہولے سے ہنسنے لگی۔ ”مگر تمہیں یاد رہے کہ کسی کو ادھار دینے کے لیے میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ شیکھر کھلکھلا کر ہنس دیا۔ ”اور تمہیں بھی یاد رہے کہ میں ان دوستوں میں سے نہیں ہوں جو ادھار مانگنے کی خاطر ایسی باتیں کرتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ نادبہ نے کہا۔ ”میں تمہارا نام ایسے دوستوں کی فہرست میں آج ہی شامل کر لوں گی۔ جو ادھار مانگنے کی خاطر ایسی باتیں نہیں کرتے۔“

”لیکن میں ایسا دوست ضرور ہوں جو یہ پوچھنا چاہے گا کہ نادبہ! کیا تمہاری کوئی لائبریری ہے؟ کوئی جیک

پاٹ ہاؤس لگا ہے یا کوئی دولت مندر شہ دار مرگیا ہے۔“ شیکھر نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

”اور میں ایسی دوست ہوں جو کم از کم تم جیسے دوست کو یہ ضرور بتائے گی کہ ان میں سے کوئی بھی بات نہیں ہوتی۔“ نادبہ مسکرائی اور اس نے ہاتھ میں پکڑے ڈرنک کی بول منہ سے لگائی۔

”وہ تو پھر کیا ہوا جو تم ایک دم روزگار ڈھونڈنے کی مشقت سے آزاد ہو گئیں، یقیناً؟ تم یہ نہیں بتاؤ گی۔“ شیکھر نے ترچھی نظروں سے نادبہ کو دیکھا۔

”ہرگز نہیں بتاؤں گی، کیونکہ یہ میرا راز ہے، اور اسے میں کسی پر افشا نہیں کر سکتی۔“ نادبہ نے جواب دیا اور ہنس دی۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“ شیکھر نے شانے اچکاتے ہوئے کہا اور باپ کارن کے پیکٹ سے دانے سے نکال کر کھا لے گا۔

”کسی شام آنا، میں تمہیں کافی پلاؤں گی اور سینڈویج بھی کھلاؤں گی، دو ایسی چیزیں جو مجھے بتانی آتی ہیں۔“ نادبہ نے اٹھتے ہوئے شیکھر سے کہا۔

”میں سینڈویج سے زیادہ بھلی پوری میں دلچسپی رکھتا ہوں، اگر وہ کسی کو بتانی آتی ہوں تو شیکھر مست ہو رہا تھا۔“

”یہ سب سالے۔“ نادبہ نے کہا، ”کسی قیمت پر نہیں۔ زبان کاٹ دیتے ہیں۔“

”اور مغربی کھانے۔“ شیکھر نے منہ ہتی آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ ”ایک دم بکواس، زبان چاٹ جاتے ہیں۔“

”تو مجھے کیوں کہہ رہے ہو۔“ نادبہ نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں مغربی نہیں ہوں۔“

”تو پھر تم کون ہو؟“ شیکھر اب مکمل طور پر ہن ہو چکا تھا اس کی آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔

”میں پاکستانی ہوں شیکھر!“ نادبہ نے شیکھر کی ناک کو انگلی سے چھوتے ہوئے شرارتاً کہا۔ ”جی جان سے تمہاری دشمن۔“

”اور تمہیں یہ بھی نہیں پتا کہ تم پاکستانی مسلمان ہو یا پاکستانی لادین۔“ شیکھر نے اپنی مست آنکھیں کھولیں اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

نادبہ شیکھر کے اس جملے پر ہنسی اور پھر خاموش ہو گئی۔ اس نے ایک نظر شیکھر پر ڈالی جو آنکھیں موندے کوئی پوربی گیت گنگنا رہا تھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے اس رستوران کے دروازے تک پہنچی لیکن وہاں سے واپس مڑ کر وہ بارہ شیکھر کے قریب آ گئی۔

”ہے شیکھر!“ اس نے ایک بار پھر شیکھر کی ناک کو چھو کر اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا۔ ”معاف کرنا میں نے تمہیں تنگ کیا۔“ اس نے اپنے بالوں کو جھٹک کر چہرے پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ میں ”صرف یہ بتانا چاہتی تھی کہ اپنی ڈائری میں آج یا دسے لکھ لینا، نادبہ بلال پاکستانی مسلمان ہے۔“

شیکھر نے بشکل آنکھیں کھول کر اس کی بات سنی اسے سمجھا اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ ”لگتا ہے آج تم نے



”جی خوب پللی ہے نادیر۔“ وہ بولا اور ہنسنے لگی۔ آئیں موندھ لیں۔

”ٹھیک ہی تو ہنسا تھا شکھو۔“ یونیورسٹی روڈ پر سائیکل چلاتے ہوئے نادیر نے شکھو کے رد عمل پر اچھے طرح کھول لینے کے بعد سوچا۔ ”میرے چلے چمکتو اور طرز زندگی کو دیکھ کر کوئی کیسے مان سکتا ہے کہ میں پاکستان مسلمان ہوں۔“ یقیناً اس بات کو سال کا سب سے بڑا لطیفہ قرار دیتے ہوئے اتنی ہی زور سے ہنسا چاہیے۔

اوپر آواز میں شکھو ہنسا تھا۔

اسے خود پر غصہ آیا تھا کیا کسی اور پر یہ شاید اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر وہ اپنا سارا غصہ سائیکل کے پیدل پر اتار رہی تھی جنہیں وہ اتنی تیزی سے تھما رہی تھی کہ وہ جسے چوں کی آوازیں دینے لگے تھے۔

\*\*\*

”کیا حال ہے ماہ نور؟“

”آئی ایم سوری میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

”چھا چلو۔“ کوئی بات نہیں میں نے شاید غلط نمبر پر کال کر دی۔ کیا خیال ہے ہند کر دوں فون پھر؟“

”میں کسی ایسے شخص سے بات کیوں کروں جو اپنی مرضی سے بات کرنا اور پہچانتا ہے۔ مرضی نہ ہو تو بالکل اجنبی بن جاتا ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔ تم سخت ناراض ہو اور تمہیں ہونا بھی چاہیے۔“

”نہیں۔ تم کچھ نہیں جانتے اور ہر بار مجھے اسی طرح ہرٹ کرتے ہو۔ آئی ایم سوری۔ میں بار بار ہرٹ ہونا نہیں چاہتی۔“

”پلیز ایسی بات مت کرو، کل رات ایسا نہیں تھا کہ میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ ایسا بھی ہرگز نہیں تھا کہ میں تم سے بات کرنا اور تم سے ملنا نہیں چاہتا تھا یقیناً کوئی کوئی بات نہیں تھی۔“

”پھر تم نے ایسا کیوں کیا، مجھے مت کیوں کیا۔ مجھے مسیح کر کے کیوں روکا۔“

”سمجھو اس میں کچھ مصلحت تھی۔ اس وقت ہم ایک بزنس میٹنگ سے اٹھ کر آئے تھے اور اس وقت میرے ساتھ ایسے ہی لوگ تھے جن کے ساتھ ہمارے صرف بزنس ریلیشنز ہیں۔“

”تو کیا ہوا۔“ مجھے تو صرف تم سے پہلو ہائے کرنا تھی میرے ساتھ میرے بابا اور می تھیں مسلمان بھی تھا میں تمہیں ان سے ملواتی اور بس۔“

”میرے ساتھ بھی میرے ڈیڈی تھے ماہ نور اور لوگوں کے علاوہ۔“

”میں سمجھ گئی تھی میں نے انہیں دیکھا تھا اور دیکھتے ہی پہچان گئی کہ وہ ہی تمہارے ڈیڈی تھے، تم دونوں ایک دوسرے سے اتنا زیادہ مشابہت رکھتے ہو۔ تمہارے درمیان صرف عموں کا فرق ہے۔ لیکن کیا فرق پڑتا تھا۔ کہ وہ تمہارے ساتھ تھے میں ان سے بھی مل لیتی۔“

”نہیں ماہ نور اتم نہیں سمجھو گی۔ ڈیڈی کا مزاج عام انسانوں سے بہت مختلف ہے، وہ تعلقات اور رشتوں کو بھی بزنس میٹنگ کی طرح ہینڈل کرنے کے عادی ہیں، لہذا نقصان کی کھلکھولیشن کی طرح ان کو بھی کھلکھولٹ کرتے ہیں میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہارے جیسی شخص اور اچھی دوست کے ساتھ میری دوستی کا تعلق ان کی نظروں کے سامنے آئے۔ میرے معاملے میں وہ بے حد حساس بھی ہیں، انہیں ہر اس انسان کی جو کسی کرنے کا خط بھی ہے جس سے میرا تعلق ہوتا ہے اسی وجہ سے میں اپنے معاملات ان سے بہت خفیہ رکھتا ہوں۔“



”مجھے یہ سوچ کر رونا آ رہا ہے کہ کل رات میں کس کانفیڈنس کے ساتھ سارے فنکشن کے دوران ادھر سے ادھر اڑی پھر رہی تھی جبکہ لوگ میری جھیلوں جیسی شکل پر ہنس رہے ہوں گے۔“

”افسوس ہی۔ تم تو بہت سی کانٹنسنس ہو گئیں، میری بھی سمجھ میں وہ الفاظ نہیں آ رہے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔“

”نہ بھن کو تو بھی مجھے بتا ہے۔“

”اچھا چھوڑو اس بات کو یہ بتاؤ کہ آج کل کیا ہو رہا ہے۔“

”شادی کے جنگاموں میں کتنے ہی دن ضائع ہو گئے اور اب تو اسٹریڈز کا بہت ہی زیادہ پریشر ہو گا۔“

”مطلب تم سے ملاقات مشکل ہے۔“

”نہیں۔ ایسا بھی ہرگز نہیں ہے تم میرے گھر آؤنا کسی دن، بلکہ ایک دو دن میں ہی آ جاؤ کیونکہ میرے چچا کی فیملی نے دو تین دن میں واپس چلے جانا ہے اور ان کے ساتھ کھاری بھی چلا جائے گا پتا ہے کھاری اس سائیں بہت یاد کرتا ہے جو اسے بابے منگو کے میلے پر ملا تھا۔“

”ہا ہا ہا۔“

”بات سنو تم نے آف لے لیا ہے، کہیں کوئی نیا ہیروپ بدلنے کا ارادہ تو نہیں۔“

”ہا ہا ہا۔ اچھا ایسا ہے کہ ایک دوست کی کال آ رہی ہے ذرا اس کی بات سن لوں، تمہیں پھر کسی وقت کال کرنا ہوں۔“

”ہاں ضرور اپنا خیال رکھنا۔“

”ماہ نور نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا اور مسکرا دی۔ وہ سعد کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد مہسج کی ٹوان نے اسے سوچ سے جو نکال دیا۔ اس نے مہسج پڑھا۔“

”یاد آ گیا میں تمہارے کل والے روپ کے بارے میں دراصل کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ میں کہنا چاہ رہا تھا۔“

Girl you are amazing  
just the way you are  
(تم جیسی بھی ہو مہسج کر دیتی ہو)

\*\*\*

”آپ کے والدین ہوری کہاں رہتے ہیں جناب۔“

کھاری نے منہ کڑائی اور کنٹاکٹ پلیٹ میں اکٹھے ڈال کر ان کو ملاتے ہوئے محمد رضوان الحق سے پوچھا۔ وہ محمد رضوان الحق کی دعوت پر دہلی کھانوں کے اس ہوٹل کی ایک میز پر بیٹھا خود کو انتہائی اہم شخصیت سمجھ رہا تھا۔

”یہ تو مجھے بھی نہیں پتا بھائی افتخار! رضوان الحق نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں میز پر رکھے شیشے کے پیول دان پر جماتے ہوئے کہا۔ شیشے کے اس پیول دان میں پتلی سی شاخ پر سجا گلاب کا مصنوعی پھول بے بسی سے ایک طرف گردن نیہوڑائے جھول رہا تھا۔“

”میں نے مدت ہوئی نہیں کھو دیا۔“ اس نے کھانے میں مگن کھاری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کھاری کا لقمہ بتا تا ہاتھ ایک دم رگ گیا۔ اس نے سر اٹھا کر رضوان الحق کی طرف دیکھا اور پھر سر ہلا کر توجہ دوبارہ لقمے پر مبذول کر لی۔

”بڑے خوش قسمت ہو جی پھرتے تسی۔“ اس نے ان کو کھو دیا۔ ایس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے اوتار کو

کبھی پایا بھی تھا، ہے نا؟“ اس نے تائید طلب نظروں سے رضوان کو دیکھا۔ ”مطلب تمہاں نے اپنے والدین دیکھے ہیں؟“ رضوان نے سر ہلایا۔

”ہاں دیکھے ہیں، افتخار بھائی!“ اس نے کہا۔ ”جب میں چھوٹا تھا تو ماں اور باپ دونوں کے ساتھ ہی رہا کرتا تھا۔“

”تو پھر آپ تو خوش قسمت ہوئے ناجی! کھاری نے روٹی کے آخری نوالے سے پلیٹ صاف کرنے کے بعد نوالہ منہ میں ڈال لیتے ہوئے کہا۔

”شاید رضوان شاید کھاری کی بات سمجھ نہیں پایا تھا اس لیے اس نے گوگوں میں جواب دیا۔

”میں ہوں نا۔“ کھاری نے نشوونما سے صاف کرنے کے بعد ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنے ماں پید کیے بھی نہیں۔“ میں اوتار کی شکال سے بھی واقف نہیں۔ مجھے ان کا نام پتا آگا پچھا بھی نہیں پتا ماسی جنت کمنی ہے۔ کھاری باؤ بوٹی پر جو لیں (زیادہ کھوج) نہ کیا کر، بوٹے سوال نہ پوچھا کر، گلے کہیں گے جاوے افتخار احمد اپنا نہیں تو حلال کا بھی ہے کہ نہیں۔“

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ رضوان الحق نے دیکھا ہنستے ہوئے، کھاری کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

”ایس لیے میں تو سوچتا بھی نہیں، میں تو کچھ بچھا ہوا بھی نہیں۔“ کھاری نے اپنے ہاتھ میں پکڑے نشوونما سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا اور سر اٹھا کر رضوان کی طرف دیکھا۔

”تو ناہنسی سے (زیادہ ہنس) تو آنکھوں میں آنسو (آنسو) آجاتے ہیں؟“ اس نے مسکرا کر آنکھوں پر ایک دفعہ پھر نشوونما پیر رکھ لیا۔

”پتا نہیں افتخار بھائی! رضوان الحق نے جھرجھری لینے کے بعد سر ہلایا، ”کون زیادہ خوش قسمت ہے۔ لیکن ایک بات ہے، میں نے تو خود اپنے ماں باپ کو چھوڑا، میں بہت سال پہلے گھر سے بھاگ گیا تھا۔“

”اچھا ناجی! کھاری نے حیرت کا شکار ہوتے ہوئے کہا۔

”فرق دیکھو افتخار بھائی! تم نے ماں باپ نہیں پائے پھر بھی اللہ نے تمہیں ایک محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دیا۔ میں نے ماں باپ پائے لیکن ٹھکانے کو لات مار دی۔ تمہیں یہ فکر نہیں ستانی کہ سارا دن کام کرنے کے بعد رات کہاں گزارنی ہے۔ مجھے یہ فکر سارا دن ڈھنگ سے کام نہیں کرنے دیتی کہ دن نو گزر گیا رات کا کیا ہو گا۔“

کھاری آنکھیں کھولے دم بخود بیٹھا رضوان کی بات سن رہا تھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

- ☆ تملیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 225 روپے
- ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 500 روپے
- ☆ محبت بیاں نہیں لعلی جدون قیمت: 250 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361



”تم نے آنکھ کھولی، ہوش سنبھالا تو اپنے نہ سہی! اپنیوں جیسے کچھ رشتے اپنے ارد گرد پائے، میں نے آنکھ کھولی ارد گرد اپنیوں کو پایا، مگر جب اپنیوں سے چھڑ گیا تو پھر کوئی! پناہ نہ بن سکا۔ میں اس اتنی بڑی دنیا میں اللہ کے اسے زیادہ بندوں کے درمیان بالکل اکیلا ہوں افتخار بھائی!“

اب کے جھڑ جھڑ لینے کی باری کھاری کی تھی۔

”اوتے ہوئے ہوئے!“ کھاری نے آنکھیں جھپکا کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بھلا دسو دنیا وچ جس کو پھولو (کھون لگاؤ کوئی دیکھی ہے۔“

”نہیں افتخار بھائی یہ دنیا کا جو میلہ ہے نا اس میں سب بندوں کو خوش ہونے کا موقع بھی ملتا ہے، دکھ کی کہانی سنا کر ہم بندے نا شکری بھی کرتے ہیں اور دکھ کی کہانی سنانا کر خوش بھی ہوتے ہیں۔“ رضوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کئی لوگ ہیں جی دنیا میں۔“ کھاری نے رضوان کی بات سمجھ بغیر اسے مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے بڑے ایسے دیکھے ہیں جو بھی دیکھی نہیں ہونڈے، سدا خوش رہندے ہیں۔“ یہ اپنی جومہ نور بی بی ہے نا، پھر اس نے باز میز پر رکھ کر آگے جھٹتے ہوئے سرگوشی کی۔

”وہی جو آج تم نے دیکھی جب تم مجھے لینے نہیں آئے تھے۔“ اس نے رضوان کو یاد کرایا۔

”ہاں!“ رضوان نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اسے وہ لڑکی یاد آگئی جو کھلکھلا کر ہنستے ہوئے افتخار سے اس کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور جس نے دوستانہ انداز میں اسے پہلو بھی کہا تھا اور جس کی عمر مسکراہٹ زندہ دہلی اور چہرے پر چھائے خوشگوار تاثرات کو دیکھ کر رضوان کو نجانے کیوں ایک پرانا چہرہ ایک گزرا وقت، ایک پرانا تعلق یاد آ گیا تھا۔

”اس کو کوئی دکھ نہیں ہے۔“ کھاری نے جیسے رضوان کو ایک راز کی بات بتائی ”اس کو اکیلی کو نہیں اس کے خاندان میں کسی کو کوئی دکھ نہیں، سارے بڑے خوش ہیں اللہ کے فضل سے۔“

”چلو افتخار بھائی! اچھی بات ہے۔“ رضوان نے وہ کہنے کا رادہ منسوب کرتے ہوئے کہا جو وہ افتخار کی اس بات کے جواب میں کہنا چاہتا تھا۔

”دعا کرو جو خوش ہیں ہمیشہ خوش رہیں، ان کو کبھی کوئی دکھ نہ پہنچے۔“ اس نے کھاری کی طرف دیکھا جو اس کی بات کی تائید میں سر ہلا رہا تھا۔

”چلو پھر تو طے ہے نا کہ تسی ہمارے پاس آرہے ہو میلے تے؟“ کھاری نے مسکراتے ہوئے موضوع گفتگو بدلا۔ اسے رضوان الحق کی اس ممان نوازی کا بدلہ چکانے کی فکر ہو رہی تھی جس کی وجہ سے اس نے کئی دنوں بعد اتنا مزے دار ویسے کھانا کھایا تھا۔

”ہاں وہ تو میں ضرور آؤں گا ان شاء اللہ۔“ رضوان نے کہا۔

”چلو فیئر میں تو واپس جا کر بس آپ کے آنے کی ایک (انتظار) میں ہی رہوں گا۔“ کھاری خوش ہوتے ہوئے بولا۔ میرے نے اس کے سامنے فیئر کی ٹھوٹھیاں لا کر رکھی تھیں۔

”واہ ولی واہ۔“ وہ دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھا لاہور شہر میں بس فاس فوڈ (فاسٹ فوڈ) اور انگریزی چینی، چینی، چینی کھانے ہی ملتے ہیں۔“ اس نے رضوان سے کہا جو مسکرا رہا تھا۔

”چینی، چینی سے یاد آیا، آپ کے اجابی چینی چینی تھے کہ اماں ہو رہی؟“ اس نے سوال کرنے کے بعد ایک دفعہ رضوان پر یہ دیکھنے کے لیے ڈالی کہ وہ اس انتہائی ذاتی سوال پر ناراض تو نہیں ہوا۔

اس نے دیکھا رضوان کا چہرہ ہی نہیں چھوٹی چھوٹی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

”آپ کا کیا خیال ہے، کون ہو گا ان دونوں میں سے؟“ اس نے کہا۔

”کئی لوگوں کی تو اماں، جی بی یا ہری ہوئی ہیں ابے ادھر کے ہی ہوتے ہیں۔“ کھاری نے اپنی معلومات کھنگال کر جواب دیا۔ ”ہمارے پنڈ میں مجھوں کا بیٹا گیا تھا جرمی اس نے ادھر میم سے شادی کر لی تھی ایک دفعہ میم لے کر آیا تھا۔ ہماری جو چوہدرانی ہیں نا ان کو میم کا بڑا چاہ (شوق) چڑھا، اوہناں نے میم کی دعوت بھی کی تھی فارم ہاؤس پر چوہدری صاحب بولے لو دسو مجھوں کا پتراب اتنا اپار ٹمنٹ (ایپورٹمنٹ) ہو گیا ہے۔“

وہ ٹانگ رہا تھا مارتے ہوئے زور سے ہنسا۔ رضوان دلچسپی سے اس کی بات سنتے ہوئے مسکرایا۔

”پر اس کے بعد وہ مرنے نہیں آیا۔“ کھاری نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اتنے اتنے اس کے ایانے (بچے) ہیں۔“ اس نے ہاتھ کی بندنی سے اندازہ کراتے ہوئے کہا۔ ”چنے دودھ، نرے انگریز، اوہناں کی تصویریں مجھوں کے گھر بٹھک کی دیوار پر فریم میں لگی ہیں۔“ رضوان نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

”پر جناب! تسی کیوں واپس آگئے باہر سے، ادھر امی جی کے پاس ہی رہنا تھا، ابے ہو وروں کی کمائیاں کھاتے آرام سے۔“ اوتے ہوئے آپ ادھر سے بھاگ کے تو نہیں آئے ہو گے ہوائی جہاز میں اڈھ (اڑ) کے آئے ہو گے۔ آئندہ یہ نہ کہا کرو کہ میں گھر سے بھاگا تھا، کہا کرو میں گھروں اڈیا (اڑا) تھا۔“

”واہ افتخار بھائی! آپ باتیں بہت مزیدے کی کرتے ہو۔“ رضوان نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا۔

”خیر جو بھی ہوا ہو گا۔ آپ کی مرضی بھی نہیں رہے ماں پوکے پاس۔“ کھاری نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

”پر آپ کو پتا اڈریس (ایڈریس) تو یاد ہو گا نا؟“ اس نے سوالیہ انداز میں رضوان کو دیکھا ”تے پھر کدھی واپس چلے جاؤ ماں پوکے معاف کر دیتے ہیں، کوئی بات نہیں ہوتی۔“

”ٹھیک کہتے ہو افتخار بھائی!“ رضوان نے اکتے ہوئے متانت سے جواب دیا۔ ”مگر بہت سے کام ہم چاہتے ہوئے بھی نہیں کر پاتے۔“

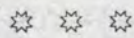
”چلو کوئی بات نہیں۔“ کھاری نے کھڑے ہو کر رضوان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”پر آگے سے ایک بات یاد رکھنا۔“

”وہ کیا؟“ رضوان نے کھاری سے کسی نصیحت کی توقع کی۔

”مجھے بھائی کہا ہے تو مجھے کھاری کہہ کر بلا یا کرو۔ اور یہ آپ جناب بھی نہیں کرنی۔ تسی بھانویں کتنے ورے (سال) ہی مجھ سے وڈے (بڑے) ہو، میں نے بھی آپ جناب نہیں کرنی آئندہ تول۔“

”اوکے، اوکے کھاری بھائی دن!“ رضوان نے مسکرا کر کہا۔

”ڈن نہیں، ڈن، ڈن۔“ کھاری نے فرضی پستول تانتے ہوئے منہ سے آواز نکالی۔ دونوں زور سے ہنس دیے۔



”تمہیں ایک بات بتاؤں۔“ ماہ نور نے محویت سے سعد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں ضرور۔“

”تم ڈن سوٹ میں واقعی بہت اچھے لگ رہے تھے۔“

”تھینک یو۔“ وہ مسکرایا۔

”اس روز میں سمجھی کہ جیسے تم نے مجھے خود کو مخاطب کرنے سے روکا ہے تو کیا پتہ یہ بھی تمہارا کوئی بہروپ ہو۔“ وہ زور سے ہنسا۔ ”روپ میں، بہروپ نہیں ہو نا لڑکی بہروپ دیکھنا تو کل تم لنڈا بازار آئیں۔“



”ہیں واقعی؟“ ماہ نور کا بازو اور ہاتھ پر نکاحہ اپنے اس اسٹینڈ پر مل گیا۔  
”ہاں!“ وہ مسکرایا۔

”تم نے وہ جراثیموں سے بھرپور پرائے، کسی کے اترے کپڑے بیچے؟“ ماہ نور کی آنکھیں کی پوری کھل گئیں۔  
”ہاں بالکل۔“ سعد نے اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر ماہ نور کے سامنے پھیلائے۔ ”مگر دیکھو، مجھے کچھ نہیں ہوا اب تک۔“

”شاید میں تمہیں کبھی سمجھ نہ پاؤں۔“ ماہ نور نے سر ہلایا۔ ”تم یہ سب کیوں کرتے ہو۔“  
”کیا کرو گی سمجھ کر؟“ اس نے کہا۔ ”ایسے ہی ٹھیک ہے۔“  
”گو یا تم آج کل آف ہو پھر سے۔“

”ہاں سیرل آف۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”وہ جو اس روز تمہارے رائٹ ہینڈ پر کھڑے تھے وہ جو بالکل تمہارے جیسے تھے عمروں کے فرق کے سوا وہ تمہارے ڈیڈی تھے نا؟“

”ہاں، ایسے لگے تمہیں؟“

”ایک دم زبردست!“ ماہ نور نے بچوں کی طرح جوش انداز میں کہا۔ ”اتنے ہینڈ سٹم اور گرلز فل۔“

”میں نے بتایا تھا تمہیں کہ وہ ایسے ہی ہیں۔“

”لیکن کیا تم دونوں سی آئی ڈی کے ایجنٹ ہو یا پھر خفیہ والے تمہارے پیچھے لگے ہیں جو تم ان کے سامنے مجھ سے ملنا نہیں چاہ رہے تھے۔“ ماہ نور کو ایک بار پھر اس دن والی مایوسی یاد آئی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔“ سعد نے شکر دان سے چینی اپنی چائے کے کپ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں دراصل ان کا کلو تا اور قیمتی بیٹا ہوں، شاید ان کا دنیا میں واحد رشتہ اسی لیے وہ میرے معاملے میں اتنے حساس ہیں کہ ہر وقت میری عمرانی پر تلے رہتے ہیں۔ انہیں مجھ سے متعلق کسی نئے شخص کا پتا چل جائے تو اس کے بارے میں بھی چونکے ہو جاتے ہیں کہ کہیں وہ نیا شخص مجھے کوئی نقصان تو نہیں پہنچانے والا۔ بس اسی لیے میں ان سے اپنے کچھ ایسے تعلق چھپا کر رکھتا ہوں مبادا میرا اتنا باریا رعلق ان کی چھان بین کا شکار نہ ہونے لگے۔“

”توبہ ہے، کتنی ان نیچل زندگی ہے بھی؟“ ماہ نور نے جھنجھلائے ہوئے کہا۔

”بس ایسی ہی ہے کیا کیا جائے۔“ سعد نے سر تڑچھا کرتے ہوئے ماہ نور کو دیکھا۔ ”لگتا ہے تم جلد تنگ آ جاؤ گی مجھ سے اور میری دوستی سے۔“

”نہیں، ہرگز نہیں۔“ ماہ نور نے سختی سے سر ہلایا۔ ”میں تمہارے بارے میں اتنا تو بہر حال جانتی ہوں کہ تم کیسے ہو۔“

”واقعی!“ سعد نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”جب ہی میرے بارے میں فوراً بدگمانی کا شکار ہو جاتی ہو۔“

”وہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔“ ماہ نور نے بے نیازی سے کہا۔ ”ویسے لنڈے کے کپڑے اور تم۔“ اس نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو وحشت ہو رہی ہے یہ سوچ کر۔“

”کل اگر تم مجھے وہاں دیکھ لیتیں تو کون ہو تم۔۔۔ تم کون ہو؟“ پکار ڈالتی آگے بڑھتی اور کیا پتا کہڑوں کی اس لاث بر جا کرتیں۔“ سعد نے اسے چڑایا۔

”توبہ اللہ نہ کرے۔“ ماہ نور کو تصور کر کے خوف آ گیا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ تم میرے گھر کب آرہے ہو؟“ پھر اس نے موضوع بدلا۔

”جب تم بلاؤ گی۔“

”میں تو آج بھی چاہ رہی تھی کہ تم مجھے یہاں بلا لے۔“ سعد نے میرے گھر آتے۔  
”میں نے سوچا، پہلے تمہارا اموز تو چیک کر لوں پھر تمہارے گھر پہنچوں، کہیں اب کے تم پہچاننے سے انکار کر دو۔“

”ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔“ ماہ نور نے فوراً جواب دیا۔

”اچھا یہ بتاؤ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری وہ خواہہ ہیں جن کا ذکر تم نے کئی بار کیا ان سے مل سکوں۔“  
”خدیجہ اور فاطمہ خالہ!“ ماہ نور نے پر جوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”ہاں ہاں کیوں نہیں؟ اتنی سویت خواتین ہیں وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ فاطمہ خالہ تو کئی بار مجھ سے کہہ چکی ہیں کہ سعد سے ہمیں ضرور ملوانا۔“

”اچھا؟“ سعد کو حیرت ہوئی ”وہ مجھے کیسے جانتی ہیں بھلا؟“ اچانک ماہ نور کو احساس ہوا وہ کچھ زیادہ بول گئی تھی۔

”وہ۔۔۔“ اس نے جواز سوچتے ہوئے ادھر ادھر آنکھیں گھمائیں۔  
”ہاں وہ۔۔۔“ اس نے بات بتانے کی کوشش کی ”فاطمہ خالہ کو کھارڈی نے بتایا تھا کہ میلے والے سائیں کی آواز بہت اچھی تھی۔“

”اچھا! سعد مسکرایا۔“ مگر وہ تو میلے والا سائیں تھا، تمہاری خالہ کو سعد کا کیسے پتا چلا؟“  
”ہاں وہ نا۔“ ماہ نور کو فوراً احساس ہوا کہ اس نے غلط جواز پیش کر دیا تھا۔ ”وہ شاید فلزا ظہور کے گھر جانے کے حوالے سے ذکر ہوا تھا کہ تمہارے ساتھ میں وہاں گئی تھی۔“

”اچھا! وہ نہا۔“ چلو مان لیتے ہیں۔ یہ بات مانی جاسکتی ہے۔“  
”ہوں!“ ماہ نور نے لمبا سانس لیتے ہوئے پسلو بدلا۔

”ویسے لاہور کی فضا اور یہاں کا ماحول اسلام آباد سے بالکل مختلف ہے۔“ سعد نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ایک رستور ان کے اوپن ایر ایریا میں بیٹھے تھے۔

”یہاں بے تکلفی اور بے ساختگی سی ہے جبکہ اسلام آباد میں ہر وقت بیورو کریٹک فضا چھائی رہتی ہے، بے تکلفی اور بے ساختگی نام کو بھی دیکھنے کو نہیں ملتی۔“

”اسی لیے تو جو مڑا یہاں ہے وہاں کہاں۔“ ماہ نور مسکرائی۔  
”وہ جگہ جہاں سارہ خان رہتی ہے، وہ بھی ہے تو چھوٹی سی مگر وہاں ساڈی کی فضا ہے، منعقد اور بناوٹ سے پاک وہ جگہ بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔“ سعد کو یاد آیا اور اس نے دانستہ اپنی بات مکمل کر کے ماہ نور کے چہرے کے تاثرات جاننے کی کوشش کی۔

”تم نے وہ پھول دیکھے؟“ جواب میں ماہ نور نے سر کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے جھٹکا اور بالکل ہی مختلف بات کی۔

سعد نے پھولوں کے ان تنخوں کی طرف دیکھا جن کی طرف ماہ نور نے اشارہ کیا تھا۔ سفید پھولوں کا ایک ننھے سبز پتوں اور شاخوں پر کھڑا تھا، یہ پھول بہار کی مخصوص منک سارے میں پھیلا رہے تھے۔

لاہور میں بہار آچھی تھی۔

آپا راجہ نے بستر جھاڑ کر دوبارہ بچھاتے ہوئے کن اکھیوں سے کرسی پر کتاب لے کر بیٹھی سعدیہ کو دیکھا۔ اس نے پھول دار کاشن کا وہلا دھلایا اور احتیاط سے استری شدہ سوٹ پہن رکھا تھا اس کے سیاہ گھٹے اور سیدھے بال

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆



سیلتے سے کنگھی کر کے چٹیا کی شکل میں گندھے تھے اس نے پاؤں میں سستی سی چپل پہن رکھی تھی اس کے پاؤں صاف ستھرے اور پاؤں کے ناخن طریقے سے ترشے ہوئے تھے۔  
 ”اسکول سے واپس آ کر کتے سیلتے سے کپڑے پہنے لگی ہے اور اسکول سے واپسی پر بھی کتنا ناظم بالوں میں کنگھی کرنے پر لگا رہی ہے کیا یہ وہی سعدیہ ہے جو ایک رنگ کے کپڑے پہنتی تھی یا تین رنگوں کے اسے کوئی پروا نہیں ہوتی تھی کیا یہ وہی سعدیہ ہے جو کئی دن بالوں میں کنگھی نہیں کرتی تھی بس اور اوپر سے کنگھی پھیرنے اچھے ہوئے بالوں کے ساتھ اسکول چلی جاتی تھی اور سارا سارا دن یونی گزاردیتی تھی نورے ہفتے کے بعد اتوار کی چھٹی کے دن جب وہ ان کے ہاتھ لگتی تھی تو وہ اس کے بالوں میں تیل لگا کر کنگھی پھیر پھیر کر اس کے بالوں کو سلجھاتی تھیں۔

”کیا یہ وہی سعدیہ ہے؟“ آپا رابعہ نے بے یقینی سے ایک بار پھر سعدیہ کو دیکھا جس کے چہرے پر بخیدگی تھی اور عمر کے ساتھ بڑھتے شعور کی جھلک بھی۔  
 ”وقت کہاں سے اور کب گزر گیا۔“ انہوں نے گم صم ہوتے ہوئے سوچا۔  
 ”سعدیہ کے چہرے پر نظر آتا اعتماد علم کا تحفہ ہی ناقص کا؟“ وہ سوچتی رہ گئیں۔  
 ”کتنے پرچے بانی رہ گئے تمہارے؟“ اپنی سوچوں کی روانی سے گہرا کر انہوں نے سوال کیا ان کا لہجہ درشت تھا یا تلخ انہیں خود اندازہ نہیں ہو پایا۔  
 ”وہ۔“ سعدیہ نے کتاب سے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔  
 ”نوس کے بعد گھنٹہ کر پڑھنا پڑے گا۔“ وہ ہاتھ میں پکڑی بستر کی چادر رکھ کر سعدیہ کے قریب چار پائی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

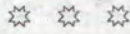
”کیوں؟“ سعدیہ نے کتاب سے نظریں ہٹا کر ان کی طرف دیکھا اس کے ماتھے پر تین چار بل بھی پڑ گئے تھے۔  
 ”دوسوں میں اسکول کے اخراجات بھی بڑھ جائیں گے اور تانگے کا کرایہ بھی تمہارا اباجی کی محدودی آمدنی میں یہ اخراجات پورے کرنے مشکل ہو جائیں گے اس لیے۔“ انہوں نے سعدیہ کے ماتھے پر پڑے بلوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔  
 ”کیا مطلب ہے اماں؟“ اب کے سعدیہ باقاعدہ حرکت میں آ گئی۔ ”کیا مطلب اخراجات پورے نہیں ہوں گے۔“ اس نے پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”مجھے تو ڈاکٹر بنانا ہے آپ نے؟ ڈاکٹر بننے پر کتنا پیسہ لگتا ہے پتا ہے آپ کو۔۔۔؟“ اس نے ان کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

”بس ایک ہی سال میں خبر ہو گئی ہمیں کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔“ آپا رابعہ نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”گھر بٹھا کر میٹرک کروائیں بڑی بات ہے ڈاکٹر بننے کے لیے جتنا سر اٹھانا پڑتا ہے کتنا اٹھا میں گے تو ہماری گردنیں ٹوٹ جائیں گی۔“

”مگر آپ نے یہ خواب دیکھا تھا آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔“  
 سعدیہ کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ آپا رابعہ سے سوال وجواب کے بدلے اسے اس کی زندگی کے واحد خواب اور اکلوتی آرزو سے دست برداری کی سزا ملنے والی تھی۔  
 ”ایک ہی سال کے اخراجات نے بتا دیا کہ خواب بھی اپنی اوقات کے مطابق ہی دیکھنے چاہئیں اور خواہشیں بھی بساط تک محدود رکھنی چاہئیں۔“  
 آپا رابعہ نے اپنا بازو سعدیہ کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے کہا اور اٹھ کر بستر پر چھوڑی چادر سیدھی کر کے

بچپانے میں مصروف ہوئیں۔ اس دوران تین چار بار انہوں نے سعدیہ کی طرف کن اکھیوں سے دیکھا۔ اس کا دھیان کتاب سے بالکل ہٹ چکا تھا۔ ان کے الفاظ کی برکتی نے اس کے تن سے سفید اور آل اور گلے میں پڑا اشتیاق کو بے آواز واحد میں چین لیا تھا۔ وہ مضطرب اور پریشان نظر آرہی تھی۔  
 ”کیوں یہ کل کا پرچہ بھی خراب نہ کر بیٹھے۔ شاید مجھے اس کے پرچے ختم ہو جانے کا انتظار کر لینا چاہیے تھا۔“ انہوں نے سوچا۔ لیکن وہ کیا کرتیں سعدیہ کے بڑے ہو جانے کے متعلق اچانک آنے والے خیال نے انہیں اس بری طرح ہزیمایا تھا کہ وہ سعدیہ کی سرکشی پکڑتی سوچ اور گستاخی کی حدود میں داخل ہوتی زبان کوئی الفور گرفت کے جال میں دو بوج لینا چاہتی تھیں۔

ان سے انتظار ہو سکا تھا نہ صبر انہوں نے جوابی حملہ کرنے میں دیر لگانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ کمرے میں بکھری چپرس سمیٹنے اور اس کا حلیہ درست کرنے کے بعد جب وہ کمرے سے باہر نکل رہی تھیں ان کے دل کو یقین ہو چکا تھا کہ سعدیہ آئندہ ان کے سامنے سوال کرنے اور طعنہ زنی سے پرہیز کرے گی مگر کمرے کے بند ہوتے کوڑے کے پیچھے بیٹھی سعدیہ کے ذہن میں کیسے کیسے خیالات اڑ رہے تھے آپا رابعہ کو ان کا گمان بھی ہوتا تو شاید ان کی منصوبہ بندی کچھ اور ہوتی۔



”تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“ فائزہ نے اپنے سامنے بیٹھے سعد سے رسمی سا جملہ بولتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ان بچوں سے مل کر خوشی ہوتی ہے جو اچھے طریقے سے اپنے کیریئر میں سیمٹل ہو چکے ہوتے ہیں کیونکہ ایسا ہو جانے کے بعد ان کے پیئرس کو سکھ کا سانس لینے کا موقع ملتا ہے۔“

”کیا یہ ہمیشہ اتنے ہی کھلکھولے الفاظ بولتی ہوں گی۔“ سعد نے اپنی پلیٹ میں رکھے چیزیاں میں سے ایک میں کاٹا کھینٹے ہوئے سوچا۔

اسے ایسے لوگوں سے مل کر کبھی بھی بہت زیادہ خوشی نہیں ہوتی تھی جو الفاظ اور لمحوں کی جمع تفریق کرنے کے بعد ایک خاص تناسب کے ساتھ بولنے کے عادی ہوتے تھے اس نے فوراً ”فائزہ کو اپنے ایسے ملاقاتیوں کی فرست میں داخل کر لیا۔

”میرا بیٹا سلمان لاہور ہے اور غیر مستقل مزاج۔ ایم بی اے کر لینے کے بعد سے اب تک دو سالوں میں وہ چھ جاہل بنڈل چکا ہے صرف اور صرف اپنے غیر پیشہ ورانہ رویے کی وجہ سے۔“ ان کے لہجے میں سختی ابھر آئی ”اور یہ ماہ نور ہے۔“ انہوں نے تنقید کا رخ ماہ نور کی طرف موڑا۔ ”میں نے اپنی زندگی میں اتنی لاہور اور غیر ذمہ دار لڑکی کوئی دوسری نہیں دیکھی۔“

سعد نے نظر اٹھا کر ماہ نور کی طرف دیکھا جو اپنی پیاں کی ان باتوں سے بے نیاز ناخنوں پر تازہ تازہ لگائی نیل پالش کو پھونکے مار مار کر سکھانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

”اسے ابھی تک یہ ہی معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ جو کچھ بڑھ رہی ہے کس لیے بڑھ رہی ہے اسے پڑھ لینے کے بعد اس نے کرنا کیا ہے۔ ہر دوسرے دن مستقبل سے متعلق اس کے منصوبے بدل جاتے ہیں کبھی یہ آرٹ کی دنیا میں انقلاب لانے کا منصوبہ بناتا رہی ہوتی ہے کبھی این جی او بنانے اور چلانے کا عزم ہو رہا ہوتا ہے کبھی اپنے چچا کے ساتھ ایگری کلچر کی فیلڈ میں انقلاب برپا کرنے کے پلان بن رہے ہوتے ہیں تو کبھی کسی خالہ کے پاس ملک سے باہر جا کر کوئی ریسرچ کرنے کا پروگرام بن رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ ان سب منصوبوں کا اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں جو یہ اصل میں پڑھ رہی ہے۔“ انہوں نے ایک سخت نگاہ نور پر ڈالی۔ ”اس کے ساتھ کی لڑکیاں میں نے



دیکھا ہے اپنی مصروف روٹین کے باوجود مختلف نجی کمپنیوں کے لیے فری لانسنگ کر رہی ہیں، کیوں بھلا؟  
انہوں نے سوالیہ نظروں سے سعد کو دیکھا۔

”اس لیے کہ وہ اپنی پروفیشنل لائن اور فیوچر کی پیر کے بارے میں سیریس ہیں۔“ انہوں نے خود ہی جواب دینے ہوئے کہا۔ ”جبکہ اس کے بارے میں تو سوچ سوچ کر میری عقل جواب دے گئی ہے۔“ جس لڑکی کو اتنے سالوں میں یہ پتا نہیں چلا ہو کہ اسے کس موقع پر کون سا ڈریس پہننا چاہیے اس سے فیوچر پلاننگ میں سنجیدگی کی توقع کیے کی جاسکتی ہے۔ ہمارے جیسے پیر میں کی فکریں کون سمجھ سکتا ہے جو اولاد کی بہتری کے لیے بھاگے پھرتے ہیں اور اولاد ہے کہ اپنا کوئی سرائیک نہیں چلائی۔“

انہوں نے افسردگی کے ساتھ سعد کو دیکھا اور اپنا چشمہ اتار کر صاف کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ ”اچھا ابھی سعد سلطان! ایک بار پھر کہیں گی تم سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ پلیر تکلف مت کرنا، کمفوٹیل ہو کر چائے انجوائے کرو، مجھے ایک ضروری کام سے نہ جانا ہوتا تو مزید تمہارے ساتھ بیٹھتی۔“  
وہ آہستگی سے سعد کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے نئے تلے الفاظ بولنے کے بعد کمرے سے چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد سعد اور ماہ نور نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ماہ نور بے اختیار ہنس دی۔

”تم نے دیکھا، میری ممی کتنی ٹائم کانفیس ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی ”کتنے وقت میں انہیں کتنی باتیں کرنی ہیں“ انہوں نے پہلے سے سوچا ہوتا ہے۔  
”ہاں“ میں بھی یہ ہی سوچ رہا تھا۔ ”سعد نے سر ہلایا۔ ”مگر انہیں تم سے اتنی شکایتیں کیوں ہیں بھی؟“ اس نے شرارت بھرے انداز میں ماہ نور کو دیکھا۔

”در اصل ممی کی perfectionist (کاملت پسند) ہیں، وہ اپنے مقرر کردہ معیار سے نیچے ہمارے لیے کچھ سوچ ہی نہیں سکتیں اور ہم سے بلکہ ہم سے ہی کیا ہر ایک سے مطلب بابا سے لے کر گھر کے ایک عام ملازم تک سے یہ توقع کرتی ہیں کہ وہ اس perfection کے معیار کو چھوئے جو انہوں نے اپنے ذہن میں سوچی ہوئی ہے۔ کسی کام میں، کسی بات میں کوئی بھی کمی یا کمی انہیں ٹینشن میں ڈال دیتی ہے۔“

”یہ کافی مشکل صورت حال نہیں۔“ سعد نے چائے کی پیالی کے سنہری کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔  
”مشکل!“ ماہ نور نے بے بسی سے کہا۔ ”بہت ہی مشکل صورت حال ہے۔“ ایک دفعہ ایسی ہی ٹینشن کا شکار ہو کر ممی اسپتال بھی پہنچ چکی ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”تو پھر تم لوگ یقیناً“ انہیں غیر معمولی سے زیادہ ٹینشن دیتے ہو گے۔“ سعد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔  
”نہیں ایسا نہیں ہے۔“ ماہ نور نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی پر تنے دینے پر دوں کی ڈوری کھینچ کر مٹاتے ہوئے کہا۔  
”ہم انہیں خوش، مطمئن اور پرسکون رکھنے کی حتی الوسع کوشش کرتے ہیں مگر سوچو، ہم انسان ہیں، مشین کل پرزے تو نہیں جو ہر وقت یک ساں چلتے رہیں۔“

”یہ بھی ہے۔“ سعد کے لیے یہ ایک نئی اور انجان صورت حال تھی۔  
”میں ڈیڈی کو اور ڈیڈی مجھے کتنا زچ کرتے ہیں لیکن شکر ہم میں سے کوئی ہاسپٹل نہیں پہنچتا۔“ اس نے سوچا اور اپنی سوچ پر خود ہی مسکرایا۔

”لو کھاری اور سردار چا چا بھی آگے۔“ ماہ نور کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ لوگ تائی صابرہ کو فائنل شاپنگ کرانے گئے ہوئے تھے، کل یہ لوگ واپس جا رہے ہیں، تم لوگ غاناں سے بھی؟“ اس نے سعد کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔

”ضرور۔“ وہ چائے کا کپ میز پر رکھ کر بولا۔ ”میں یہاں تم سے اور تم سے متعلق لوگوں سے ہی تو ملنے آیا ہوں“

اس کی بات کے جواب میں ماہ نور کے چہرے پر جو مسکراہٹ ابھری تھی وہ بہت دل فریب تھی۔ سعد اس مسکراہٹ کو دیکھ کر مسکرایا۔



”تم نے یہ تین اسبجکٹس جو کلر کی ہیں ان میں تمہارا ہاتھ مشاقی سے رواں ہوا لگتا ہے۔“ سیسی آئی نے عینک کے اوپر سے ہاتھ میں پڑی کلرنگ بک کے صفحے پلٹتے ہوئے ماہ نور کے رائے کا اظہار کیا۔  
”امپر ومنت ہے نا؟“ سارہ نے بچوں کے سے شوق کے ساتھ سوال کیا۔

”یقیناً ہے۔“ سیسی آئی نے کلرنگ بک میز پر رکھتے ہوئے چشمہ ناک کی پھٹنگ سے اوپر کی طرف کھسکایا۔  
”دیکھا!“ سارہ گفتگو کے درمیان ہاتھ دباتے ہوئے مسکرائی۔ ”اس سے ثابت ہوا کہ میں اتنی بھی بے کار نہیں ہوں۔“

”یہ تمہارا اپنا خیال تھا کہ تم بالکل بے کار ہو چکی ہو، کسی دوسرے نے تمہیں ہرگز یہ نہیں کہا تھا۔“ سیسی آئی نے اسے یاد دلایا۔

”اب یہ تو ہو گیا۔“ سارہ نے ایسے ظاہر کیا جیسے اس نے سیسی آئی کی بات سنی ہی نہیں اور کلرنگ بک اٹھا کر ایک طرف رکھ دیں ”اور اس دو کو تو میں اتنی شکلوں میں ڈھال چکی کہ اب کوئی اور شکل یاد نہیں آرہی کہ کیا بناؤں؟“

”ہاں۔۔۔ وہ جواہل ٹاور تم نے بنایا تھا۔“ سیسی آئی نے اس کی حوصلہ افزائی کی خاطر کہا اور ایسے سر ہلایا جیسے وہ سارہ کے کام سے شدید متاثر ہوں۔ ”وہ تو بھی کمال تھا۔ میں نے سنبھال کر رکھا ہے، اسے اسی بیس پر جس پر تم نے بنا کر رکھا تھا۔“

”ارے اس پر کیا آپ مجھے کوئی اپوار ڈیں گی؟“ سارہ کو سیسی آئی کی تعریف پر خوش ہوئی۔  
”نہیں۔“ سیسی آئی نے سر ہلایا۔ ”جب سعد آئے گا تو میں اسے دکھاؤں گی وہ بہت خوش ہوگا۔ اور یہ کلرنگ بکس بھی دکھائیں گے اسے۔“

”چھوڑیں۔“ سارہ نے ہاتھ بڑھا کر کلرنگ بکس سیسی آئی سے لیں ”رہنے دیں۔“  
”ہیں!“ سیسی آئی سارہ کے اس رد عمل پر ہکا بکارہ لگیں ”لیکن کیوں بھی؟“ انہوں نے سوالیہ انداز میں سارہ کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال نہیں کہ سعد کو میرے ان کاموں میں دلچسپی ہوگی۔“ سارہ نے کسی روٹھے ہوئے بچے کی سی آواز میں کہا ”آپ نے دیکھا نہیں تھا، پچھلی بار بھی اس نے کوئی خاص رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ زبردستی تعریف کرائی تھی بلکہ زبردستی ہرچیز دکھانی پڑی تھی۔“

”اوہ!“ سیسی آئی کو دل میں ایک ہلکا سا اطمینان اترا محسوس ہوا ”گویا سعد کو اس سمت کا اندازہ ہو چکا تھا جس پر سارہ کے سلسلے میں اسے چلنا تھا۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ انہوں نے انجان بننے ہوئے کہا۔ ”تمہارا کوئی بھی کام ایسا نہیں ہو سکتا جسے سعد دیکھنا اور تعریف کرنا چاہے۔“  
”ایسا ہوا ہے۔“ سارہ نے سنجیدگی سے کہا ”ہوا ہے ایسا۔“ اس نے اپنی بات دہراتے ہوئے سیسی آئی کو یوں دیکھا جیسے کہ وہی ہونا ان کو عینک سے کہہ رہی ہوں۔



”ہو سکتا ہے۔“ یہی آنٹی نے مزید بحث نہیں کی۔  
 ”لیکن کیا پتا اس کا دل چاہتا ہو کہ اب تم اس کام میں آگے مزید بہتری لاؤ۔“ انہوں نے ایک مرتبہ پھر کلرنگ  
 بک کھولتے ہوئے کہا ”اور دیکھ لو ہر صفحے کے بعد تمہاری کلرنگ میں فرق آیا ہے اور آخری صفحے تک پہنچ کر یہ  
 خاصی پیچور ہو چکی ہے۔“ انہوں نے سارہ کی طرف دیکھا ”اس کا مطلب ہے تم نے اس کی بات کو چیلنج سمجھ کر  
 اس کو قبول کیا ہے۔“

”ہوں۔“ سارہ کے دل سے ایک انجانا سا بوجھ یہی آنٹی کی یہ بات سن کر کسی قدر کم ہوا ”اب کو یاد ہے ناپلے  
 بھی جب بھی مجھے کوئی چیلنج کرتا تھا کہ نہیں سارہ خان تم یہ کام نہیں کر سکتیں تو پھر وہ کام کر کے دکھانا میرے لیے  
 جینے مرنے کا مسئلہ بن جایا کرتا تھا۔“

”ہاں!“ یہی آنٹی نے سارہ کے ساتھ ماضی کی گلیوں میں اترتے ہوئے کہا۔ ”ماہر سٹری نے جب تمہیں کہا تھا  
 کہ تم آگ لگی جیکٹ کے ساتھ ٹائر میں سے خود کو نہیں گزرا سکتیں۔“

”اور جب خان بابا نے کہا تھا شیری اچانک سرکس چھوڑ کر چلی گئی، کون ہے جو موت کے کنوئیں میں شیری کی  
 طرح موٹر سائیکل یا گاڑی چلا کر دکھائے۔“ سارہ نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی نظر کے سامنے سر اٹھا کر  
 کھڑے سر سنی پہاڑوں پر جیسے ماضی کی فلم کا فیتہ چل رہا تھا اور گزرے وقت کے نقوش ابھر اور مٹ رہے تھے۔

”اور وہ یاد ہے۔“ آپ کو۔“ اس نے کچھ یاد آنے پر بلند آواز میں کہا۔ ”جب روکنے مجھے چیلنج کیا کہ اس کی  
 سائیکل چلاتے ہوئے کیلا کھا کر دکھاؤں؟“

”ہاں بالکل یاد ہے۔“ جس کی پریکٹس کرتے ہوئے تم سائیکل سمیت بیس مرتبہ تو گری ہی ہوگی اور کتنے ہی کیلے  
 تمہارے نیچے آکر چپٹے ہوئے تھے۔“

”لیکن دسویں روز جب میں روکو کے لباس میں ملبوس ہو کر سر پر جو کرزی بیٹ سجائے ناک پر سرخ ٹینس بال  
 سجائے چہرے پر بوہواس کے جیسا بیٹ سجائے رنگ میں اتاری تھی تو نہ تو میرے پاؤں کی رفتار میں کوئی فرق آیا  
 تھا نہ ہی کیلے کھانے کی رفتار میں ایسی رکاوٹ آئی تھی کہ کسی کو شک ہو سکے یہ روکنیں کوئی اور ہے۔ پورا مجمع روکو  
 روکا شور مچا رہا تھا اور میں نے سائیکل چلاتے ہوئے بجائے تھنے ہی ایسے لوگوں سے جا کر ہاتھ ملائے تھے جو اس  
 شہر کے چند روزہ سرکس ہی میں روکو سے اتنے ناخوش ہو چکے تھے کہ اس کے پرستار بن گئے تھے۔“

”روکو تو دھر جاتا تھا پرستاروں کا ایک ہجوم اس کے پیچھے روکو روکو کے نعرے لگاتا اس کی حرکات و سکنات کا نظارہ  
 کرتا تھا۔“ یہی آنٹی نے بھی کھوئے کھوئے انداز میں یاد کیا۔

”جو کرز تو سرکس کا حصہ ہوتے ہیں مگر روکو جیسا منحرف کسی کسی سرکس میں ہی ہوتا ہوگا وہ معمول سے ہٹ  
 کر حرکتیں کرتا تھا تو Unusual بالکل معمول سے ہٹ کر ہے نا۔“ انہوں نے سارہ کی طرف دیکھا۔

”ہاں!“ سارہ نے کچھ دیر تک بہاؤ پر نظریں جمائے رکھنے کے بعد لمبا سانس لیتے ہوئے یہی آنٹی کی طرف  
 دیکھا۔ ”روکو خوش قسمت ہے یہی آنٹی! ابھی تک بلیو ہون سرکس سے جڑا ہوگا۔ ایک کے بعد ایک شہر کھو مٹا وہ تو  
 اب تک پورا پاکستان دیکھ چکا ہوگا۔“ اس کے لہجے میں ایک نا محسوس سادھ اور اداسی ابھرنے لگی تھی۔

”شہر در شہر پھر تابلو ہون سرکس اگر بھی پہاڑوں کے دامن میں سمٹے اس چھوٹے سے علاقے میں بھی آگے تو  
 کیا ہوگا سارہ؟“ یہی آنٹی اپنی عمراور تجربے کی حقیقت کو فراموش کرتے ہوئے بولیں۔

”تو کا تو کوئی سوال ہی نہیں یہی آنٹی۔“ سارہ کے لہجے میں اداسی آگئی ”بلیو ہون سرکس کی انتظامیہ کم آبادی  
 والے علاقوں کا رخ نہیں کرتی۔ آپ بھول گئیں کیا؟“

”ارے ہاں!“ یہی آنٹی نے چشمہ اتار کر اپنی نم آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

”ایک بات پوچھوں سارہ؟“ چشمہ دوبارہ آنکھوں پر لگاتے ہوئے انہوں نے سارہ کی طرف دیکھا۔  
 ”تم کو روکو سے شدید محبت تھی نا!“ انہوں نے سارہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”اور اس کو تم سے شدید محبت تھی؟“  
 انہوں نے سر ہلاتے ہوئے جیسے خود ہی اپنی بات کی تائید کی۔

”صرف خان کے ڈرے تم لوگ اس محبت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔“  
 ”آپ کو یہ خیال کیسے آیا؟“ سارہ نے سر لہجے میں سوال کیا۔

”مجھے اس وقت بھی یہ خیال آتا تھا جب ہم دونوں بلیو ہون کا حصہ تھے اور مجھے وہ راتیں بھی یاد ہیں جب تم نیند  
 میں یا پھر مسکن دواؤں کے زیر اثر سو تے ہوئے روکو کی پکارتی تھیں اور اسے پکارتے ہوئے زار زار رویا کرتی تھیں۔“

یہی آنٹی کے لہجے میں اپنی بات پر اعتماد شامل تھا ”سرکس سے متعلق تم نے بھی کسی اور کو تو نیند میں بلایا نہ جاتے  
 میں یاد کیا“ خان سے زیادہ تم کسی کے قریب رہیں اور تنہا سے زیادہ تمہاری کس سے دوستی تھی ماہر جو کہ نہیں

ٹرینگ دیتا تھا اور مس نینچا جو تمہارے بال سنواری اور میک اپ کرتی تھی۔ تم نے وہاں سے آکر بھولے کسی  
 کو یاد نہیں کیا۔ صرف روکو ہی کیوں؟ بھلا روکو ہی کیوں؟“ یہی آنٹی نے بات کے آخر میں دودھ اپنا سوال دہرایا اور

سامنے دیکھنے لگیں۔  
 ”جو محبت ہوتی ہے یہی آنٹی!“ کچھ توقف کے بعد یہی کے کانوں کو ہوا کے ساتھ سرسراقی سارہ کی آواز سنائی

دی۔  
 ”اس کی ٹانگیں اور بازو کسی حادثے کے نتیجے میں ٹوٹ نہیں جاتے، محبت کی رگوں میں دوڑنا جذبات کا خون،

انسان کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد نکلنے والے خون کی طرح بہہ کر پھر نہیں جایا کرتا۔ محبت گونگی نہیں  
 ہوتی، وہ کچھ کے بغیر بھی اپنے ہونے کا احساس دلا دیتی ہے، محبت بہری بھی نہیں ہوتی کہ محبوب کی پکار، اس کی

فریاد، اس کی آنکھوں میں اتاری اذیت کی زبان نہ سن سکے۔“ یہی آنٹی نے چونک کر سارہ کی طرف دیکھا۔  
 ”ہاں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“ سارہ نے سر ہلایا۔ ”محبت میں اتنی گرم جوشی اتنی بے ساختگی، اتنا احساس

انتہا خیال ہوتا ہے کہ اس کا زبان سے لفظوں میں اظہار نہ بھی کیا جائے تو بھی وہ دل کو اپنے احاطے میں لیے رکھتی  
 ہے، محبت کی جتنی محبوب کے دماغ میں ہر وقت جلتی رہتی ہے کیونکہ اس کی روشنی اتنی تیز ہوتی ہے کہ سورج اس

کے سامنے چراغ بن جاتا ہے۔ محبت کی ایک پکار محبت کرنے والے کے لیے کافی ہوتی ہے، جس کا چچا کرتے وہ  
 فوراً ”محبوب تک پہنچ جاتا ہے جیسے۔“ جیسے ”سارہ جوش جذبات میں بولتے بولتے اچانک رک گئی۔

”جیسے!“ یہی آنٹی نے سامنے سے برقی سورج کی شعاعوں کو اپنی آنکھوں تک آنے سے روکنے کے لیے ہاتھ کا  
 چھبانا کہا تھا پر رکھتے ہوئے اس کے نئے سے سارہ کو دیکھا۔

”جیسے سعدی کی محبت جو میری ہر پکار سن لیتی ہے، جو میری ہر رمز کو جان لیتی ہے، جو میرا ہر اشارہ سمجھ لیتی ہے۔“  
 سارہ کے الفاظ تھے یا طاقتور کرنت جو یہی آنٹی کی سماعتوں سے لگرایا تھا۔ انہوں نے بے یقینی سے سارہ کی

طرف دیکھا۔



”واہ بھی پر خرد دار! تمہیں تو ہمارے علاقے کی گلی گلی اور محلے محلے کا پتا ہے۔“ ماہ نور کے چچا سردار کو سعد  
 سلطان سے مل کر حقیقی خوشی ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں اسے دیکھنے اور ماہ نور کے اس سے تعارف کروانے پر وہ اسے  
 ان بڑھے لکھے امیر کیر کھرانوں کا وہاں لاکا سمجھتے تھے جو اکثر لوگوں سے میل ملاقاتوں کے دوران نظر آتے رہتے  
 تھے، لیکن اس لڑکے سے گفتگو کرنے کے بعد انہیں محسوس ہوا تھا کہ وہ ان عام لڑکوں سے ذرا مختلف تھا۔ اس



سے اپنے گاؤں اور ارد گرد کے علاقوں کا تذکرہ سن کر وہ چوہے گئے تھے اور یہ جان کر اور بھی حیران ہوئے تھے کہ اس کا اپنا ان علاقوں سے کوئی تعلق نہیں تھا وہ ویسے ہی ان سے واقف تھا۔  
 ”میں نے عموماً دیکھا ہے کہ آج کل کے لڑکوں کو دیہاتوں اور ان کے کچھ میں ایسی کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی۔“ انہوں نے خیال ظاہر کیا۔  
 ”لیکن مجھے ایسے علاقوں کے کلی، محلوں، چوپالوں اور دکانوں میں بہت کچھ ایسا ملتا ہے جن سے میری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔“ اس لڑکے نے کہا۔

”مجھے جب کبھی بھی ایسی جگہوں پر جانے کا موقع ملا میں بہت کچھ سیکھ کر وہاں سے آیا۔“  
 ”ہاں ایک ٹولہ آج کل کے نوجوانوں کا ایسا بھی ہے جو ثقافت، ثقافتی حسن، ہنرمندیوں، دستکاریوں کا چرچا کرنے اور ان کے ذریعے خود اپنی برو مشن کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔“ چوہدری صاحب کو یاد آیا۔ ”تم ایسے کسی ٹولے کے ممبر تو نہیں ہو؟“ انہوں نے شک کی نظر سعد پر ڈالی۔

”میں ایک فرد واحد ہوں، انکل! میرا کسی ٹولے یا گروپ سے کوئی تعلق نہیں، میرے کسی جاننے والے کو ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں اس لیے میں اکیلا ہی ان جگہوں میں گھومتا پھرتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔  
 ”یہ اپنی ماہ نور کو بھی برا شوق ہے ایسی باتوں کا۔“ تانی صابرہ جواب تک خاموش بیٹھی یہ گفتگو سن رہی تھیں زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکیں۔ ”پچھلے سال کافی دن ہمارے پاس رہی تھی اسے گاؤں پر پسند آیا تھا ہر گاؤں سے زیادہ تو اس کو باندروالے کا تماشا دیکھنے کا شوق تھا روز بچے دوڑاتی تھی۔ جاؤ جا کر دیکھ کر آؤ باندروالا آیا کہ نہیں وہ کم بخت بھی ایک دفعہ آکر کہیں غروندی ہی گیا (غائب ہی ہو گیا)۔ پھر چوہدری صاحب نے پیسے دانے دے کر خاص طور پر بلایا باندروالے کو، پھر بھلا کیا ہوا تھا۔“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا اور ادھر سے جواب نہ پا کر سعد کی طرف دیکھنے لگیں۔

”پتا نہیں وہ باندروالا کوئی اور تھا یا اس کی باندرو باندرو کوئی اور تھی۔ ماہ نور کا تو موڈ ہی نہیں ٹھیک ہوا بڑے دن، فیہا بے منگو کا میلہ بھی اسے پسند نہ آیا، غصے کے مارے اسی دن سامان باندھ کر واپس اپنے گھر۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا، تانی صابرہ کی بات سنتے ہوئے سعد کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی اس نے ماہ نور کو دیکھا جو جھل جھل ہوتے ہوئے تانی صابرہ کو گھور رہی تھی۔

”واہ بھی ماہ نور! اجابت ہوا کہ تم کوئی بات دل میں رکھنا چاہو بھی تو نہیں رکھ سکتیں۔“ اس روز ماہ نور کے گھر کافی وقت گزارنے کے بعد جب وہ واپس جانے کے لیے نکلا اس نے گھر کے گیٹ کے قریب کھڑے ہو کر ماہ نور سے کہا۔

”ہاں شاید۔“ ماہ نور نے سادگی سے اعتراف کیا۔ ”میں بوکھا ہٹ اور دباؤ میں کئی ایسی حرکتیں کر جاتی ہوں جو نہیں کرنی چاہئیں۔“

”شاید اسی لیے تم سے کہتا ہوں کہ تم بہت پیور ہو، تم میں بالکل غریب نہیں ہے اور شاید یہ ہی وجہ ہے کہ آج ہم اچھے دوست ہیں۔“ اس نے کہا۔

”دوست!“ ماہ نور کا ذہن اس ایک لفظ پر اٹک گیا۔ ”کیا یہ تعلق صرف دوستی کا ہے؟“ اس نے سوچا، وہ شاید اس سوچ کو الفاظ میں ڈھال کر سعد کے گوش گزار بھی کر دیتی جو یقیناً بعد میں اس کو اپنی جلت پسندی اور حماقت محسوس ہوتی لیکن اس سے پہلے کہ وہ یہ کام کرتی، چوکیدار کے کمرے سے کھاری نے اچانک باہر نکل کر اسے اس حماقت سے بچالیا۔

”ارے کھاری!“ وہ بے اختیار مسکرا دی۔ ”مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ تمہیں کھاری سے بھی ملنا تھا۔“ اس

نے سعد سے کہا۔  
 ”کھاری! ان سے ملو، یہ سعد سلطان ہیں۔“ اس نے کھاری کی طرف دیکھا۔ کھاری نے سعد کی طرف دیکھا اور ہاتھ ماتھے تک لے جاتے ہوئے اسے سلام کیا۔

”چھا تو تم کھاری ہو۔“ سعد نے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ کھاری نے ایک نظر سعد کے برہے ہوئے ہاتھ پر ڈالی اور دو سری ماہ نور پر اس کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ ماہ نور نے سر ہلکا سا ہلایا۔

کھاری نے سعد کے برہے ہوئے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔  
 ”کیوں بھی کھاری! باندرو لولا لنگڑا، تھپایا باندرو! اور ان دونوں میں سے کانا کون تھا بھلا؟“ سعد نے گرم جوشی سے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

کھاری نے ایک بار پھر چونک کر ماہ نور کو دیکھا۔ وہ گھبرا ہوا الگ رہا تھا۔  
 ”سعد نے بھی بندر، بندر یا کے اس جوڑے کو دیکھا ہوا ہے کھاری!“ ماہ نور نے اس کی گھبراہٹ دور کرنے کی کوشش کی۔

کھاری نے ایک نظر سعد پر ڈالی اور نظریں جھک کر بولا۔ ”صحیح طرح یاد نہیں یاؤ جی!“  
 ”چلو کوئی بات نہیں یہ بتاؤ کیسے ہو۔“ سعد کے انداز میں بے تکلفی تھی۔  
 ”ٹھیک ٹھاک۔“ کھاری نے اپنے جوتے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

”سعد بابے منگو کے میلے والے سائیں سے بھی مل چکا ہے کھاری۔“ ماہ نور نے کھاری کو مزید بوکھلانے کے لیے شرارتا کہا۔

کھاری نے ایک دفعہ پھر نظر اٹھا کر سعد کو دیکھا۔ ”مجھ آگئی نہ نور بی!“ اس نے نیچی آواز میں جواب دیا۔  
 کھاری کی یہ بات ماہ نور نے بے دھیانی سے سنی اور سعد نے سننے کے بعد کھاری کو غور سے دیکھا۔

”ٹھیک ہے ماہ نور! پھر ملیں گے اب میں چلتا ہوں۔“ اگلے لمحے وہ ماہ نور سے مخاطب ہوا۔  
 ”چھا بھی کھاری!“ اس نے کھاری کا پاؤں تھپتھپایا۔ ”تم سے مل کر اچھا لگا۔ تمہارے علاقے میں پھر آتا ہوا تو تم سے ملاقات ہوگی۔“

”ارے ہاں کھاری۔“ ماہ نور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”سردار چاچا جانے سعد کو فارم ہاؤس پر انوائٹ کیا ہے۔ سعد کو گاؤں کے لوگوں پر کچھ رنج ہے، تا تو سردار چاچا نے کہا ہے وہ فارم ہاؤس کا مہمان بن کر جب تک چاہے ان کے پاس رہے۔ اب جب سعد وہاں جائے گا تو پتا چلے گا تم کتنے اچھے میزبان ہو۔“ وہ خوش ہو کر بتا رہی تھی۔  
 ماہ نور کی توقع کے خلاف کھاری نے اپنی جوتوں میں آکر بے تحاشا بولنے کے بجائے سر ہلا کر سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے جی!“

ماہ نور نے ایک مسکراتی نظر کھاری پر ڈالی اور پھر سعد کو دیکھ کر شائے اچکا دیے۔

”Perhaps he is a bit down today“ (شاید آج اس کا موڈ اچھا نہیں ہے) اس نے کہا۔  
 ”کوئی بات نہیں۔“ سعد نے سر ہلایا اور ہاتھ ہلا کر گیٹ سے باہر کھڑی اپنی گاڑی کی طرف مڑ گیا۔

”کیا بات ہے کھاری! ٹھیک تو ہو تم۔“ سعد کے جانے کے بعد ماہ نور نے کھاری کی طرف دیکھا۔  
 ”سناں ان باؤ صاب سے کہنا تھا نہ نور بی! ان سے پچھنا (پوچھنا) تھا انہماں کو سائیں جی کا گیت آؤندا کہ نہیں (ان کو سائیں جی کا گیت آتا ہے کہ نہیں)۔“ کھاری نے اچانک کہا۔  
 ”پتا نہیں۔“ ماہ نور کھاری کی اس بات پر بوکھا کر بولی۔  
 ”پچھنا (پوچھنا) تھا ناں جی، آؤندا (آتا) ہو گا ضرور۔“ کھاری نے کہا اور اپنے کندھے پر رکھی چادر جھاڑ کر اسے





سعدیہ پر چھائی گہری خاموشی اور اپنی بات کے جواب میں کسی خاص رد عمل کے نہ آنے پر تیار البعہ کو دل ہی دل میں تشویش تھی۔ سعدیہ نے اپنے بائی دو پرچے سکون سے دیے تھے اور پرچوں کے بعد دوبارہ اسکول جانے سے پہلے ایک ہفتے کی چھٹیاں دی گئی تھیں۔ پرچوں سے فارغ ہونے کے بعد سعدیہ نے گھر کے کل دو کمروں، جن میں سے ایک میں وہ لوگ سوتے بیٹھتے تھے اور دوسرے میں ضرورت کا سامان رکھا تھا کی تفصیلی صفائی کی تھی۔ جھاڑ پونچھ فالتو چیزوں کو نکال باہر کرنے اور فرشوں کی دھلائی کا کام دونوں میں مکمل ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے چھوٹے سے چھپر کے نیچے اینٹوں کی دیواروں سے بنے اس تھمے سے باورچی خانے کی راہ لی تھی جو بارش اور تیز دھوپ کی تیش کے دنوں میں کھانا پکانے کے کام آتا تھا، ورنہ تو سارا سال صحن میں گڑے مٹی کے چولہے پر ہی کھانا بنایا جاتا تھا۔

”جو ٹوٹا ہوا سامان اور کاٹھ کباڑ میں نے سیڑھیوں کے نیچے جمع کیا ہے اسے بری مرکز والے کیا خانے میں بیچ کر پیسے بچھ لادو۔“ تیار البعہ نے سنا سعدیہ مسجد میں حفظ کے لیے آنے والے حفظ سے کہہ رہی تھی۔ ”جو تھیں الگ کر کے رکھنی تھیں نا سعدیہ بائی!“ حفظ جواب میں سیڑھیوں کے نیچے جھکا سامان کا جائزہ لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”بس جو ہے لے جاؤ اور جتنے پیسے ملیں۔ ایمان داری سے لا کر کر دینا، کھامت لینا۔“ سعدیہ اسے تاکید کر رہی تھی۔

”اور ہاں ناکوں کے برتن بیچنے والا آئے تو مجھے بتانا۔“ کاٹھ کباڑ لے کر جاتے ہوئے حفظ کو اس نے پیچھے سے پکار کر کہا تھا۔

”بڑھ کدھ وار آتا ہے وہ۔“ حفظ نے گردن موڑ کر جواب دیا تھا۔

”پھر بھاگ کے جاؤ اور یہ چیزیں بیچ کر آؤ“ ان بڑھ ہے۔“ سعدیہ نے تیزی سے کہا اور صحن کی طرف مڑی۔

”کیا کرنے ہیں پیسے“ اور کیوں بلارہی ہو پھیری والے کو؟“ اس کے سامنے تیار البعہ کھڑی تھیں۔

”جو مسالے چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں پڑے ادھر ادھر رتے رہتے ہیں، انہیں محفوظ کر کے رکھنے کے لیے دو تین ڈبے خریدنے ہیں اور بس۔“ سعدیہ نے نرمی سے جواب دیا تھا۔ ”ان چیزوں سے دو تین ڈبے خریدنے کے پیسے مل جائیں بڑی بات ہے۔“ وہ تھمے سے باورچی خانے میں گھس کر بولی۔

”ابھی تک ایسے چل رہا ہے نا!“ تیار البعہ اس کے پیچھے آئیں۔

”ہر بات پر اعتراض نہ کیا کریں اماں!“ سعدیہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ”میرے دل میں مزید سوال اٹھنے لگیں گے۔ یہ۔“ اس نے نمک مرچ اور ہلدی کی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں یوں رکھے دیکھ کر خیال آتا ہے یقیناً ہمارا تعلق خانہ بدوشوں کے خاندان سے ہے جو مستقل ٹھکانے بنا کر رہتے ہیں نہ مستقل گھرواری کا سامان اپنے پاس رکھتے ہیں بدسلیقگی اور بھوہرین کا پورا اشتہار ہے یہ باورچی خانہ۔“

تیار البعہ کو لگا جیسے کسی نے ان کے چہرے پر سامنے سے ہونسا مارا ہو۔

”توکل اور غناء، سادگی اور فقر کی بات کے ہاتھ آجائے وہ دنیا کی پریشانیوں اور غموں سے بے نیاز ہو جاتا ہے اسے شکر کی اور صبر کی دولت عطا ہو جاتی ہے۔ وہ سامان کے۔۔۔ بھتیجیوں سے آزار دیتا ہے اسے سامان آخرت کی فکر آکھرتی ہے اور وہ اس کے اسباب ڈھونڈنے لگتا ہے۔“ انہیں کسی کی آواز سنائی دی۔

”توکل اور غناء، سادگی اور فقر۔“ انہوں نے دل میں دہرایا۔

”بدسلیقگی اور بھوہرین۔“ انہوں نے الفاظ کا تجزیہ کیا۔

”دینا اور آخرت۔“ وہ اپنے نہ پائے، فکر اور بے فکری ہوئے اور نہ ہونے کی کشش میں پڑنے لگیں۔

”آپ کے پاس میرے کسی سوال کا جواب نہیں ہے اماں!“ سعدیہ نے ان کے چہرے پر چھائے اضطراب کو دیکھا اور طنز پر انداز میں بولی۔ ”بہتر ہے کہ مجھے وہ کرنے دیں جو میں چاہتی ہوں، ورنہ میرے سوالوں اور ان کے اب میں آپ کی خاموشی یا پھر ماریٹ کا سلسلہ دراز ہو جائے گا۔“

تیار البعہ سعدیہ کی بات کے جواب میں خاموش رہیں اور اسی خاموشی کے ساتھ باورچی خانے سے نکل کر صحن میں آگئیں۔ صحن میں دھوپ نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ انہوں نے مٹی سے لیے تھے صاف ستھرے صحن کو دیکھا اور بے بسی سے دائیں بائیں سر گھمایا۔ کیا اس خالی صحن میں کہیں کوئی ایسی قیمتی دستیاب تھی جس کے ذریعے وہ سعدیہ کے نئے نئے نکتے پر قیچ کر سکتیں۔ اسی دم ان کے دروازے پر دستک ہوئی اور اس دستک نے جیسے اپنا ہاتھ بڑھا کر وہ قیمتی ان کے ہاتھ میں پکڑادی تھی۔



”غضب خدا کا، شاہ مسجد کے ساتھ والی پرچوں کی دکان میں جوا کھیلنا جاتا ہے۔“

”کون سی دکان؟“

”اے وہی تنگ تاریک پرچوں کی دکان، جس میں دن کے وقت بھی کالی رات جیسا اندھرا چھایا رہتا ہے۔ سودا لینے جاؤ تو دکان والا لالین ہاتھ میں پکڑ کر یوں میں جھانک جھانک کر سودا نکالتا ہے اور تو لے کر وقت لالین کا بک کے ہاتھ میں تمھارا ہے، لوجی ذرا اونچی کر کے پکڑنا میں ذرا سودا تولوں۔“

”تو ایسی اندھیری دکان میں جوا کھیلنے والوں کی آنکھیں نہیں جاتیں یا وہ پہلے ہی آنکھوں سے پٹ ہیں۔“

”جواری تو بصارت کی دولت سے مالا مال بھی اندھوں موافق ہوتا ہے۔“

”واہ ابھی۔ تمہیں پتہ کی یہ بات کس نے بتائی؟“

”تم ہمیشہ ایسی باتوں پر مجھے شرمندہ کرتی ہو۔ کیا دین اسلام کی باتیں ضرور میں کسی سے سیکھنے ہی جاؤں تو مجھے پتا چلے گا، پیدا کنی مسلمان ہوں میں، گاؤں کے مراقیوں کے سرچ گامے میرا لی نے اذان دی تھی میرے کان میں۔“

”واہ ابھی یقیناً“ خاصا سر پلا ہو گا گامیہ لائی!“

”میرا لی سارے سر لیے ہوتے ہیں وہ تو بھانڈے ہوتے ہیں جو بیٹھے گلوں اور بے سُر آواز میں گاتے ہیں۔“

”چھابی، مجھے تو علم نہیں تھا کہ بھانڈا اور میرا لی دو الگ الگ Species (اقسام) ہیں۔“

”توبہ توبہ بھانڈا تو مسخر ہوتا ہے نقلی جھوٹی تعریفیں کرنے والا بھانڈا ڈونٹا ہے لوگ کہتے ہیں گاتا ہے۔“

”کانوں کو ہاتھ ایسے لگا رہی ہو جیسے کوئی گناہ کی بات کہہ دی میں نے۔“

”کانوں کو ہاتھ نہ لگاؤں تو اور کیا کروں میرا لی کی شان میں گستاخی کروی تم نے۔“

”ہیں واقعی؟“

”ہاں تو اور کیا، میرا لی کی توشان یہ ہے کہ بڑے بڑے عزت دار اس کے پاس اپنے شجرے رکھواتے ہیں۔“

”جب ہی تو وہ میرا لی جب کسی کی عزت اتارنے پر آتا ہے تو اس کے آباؤ اجداد کی شان میں ایسے ایسے امیدے پڑھتا ہے کہ سننے والے کو جگہ نہیں ملتی سر جھپانے کو۔“



”بس تو پھر سمجھ لو میراثی کی شان کیا ہے اس کی زبان کھل جانے کے ڈر سے بڑے بڑے اس کے سامنے اپنی دستار جھکا دیے ہیں۔“

”چھا تو پھر اگر بھانڈی لوگوں کی جھوٹی تعریفیں کرتا ہے تو تم میراثی ہو کر کیوں ایسا کرتی ہو۔“

”میں نے کب کسی کی جھوٹی تعریف کی؟“

”روز کرتی ہو اس روز اسلام آباد والے کو کیا کہہ رہی تھیں۔“

”کیا کہہ رہی تھی؟“

”کہہ لی جی جی اور کالی پتلون میں وہ وحید مراد لگ رہا تھا۔“

”کیا تمہیں لگ رہا تھا، گلے میں سرخ ڈبی دار مفلح والے سالگرہ والا وحید مراد لگ رہا تھا کہ نہیں لگ رہا تھا؟“

”توبہ، مبالغہ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔“

”اور اس سیٹھ حسین ہوٹل والے کو کتنی ہو صدقے جاؤں آپ کی قسمت کے واری جاؤں آپ کے بھاکوں کے جو رشتہ آتا ہے چوہدری کے ساتھ تو دونوں کو شانوں والی جوڑی اور موتیوں والی سرکار کے لقب کون دیتا ہے؟“

”آئے ہائے پھر یہ تو کہنا ہی پڑتا ہے ایسی تعریفوں سے ذرا خمیر لگ جاتا ہے ان لوگوں کو عجیب بلکی کرتے ہوئے بھار نہیں محسوس کرتے۔“

”مجھے تو لگتا ہے کہ اگر واقعی بھانڈا اور میراثی الگ الگ species ہیں تو پھر تم دونوں کی مکسڈ بریڈ سے تعلق رکھتی ہو۔“

”چھا چلو جو بھی ہوں انسان تو سمجھتی ہوں مجھے۔“

”ہا ہا، مکسڈ بریڈ، سمجھ میں آئی نہیں بات انسان ہونے کا پوچھنے لگیں۔“

”مکسڈ تو جب تم بڑھے لکھوں والی باتوں پر اتر آتی ہو تو میرا دل چاہتا ہے میں اپنے کانوں کے بن بند کر دوں۔“

”اور تمہارے ساتھ رہ کر مجھے بھی کبھی ایسے لگتا ہے مجھ میں بھی لوگوں کی جھوٹی تعریفیں کرنے کے جراثیم منتقل ہوتے جا رہے ہیں۔“

”چلو اچھی بات ہے کامیاب انسان میں ان جراثیم کا ہونا بہت ضروری ہے ویسے ایک بات ہے۔“

”کیا۔“

”اسلام آباد والے کے ذکر پر تمہارے چہرے پر پھلجھڑیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ ہیں نا؟“

”چلو چلو گواس نہ کرو اس میں کون سی ایسی خاص بات ہے جو میرا چہرہ اس کے نام پر گل تار ہوگا۔“

”وہ عاشق خاص ہے تمہارا، کالی بھی، بیرو وحید مراد، وہی تو ہے جو دل سے تمہاری قدر کرتا ہے اور تمہارے چھوٹے چھوٹے معاملات کے متعلق بھی فکر مند رہتا ہے۔“

”جی نہیں۔“

”تمہیں نہیں پتا میری مڑوالی شہزادی تو کسے پتا ہے کہ جب مٹر کی چیمیں محسوس ہونے پر نیند نہیں آتی۔“

”خوابوں کی پٹھیاں کون جھلاتا ہے تمہیں۔“

”چھا چلو زیادہ باتیں نہ بناؤ، اندھیری پر چون کی دکان میں جوئے کا قندہ بناؤ۔“

”قائم آئے والی ہے مجھے لگتا ہے، اوپر مسجد کے سنہری مینار سر اٹھائے کھڑے ہیں، سبز گنبد دور سے اپنی چھب دکھاتا ہے، جس کے اسپیکر سے پانچ بار اللہ کے پیاروں کو نماز کے لیے جمع ہوجانے کا بلاوا ملتا ہے اور پچھلے اندھیری دکان میں خدا کی مار پڑے، پھٹکارے جو اٹھتے ہیں۔ سنا ہے سینکڑوں کانہیں ہزاروں کاجوا کھیلایا جاتا

ہے روز وہاں۔ اور ان جواہروں کو پولیس سے کون بچا ہے بھلا۔“

”طیغالاڑ اور کون۔“

”وہ جو بانو کے گھر مینے کا راشن بچتا ہے؟“

”ہاں وہی ہے جو پرچون کی دکان پر پھلپہ پڑنے دیتا ہے نہ تالاب والی گلی میں شراب کی بھٹی بند ہونے دیتا ہے۔“

”وہی ہے نا جو ہمارے گھر سے ہر رات کو اشقی سازو آواز کی صدا پر ناک بھوں پڑھانے والے محلے داروں کو چوں بھی نہیں کرنے دیتا؟“

”ہاں وہی۔“

”اب آواز کیوں پست ہو گئی تمہاری؟ یاد آیا کہ نہیں ہمارے رزق روٹی کے ویسے کو سایہ دینے والا بھی طیغالاڑ ہی ہے۔“

”میں بھولی نہیں کبھی، مگر اس گھر میں میں تم، طیغالاڑ کیا سارا محلہ جانتا ہے، قمار باز اور زانی شرابی نہیں اچھی آواز کے شوقین آتے ہیں یہاں لچوں لفتنوں کی نہیں غزل اور گیت کے شائقوں کی محفل جمتی ہے، شعر سنائے جاتے ہیں اور ادب و تاریخ پر بحث ہوتی ہے یہ کسی رند کی کاڈیرا نہیں، سروں کی ملکہ کاٹھکانہ ہے اسی لیے طیغالاڑ اس طرف کسی کو آنکھ اٹھانے نہیں دیتا۔“

”دل کو بھلانے کے لیے ہر کوئی اپنے لیے دلیلیں ڈھونڈ لیتا ہے میری عزیزا جان سہیلی! یہ طوائف کاڈیرا ہے بائسکری محفل کاٹھکانہ، دونوں برابر ہیں۔“

”گنہگار تو ہونے ہیں، ہوتے ہی رہتے ہیں، ایلین نے یونہی تو اللہ سے مہلت نہیں مانگی تھی پر مسجد کے نیچے جوا، یہ تو بہت بڑی بات ہے نا۔“

”مسجد کے زیر سایہ خرابات کا منظر ہے۔“

”کس کا منظر ہے؟“

”رہنے دو تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔“

”چلو نہ بناؤ۔ میں اسلام آباد والے سے پوچھ لوں گی کہ مسجد کے زیر سایہ کون سا منظر ہوتا ہے۔“

”وہ بے چارہ دو جمع دوچار کرنے والا، تمہیں ان شاعرانہ تعلیوں کا مطلب کیا سمجھائے گا۔“

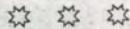
”کیوں نہیں سمجھائے گا؟ وہی تو ہے جو تم سے میر درد، ناخ اور آتش کی غزلوں کی فرمائش کرتا ہے باقی لکیر کے فقیروں کی طوطی تو غالب سے شروع ہو کر غالب پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ غالب نہ ہوا غالب! ہو گیا جو سب سے اچھی شاعری کرتا تھا۔“

”واہ دیکھ لو، تمہیں پڑھوں لکھوں کی محفل، میں بیٹھ کر کسی ٹھکانے کی گفتگو کرنی آگئی۔“

”پھر بھی میراثی ہونے کا طعنہ دینے سے باز نہیں آئیں۔“

”میراثی کی تو شان ہی اور ہے، بڑے بڑوں کے تجروں کی امین میراثی۔“

”ہا ہا۔“



”آپ کی دوست فلورا ظہور سے ملاقات کے بعد آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا مجھے، کیونکہ ماہ نور نے بتایا تھا وہ



فلزا ظہور کو آپ کے توسط سے جانتی ہے۔“  
 ”یہ سمجھا ہو گا کہ آپ بھی فلزا ظہور کی طرح انتہائی مرموم بے زار اور کھڑوس خواتین ہوں گی۔“ ماہ نور نے  
 مسکراتے ہوئے کہا۔ ”دیگھاتم نے فاطمہ اور خدیجہ خالہ کتنی سوئٹ ہیں۔“  
 ”ہاں یہ تو ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”وہ بے چاری بھی ایسی تو نہیں ہوا کرتی تھی جیسی تم لوگ بتا رہے ہو۔“ خدیجہ نے افسوس سے سر ہلاتے  
 ہوئے کہا۔ ”نبانے اتنے سالوں میں اس پر کیا نلری بے چاری جو وہ ایسی ہو گئی۔“  
 ”وہ کیا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں؟“ سعد نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے، کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ  
 ماں باپ کی اکلوتی اولاد ان کے بعد کسی بھائی، بہن کے نہ ہونے کی وجہ سے خاندانی تعلقات کی عدم موجودگی میں  
 تنہائی کا شکار ہو جاتی ہے۔“

”ارے اس کا تو خاصا بھرا خاندان تھا۔ اس کا باپ جی سی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر تھا، دادا اپنی سن میں  
 بڑھا تھا، ایک چچا کیمبرج سے گریجویشن کر کے آیا تھا اور اس کا نانپا کستانی سفارت کار تھا اس کے خاندان کی اعلیٰ  
 تلسیں تو یہاں وہاں ہر جگہ کے۔ اہم عہدوں پر کام کر رہی ہوں گی، وہ تنہا کیسے ہو سکتی ہے۔“ فاطمہ نے کہا۔  
 ”لیکن شاید تمہیں یاد نہیں فاطمہ! فلزا کے اکلوتے بھائی اکبر نے خود کشی کر لی تھی زمانہ طالب علمی میں ہی۔“  
 ”وہ اسٹوڈنٹ لیڈر تھا اس پر نجانے کہاں کہاں سے دباؤ پڑا، کس کس بات کے لیے اس کی خود کشی کا ایک پس  
 منظر تھا۔ فلزا کی تنہائی کا کوئی پس منظر نہیں بنتا۔“

”ہر خاتون آپ کی طرح نہیں ہوتی فاطمہ، خدیجہ خالہ! اکثر خواتین شادی نہ ہونے کو ایک مس ہیمپ  
 (سانجھ) سمجھنے لگتی ہیں اور بھری عمر اسی محرومی کے شیڈوز (سایوں) تلے گزار دیتی ہیں، کڑھتی، جلتی، بھنکتی۔“ ماہ نور  
 نے خیال ظاہر کیا اور جھرجھری ل۔ ”اف جیسے وہ فلزا ظہور تھیں، میرے اللہ مجھے ایسے لگ رہا تھا، میں منکر نکیر کے  
 سوالوں کے جواب دے رہی تھی جب میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔“

”اگر ماہ نور کی یہ منطق مان لی جائے تو کیا یہ حقیقت ہے کہ فلزا ظہور نے شادی نہیں کی تھی؟“ یہ سوال پوچھتے  
 ہوئے نبانے کیوں سعد کو اپنا دل معمول سے زیادہ تیز رفتار سے دھڑکنے لگا محسوس ہو رہا تھا۔  
 ”آخری خبریں جو اس کے بارے میں ہم تک پہنچی تھیں ان کے مطابق تو نہیں کی تھی۔“ خدیجہ نے یاد کرتے  
 ہوئے کہا۔

”یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے۔“ سعد کے لہجے میں عجیب سا اضطراب تھا۔  
 ”غالباً!“ خدیجہ نے گردن پیچھے کر کے نگاہیں چھت سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”آج سے بیس ایکس سال پہلے  
 کی۔“

”اوہ!“ سعد نے جیسے خود سے کوئی بات کی۔ ”ہو سکتا ہے کوئی خفیہ شادی کر رکھی ہو۔“  
 ”خفیہ کیوں کرنی تھی اس نے اس کا خاندان بڑھا لکھا اور روشن خیال تھا اس نے کس سے اپنی شادی چھپانی  
 تھی۔“ خدیجہ نے سعد کے خیال کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

”سن اٹھا میں یہ وہ لندن چلی گئی تھی اور یہی اس کے بارے میں آخری اطلاع ملی تھی۔“ فاطمہ نے یاد کرتے  
 ہوئے کہا۔ ”کئی سال بعد میں نے ایک میگزین میں فن مصوری کے بارے میں ایک مضمون میں اس کا سرسری  
 تذکرہ بڑھا جس میں اس کا تعلق اسلام آباد سے ظاہر کیا گیا تھا جب ہی تو ماہ نور سے میں نے کہا کہ پتا کرنا بھلا وہ  
 اسلام آباد میں ہی رہتی ہے کہ واپس چلی گئی۔“

”ہوں۔“ سعد فلزا ظہور سے متعلق خدیجہ اور فاطمہ کی ایک ایک بات غور سے سن رہا تھا۔ ”وہ قلندرانہ



مزان رسی ہیں عابا۔ اس نے پچھ سوچے ہوئے کہا۔ "ان کا ہم بہت اعلیٰ ہے مگر میں بہت میں کوئی اور نہیں اسی لیے جب ماہ نور کے کہنے پر میں نے ان کا پتہ لگانے کی کوشش کی تو یہ جان کر حیرت ہوئی آرٹ کے بڑے قدر دانوں کو بھی ان کے بارے میں علم نہیں تھا یاد ہے ماہ نور۔"

اس نے تائید حاصل کرنے کے لیے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ ماہ نور کے چہرے پر بے زاری اور ناگواری کا تھا۔

"وہ یہ تو اس موضوع سے چڑنے لگی۔" اسے خیال گزرا۔

"یہ مومنز آپ نے خوبیک کیے ہیں کیا؟" ماہ نور کی خاطر فوراً "موضوع بدلنے ہوئے اس خدیجہ سے پوچھا۔

"ہاں! وہ مسکرائیں۔ "کیسے لگے تمہیں؟"

"بہت اچھے ہیں۔" وہ خدیجہ کے شنگ روم میں چار طرف نظر ڈالنے لگا۔

"مجھے فلزا کے بارے میں جان کر دکھ ہو رہا ہے! فاطمہ جو کچھ وہ کہنے کے لیے اٹھ کر کمرے سے باہر گئی تھیں واپس آتے ہوئے بولیں۔ "وقت کیسے کیسے نقوش چھوڑ جاتا ہے انسانوں کے چروں اور حالات پر۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ایک پرانا البم کھولتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے کالج کے دنوں کا یہ البم ڈھونڈ کر صرف تم بچوں کو دکھانے کے لیے لائی ہوں کہ اس وقت کی فلزا کو دیکھو اور جانو کہ وقت کتنا بڑا قاتل ہے۔"

سعد اور ماہ نور اپنی نشستوں پر آگے ہٹتے ہوئے اس میز پر جھک گئے جس پر فاطمہ نے البم رکھا تھا۔ البم کے شروع کے صفحات پر ٹرانسپیرنٹ کاغذ کے نیچے خدیجہ اور فاطمہ کی جوانی کی تصویریں چپکی تھیں۔

"اف خدیجہ! فاطمہ خالہ! آپ لوگ تو بچی کو سنز تھیں۔" ماہ نور نے مسرت چہلکاتے لہجے میں تبصرہ کیا۔ "اف فاطمہ خالہ! آپ میک اپ میں تھی اسٹائلنگ رہی ہیں۔" اس نے ایک تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "رب یہ اس زمانے کے ہائی فیشن خدیجہ خالہ آپ بھی جینز شرٹس پہنا کرتی تھیں کیا؟"

وہ ایک ایک تصویر پر تبصرہ کر رہی تھی۔

"یہ آپ کے بھائی ہیں نا بالکل آپ سے شکل مل رہی ہے یہ آپ کی امی یہ ابو دیکھیں میں نے سب کو پہچان لیا۔"

سعد کو ماہ نور کی تبصرے اور سوال کرتی آواز اچھی لگ رہی تھی مگر اسے فلزا ظہور کی جوانی کی تصویر دیکھنے کی جلدی تھی۔ ماہ نور کے ایک ایک تصویر کو دیکھ کر ایسا ایٹھ ہونے اور رک رک کر تبصرے کرنے پر اسے کوفت بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"یہ دیکھو یہاں پچانو فلزا کو؟" وہ صفحہ اگیا جس پر خدیجہ اور فاطمہ کی کالج یونیفارم میں مختلف تصویریں چپکی تھیں۔ سیلیوں کے ساتھ 'اکیے اور ایک دو تصویریں کلاس میٹس اور نیچرز کے ساتھ گروپ کی شکل میں بھی تھیں۔ ماہ نور اور سعد کی تجسس بھری نظریں ایک ایک تصویر پر تیزی سے پھرتے لگیں۔

"یہ۔" ماہ نور نے ایک تصویر پر انگلی رکھی فاطمہ نے انکار میں سر ہلایا۔

ماہ نور نے ایک دو مزید تصویروں کی طرف اشارہ کیا مگر فاطمہ نفی میں سر ہلاتی رہیں۔

"یہ ہیں فلزا ظہور۔" سعد نے ایک تصویر پر انگلی رکھی جس میں فاطمہ اور خدیجہ دو لڑکیوں کے گلوں میں بائیں ڈالے کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

"ایگزیکٹو (بالکل)۔" فاطمہ نے بے ساختہ کہا اور سعد کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ سعد نے مسکراتے ہوئے ماہ نور کو دیکھا وہ اسے جتنا چاہ رہا تھا کہ اس نے فلزا کو پہچان لیا تھا مگر ماہ نور کو برا سامنا نہ بناتے دیکھ کر اس نے

چہرے پر پچھلی مسکراہٹ کو سمیٹ لیا۔

"یہ بڑی یادگار تصویر ہے! فاطمہ اس تصویر کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔" اس میں 'میں خدیجہ فلزا اور شہناز ہیں ہم لوگ۔' جناب یونیورسٹی کابین الکیا کی تقریری مقابلہ ایٹھڈ کرنے گئے تھے شہناز کثیر ڈیڑھ پڑھتی تھی اور ہم اہل سی ہیں۔"

"شہناز کون فاطمہ خالہ؟" ماہ نور نے میز سے چائے کے برتن سمیٹ کر رُڑے میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ہماری کزن تھی شہناز۔" فاطمہ سے البم لے کر وہ تصویر دیکھتے ہوئے خدیجہ نے کہا۔ "بہت ذہین اور محنتی لڑکی تھی اللہ نے اسے حسن کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سی خوبئیں سے نواز رکھا تھا۔"

"اب کہاں رہتی ہیں وہ؟" ماہ نور نے اٹھا کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"اب شاید وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔" خدیجہ کے لہجے میں تاسف اتر آیا۔

"شاید۔" ماہ نور اور سعد بیک وقت بولے۔

"ہاں! خدیجہ نے مگر اس سانس لیتے ہوئے البم بند کیا۔ "سنا تھا شہناز کے شوہر نے اسے قتل کر دیا تھا۔"

"وہ۔" اب کے بھی ماہ نور اور سعد کی آواز کمرے میں ایک ہی وقت میں گونجی۔

"آپ نے سنا تھا۔" ماہ نور نے واپس ٹیبل پر رکھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ "مطلب آپ کو خود کو نہیں پتا۔"

"شہناز کی آواز بڑی اچھی تھی۔" خدیجہ نے بچانا شروع کیا۔ "وہ جسے کہتے ہیں نا کوالٹی وائس۔"

وہ اسکول کے زمانے میں گلوکاری اور نعت خوانی کے مقابلوں میں حصہ لیا کرتی تھی پھر وہ اپنے والدین کے ساتھ انگلینڈ چلی گئی اس کے والد ہمارے ماموں تھے۔ ایک بار چھٹیوں میں وہ لوگ پاکستان آئے ہمارے ایک کزن کی شادی تھی وہاں شہناز نے یونمی رشتہ داروں کی محفل میں دو تین اس وقت کے مشہور نغمے سنائے معلوم نہیں تھا کہ رشتہ داروں کی اس محفل میں بیٹھا ہماری رشتہ کی ایک خالہ کا بیورو ریڈ پور کام کر رہا تھا۔ اس نے جو شہناز کی آواز سنی تو بس نچانے کہاں اور کب اس کی جان کو ہی چٹ گیا۔ ہم میں سے کسی کو کالوں کا ان بھی خبر نہ ہوئی اور وہ شہناز کو سبزاغ کھاکر ریڈیو اسٹیشن لے گیا آؤیشن کے لیے۔ شہناز بی بی نے آؤیشن دیا اور پاس ہوئی اور اپنے ابا سے خد کرنے لگی کہ اسے یہیں پاکستان میں رہ کر پڑھنا ہے۔ ابا سمجھے غالباً "بچی کو لندن کے نامعقول ماحول سے چڑھ گئی تھی سو یہاں داخلہ کروا کر اسے ہمارے دوسرے ماموں کے پاس چھوڑ گئے۔"

شہناز اور وہ ریڈیو پور ریڈیو صاحب شہناز کا کیسٹ مارکیٹ میں لانے کی تیاریوں میں جٹ گئے اعتبار اور اعتماد کا زمانہ تھا چھوٹے ماموں کی ٹیبلٹی نے توجہ ہی نہیں کی کہ لڑکی کالج جاتی بھی تھی یا نہیں دیر سے گھر لوٹی تھی تو ایسا کیوں تھا سب اپنی زندگیوں میں مگن تھے مگر سب کی زندگیوں میں بے چینی کا پناخ تو اس وقت پھوٹا جب شہناز کے گیت ریڈیو پر چلے پھر اس کا کیسٹ مارکیٹ میں آیا اور پھر جناب عالی شہناز بی بی ریڈیو سے اٹھ کر ایک دن بی بی سکریں پر جلوہ گر ہو گئیں۔ یہ خبر بی بی بی میں ادھر سے اٹھی اور لندن پہنچ گئی۔ بس جناب پھر کیا تھا شہناز کے والد صوم و صلوة کے پابند شرع کے عاشق غصے میں آگ بولے۔ اگر چھوٹے ماموں اور شہناز کے سر پر وہ برسے وہ برسے کہ الاماں۔ ادھر شہناز پر شہرت اور کامیابی کے بھوت نے اپنے نیچے گاڑ دیے تھے اس نے باپ کی اس حکیمانہ پر کہ ان اغویات سے فوراً چھٹکارا حاصل کر لے صاف انکار کر دیا۔ خوب مار مار کر ہچھتاہچھی ہوئی مگر نہ شہناز اپنے موقف سے ہٹی نہ والد صاحب میں چلک آئی۔ خدیجہ سانس لینے کو نہیں۔

"ہمارے خاندان کے لیے یہ ناقابل قبول صورت حال تھی۔" خدیجہ کے رکنے پر فاطمہ نے قصہ کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "زمانہ بدل رہا تھا مگر ہمارے یہاں شخصی آزادی کی حد کی ایک واضح لکیر جو نجانے کب کھینچ دی گئی تھی اسے مٹانے کا کوئی تصور تک کرنے کو تیار نہیں تھا۔" فاطمہ نے بات سناتے سناتے سعد پر نظر



والی۔ انہیں اس کے چہرے پر تجسس اور محویت نظر آئی۔  
 ”لڑکا قہقہے اور داستانیں سننے کا شوقین لگتا ہے۔“ انہوں نے دل میں سوچا۔  
 ”پھر کیا ہوا؟“ کمرے میں ماہ نور کی آواز گونجی۔

”پھر ایسا ہوا کہ شہناز کے والد نے اس سے لاطعلق کا اعلان کرتے ہوئے اسے اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے عاق کر دینے کی دھمکی دے دی۔“

”ماہ نور نے بے ساختہ کہا۔

”میکشن بھی تو ایک شرمیم تھا نا۔“ سعد نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور خدیجہ کی طرف دیکھا وہ آگے کیلئے سارے والی تھیں۔

”شہناز پر ان دھمکیوں اور اعلانوں کا مطلق اثر نہیں ہوا، اس کی جوانی اور بغاوت اسے جون پر تھی۔ خاندان کے بزرگوں، نوجوانوں، بچوں تک نے اسے ہر ممکن سمجھانے کی کوشش کی مگر اسے شاید سمجھنا ہی نہیں تھا۔ اس نے ماموں یعنی اپنے والد سے کہا کہ وہ اس سے کیا لاطعلق اختیار کریں گے، وہ خود ہی ایسے والدین کی اولاد کہلاتا نہیں چاہتی جو اولاد کو اپنی مرضی سے جینے کی آزادی دینے کو تیار نہیں۔ ماموں نے شہناز سے لاطعلق اختیار کرتے ہوئے اسے عاق کر دیا اور خود واپس چلے گئے۔ جاتے جاتے سارے خاندان کو یہ دھمکی بھی دے گئے کہ جس کی نے شہناز سے کوئی تعلق رکھا، اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ اس دھمکی کو خاندان بھر نے اس طرح حل کیا کہ جیسے شہناز سے تعلق رکھنے والا ملعون قرار دے دیا جائے گا۔“ خدیجہ نے کہا۔

”پھر ہی ہوئی شہناز نے چھوٹے ماموں کے گھر سے سامان اٹھایا اور لائڈ جانے کہاں گئی کہ اس کے بعد کبھی کہیں نظر نہیں آئی۔ ایک بار ایک موسیقی کی محفل میں ایک عزیز کو ملی اور اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ پھر بہت عرصے بعد کہیں سے اڑتی اڑتی خبر آئی کہ شہناز نے کسی امیر شخص سے شادی کر لی تھی جس نے کسی وجہ سے اس کا کاٹ کر اسے قتل کر دیا۔“

”ہائے! ماہ نور نے خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ سعد نے ایک نظر ماہ نور پر ڈالی اور پھر خدیجہ کی طرف دیکھا۔  
 ”اور شہناز کے والد ان کا گھر انہ؟“ اس نے سوال کیا۔

”ماموں بے چارے تو اس صدمے سے جو واپس جا کر بیمار پڑے تو شاید ایک سال بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ مضبوط اعصاب کے آدمی تھے مگر یہ انہوں اور پھر جذباتی فیصلے کے نتائج تھے۔ شہناز سے دوری کو سمجھا نہیں پائے پہلے فوج گرا اور زبان مفلوج ہوئی پھر دل فیل ہو گیا۔ ان کی دوسری بیٹی ریشم ان کی وصیت کے مطابق سب جائیداد اور سازو سامان کی مالک بن گئی، بیوی کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا اللہ اللہ خیر صلا۔“ خدیجہ نے قصہ لپٹنے ہوئے کہا۔

”یہ خبر تو آپ نے صرف سنی ہی تھی تاکہ شہناز کا قتل ہو گیا، متفہم تو نہیں ہوئی یہ خبر۔“ سعد نے کہا۔ خدیجہ نے جواب دینے سے پہلے ایک نظر سعد پر ڈالی، اضطراب اور تجسس کی کیفیت میں وہ اپنی نشست پر آگے کھسکا ہوا عین اس کے کنارے پر بیٹھا تھا۔

”شہناز کے قہقہے کا آخری حصہ یعنی اس کا قتل لاکھ سنسنی خیز سسی مگر یہ لڑکا کچھ زیادہ ہی مضطرب نہیں ہو رہا۔“ انہوں نے سوچا۔

”اس کے بعد چونکہ اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں آئی اور ہمارے جیسے خاندانوں کا اکثر یہ المیہ ہوتا ہے کہ خاندانی شرافت و نجابت بچانے کی خاطر اس قسم کے قصوں سے پہلو تھمی کر لی جاتی ہے لہذا پھر نہ کوئی اس پر ولانا

ہی کسی نے بات کی۔“ انہوں نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

”ہم دونوں بہنوں کو البتہ شہناز اکثراً یاد آ جاتی ہے۔“ فاطمہ نے کہا۔ ”وہ ہماری ہم عمر تھی کزن ہونے کے علاوہ قریبی دوست بھی تھی، اس لیے ہماری بہت سی یادیں اس سے وابستہ ہیں لیکن خاندان کے اکثر بزرگوں کی وفات کے بعد چونکہ اب ہم لوگ بزرگوں کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں تو وہی خاندانی شرافت و نجابت امانت بن کر ہمارے ہاتھوں میں آ چکی ہے، کس سے پوچھیں شہناز کا قتل کیسے ہوا، ہوا بھی کہ نہیں ہوا؟“

فاطمہ کی بات سن کر سعد نے سر جھٹک لیا۔ ”جی یہ بھی ٹھیک ہے۔“ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر فاطمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ماہ نور! سعد! کیا تم یہاں قلمو نظروں اور اس کی قسم کے دوسرے لوگوں کو ڈمکس کرنے آئے ہو۔“ ماہ نور نے جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”سعد کو لگتا ہے، ماضی کے قصوں میں خاصی دلچسپی ہے۔“ خدیجہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولیں۔

”بے شک۔“ سعد نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا اور ماہ نور کی طرف دیکھا۔ ”مس ہیولیشنم قسم کی اولڈ لیڈز کے قصوں میں خصوصاً!“

”گویا اپنی ہم عمر لڑکیوں میں تمہاری دلچسپی بالکل صفر ہے۔“ فاطمہ نے وائستہ کہا اور شرارت بھرے انداز میں ہنس دیں۔

”ہوں!“ سعد نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ نسرود تریخ کھی جاسکتی ہے۔“ اس کے چہرے پر بھی شرارت کا رنگ تھا۔

”ماہ نور کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔“ فاطمہ مسکرائیں۔ ”اس سے میلوں میں کافی گاتے سائیں، بندر کے تماشے دکھاتے، داری، مٹی کے برتن بناتے، لکھار قسم کے لوگ خوب اٹریکٹ کرتے ہیں۔“

”مطلب artisans“ (ہنرمند)۔“ خدیجہ نے اضافہ کیا۔

”گویا سوانگ بھرنے والے لوگ ماہ نور کو اٹریکٹ کرتے ہیں!“ سعد ہنستے ہوئے ماہ نور کو دیکھنے لگا۔

”میرا خیال ہے، اب مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“ ماہ نور نے ناراض انداز میں ٹرے اٹھائی اور کچن کی طرف چل دی۔

”بہت اچھی، بے ریا اور نیک دل لڑکی ہے۔“ ماہ نور کے جانے کے بعد فاطمہ نے سعد سے کہا۔ سعد نے اثبات میں سر ہلایا۔

”آپ کا کیا خیال ہے، آپ کی کزن شہناز جیسی سگر اور ایک میلوں میں گانے والی میرافن میں کوئی مماثلت ہو سکتی ہے، کیا وہ ایک ہی کٹھنکری میں شامل ہو سکتی ہیں۔“ اس نے جلدی سے فاطمہ سے سوال کیا۔

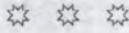
”میرا خیال ہے، بالکل نہیں۔“ فاطمہ نے کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد کہا۔ ”شہناز کی کوئی آڈیو کیسٹ یا ریڈیو پاکستان کی میوزک لائبریری میں محفوظ رکھا رکھنا شاید کیسٹیں مل سکیں، تم کو موقع ملے تو کہیں سے ڈھونڈ کر سننا“

اسٹیشن ہے شہناز اس سے بہت بلند بہت مختلف تھی۔“



منظر یہ ہی ہے۔“

فاطمہ نے دیکھا خدیجہ کی یہ بات سن کر لمحہ بھر کے لیے سعد کے چہرے پر کرب کی لہر دوڑی تھی۔ جسے دیکھ کر فاطمہ نے دل میں خود سے کوئی بات کہی اور سر ہلادیا۔  
”اگر فلزاً ظہور نامہ ختم ہو گیا ہو تو کوئی اور بات کر لی جائے۔“ اسی دم ماہ نور نے کمرے میں آکر گفتگو کا موضوع بدل ڈالا۔



”میں تو بڑا اداس ہو گیا تھا، بھین جی، پڑیوں تو پھر ڈیوٹی ہوتی ہے نا۔“ کھاری نے آپا رابعہ کے قریب تخت پوش پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ ”بھگتانی بڑتی ہے۔“  
”بہت دنوں بعد شکل دیکھی ہے تمہاری، ایسا لگتا ہے دل میں ٹھنڈی پڑ گئی۔“ آپا رابعہ نے محبت بھرے انداز میں کھاری کو دیکھا۔

”اوجی لکھ دنیا کے لہور، لہور ہے، میں تو بس اکو (ایک) ہی بات کہتا ہوں جو مزا چھو دے چو بارے، اوندہ بلج نہ بخارے۔“ کھاری کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اسے گاؤں واپس آکر مانوسیت اور اپنائیت کا جو احساس ہو رہا تھا اس کا اندازہ ہی کر سکتا تھا۔

”میں بڑی کوشش کرتی (کی) مگر میرے سبق پیچھے پڑ گئے۔“ اس نے آپا رابعہ کو بتایا۔  
”اوہر لہور میں کسی کو اتنا ناظم ہی نہیں کہ دو گھنٹی تھم کے کھاری دو چارے (بے چارے) کو تھوڑا سبق سپارے کا ہی دے دے۔“ اس کے لمحے میں گلہ تھا۔

”سبق صرف استاد ہی دے سکتا ہے کھاری۔ وہ بھی اپنا!“ آپا رابعہ نے محبت بھرے انداز میں کھاری کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔

”پروٹے بزرگ تو کہتے ہیں علم دینا اور لینا پڑھن والے (طالب علم) تے پڑھان والے (معلم) کا کام ہے بلکہ فرض ہے۔“

”پڑھانے والا ہر کوئی نہیں تاہو نا کھاری۔“ آپا رابعہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔  
”چلو خیر معاملہ یہ ہے کہ پچھلا سبق بھی ایک داری فیر پکا کرانا ہے اور نواں (نیا) تو دینا ہی ہے۔“ کھاری نے اصل معاملہ ان کے گوش گزار کیا۔

”یعنی سب بھول گئے۔“ آپا رابعہ کو افسوس ہوا۔  
”بھل نہیں گیا۔“ کھاری نے ان کو تسلی دی۔ ”پکا کرنا ہے۔“

”کان آگے سے پکڑو یا پیچھے سے، ایک ہی بات ہے!“ آپا رابعہ کو اس کی چالاکی پر ہنسی آئی۔ ”یہ کیا ہے۔“ انہوں نے سمجھن میں رکھے تھیلوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو کھاری لے کر آیا تھا۔

”سبزی بھیجی ہے چوہدری صاحب نے، سنگٹھاڑے بھی ہیں، شکر قندیاں بھی، کچھ فروٹ بھی ہے۔ ایک تھیلے میں آٹا ہے اور ایک میں چینی۔“

”شکر ہے چوہدری صاحب، اپس آئے۔ مانو رونق لوٹ آئی ہمارے گھر میں۔ اونچی شانیں سلامت رہیں چوہدری صاحب کی۔“ آپا رابعہ نے وافر مقدار میں چیزیں دیکھتے ہوئے کہا اور کھاری کی طرف متوجہ ہوئیں جو لاہور میں قیام کے دوران گزریے واقعات انہیں سن رہا تھا۔

”اسلام علیکم سعدیہ باؤ۔ کیا حال چال ہے۔“ اسی دوران سعدیہ سیڑھیاں اتر کر چھت سے نیچے آئی تو کھاری



نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سلام کیا۔ سعدیہ نے کھاری کو جواب دینے کے بجائے راستے میں رکھی لکڑی کی نیچی چوکی کو پاؤں سے ٹھڈا مارا اور ان دونوں کے قریب سے گزرتی کمرے میں چلی گئی۔  
 ”اڑے ہوئے ہوئے۔“ کھاری نے سعدیہ کو اندر جاتے دیکھ کر آپار ابدع سے کہا۔  
 ”سعدیہ باؤ نے تو لگتا ہے نری مرچوں کا سائن کھالیا ہے“ بھیلکے سے (غلطی سے) وہ ہنسا۔ آپار ابدع نے خفگی سے سر جھٹکا۔

”پرچے ختم ہو گئے؟“ کھاری نے سوالیہ نظروں سے آپار ابدع کو دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”ہاں۔۔۔! آپار ابدع نے خفگی سے جواب دیا۔

”تے پھر کیا مسئلہ ہو گیا سعدیہ کو؟“ بھیلے خوش رہے، ”اگوں دسویں پڑھتی ہے۔“ کھاری نے اپنی عقل اور سوچ کے مطابق خیال ظاہر کیا۔ پر وہ تو لگتا ہے آگ (اگ) کا گولہ بن گئی ہے۔  
 ”کوئی دسویں نہیں پڑھتی اس نے؟“ یہ گھر بیٹھے اب۔۔۔ آپار ابدع نے سخت لہجے میں کہا۔  
 ”میں جی!“ کھاری کو ایک دم کرنٹ سا لگا۔ ”کیوں نہیں پڑھتی جی؟“  
 ”بس۔۔۔ آپار ابدع نے سر جھٹکا۔ ”ہم میں اب انتہام نہیں اتنا خرچا کرنے کا۔“  
 ”پر سعدیہ نے تو ڈاکٹر بننا ہے جی!“ کھاری اکتاتے ہوئے بولا۔

”ڈاکٹر بننا ہے۔“ آپار ابدع نے تلخ لہجے میں اس کی بات دہرائی۔ ”زکوۃ خیراتوں پر بھی کبھی کوئی ڈاکٹر بن سکا ہے۔ ہمارے پاس کون سے خزانے ہیں جن کے منہ کھول کر اسے ڈاکٹر بنائیں گے۔“  
 بات کچھ کھاری کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ وہ مزید کوئی سوال پوچھے بغیر آپار ابدع سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد فارم ہاؤس لوٹ آیا۔

”لو جی۔ میں ان کے گھر سونگتیں دینے گیا۔ یہ ادھر حاضری لگانے آگئے۔“ چوہدری صاحب کے آنے کا سن کر واپسی پر مولوی سراج کو فارم ہاؤس کے ملاقاتیوں والے کمرے سے نکلتے دیکھ کر اس نے سوچا۔ ”سوچ پوچھو تو مولیٰ صاحب بھی نابڑے ہی چلے ہیں۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ذرا صبر تو کرو بھائی! چوہدری صاحب کو خود فکر ہے، وہ پنچادیس گے چیزیں آپ کے گھر پر صبر کر دھرے آئے، بڑا مسئلہ ہے بھئی۔“ وہ دل میں سوچتا اور سر جھٹکتا رہا۔  
 اس رات چوہدری صاحب کے بلاوے پر بھی اسے فوراً ”مولوی سراج سرفراز کا ہی خیال آیا تھا۔“ ”لو جی چوہدری صاحب سوچدے ہوں گے کہ میں آگ پچھا کر گیا ہوں، سونگتیں نہیں پنچائیں میں نے مولیٰ صاحب کے گھر۔“ وہ دل ہی دل میں سوچتا اور مولوی سراج کو کوستا چوہدری صاحب کے پاس آیا تھا۔

”بیٹھو کھاری!“ چوہدری صاحب جو ماسٹر کمال سے میٹنگ کر رہے تھے انہوں نے ماسٹر کمال کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ماسٹر کمال کے جانے کے بعد چوہدری صاحب نے کھاری سے کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک کرنے کا حکم دیا۔

”کھاری بیٹا جی۔ میں نے تجھے کبھی غیر سمجھا؟“ لاک کر کے واپس آنے کے بعد جب وہ چوہدری صاحب کے سامنے بیٹھا تو انہوں نے سوال کیا۔

”نہیں جی۔!“ کھاری نے سر ہلایا۔

”کوئی مسئلہ، کوئی شکایت کبھی تجھے مجھ سے ہوئی ہو۔“ دوسرا سوال آیا۔  
 ”نہیں جی!“

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)





”او کے بھابھی! پھر شام کو ملے ہیں۔ اللہ حافظ۔“  
راشدہ نے الوداعی کلمات کی ادائیگی کے بعد ریسیور رکھ دیا۔ آج شام کھانے پہ ان کے بھائی بھابھی اور سارے بچے ان کے گھر آ رہے تھے۔

چند سال قبل ان کی بڑی بیٹی طوبی کے لیے بھابھی سیلہ نے پسندیدگی ظاہر کی تھی۔ اس وقت طوبی خاصی کم عمر تھی۔ اس لیے بات آگے نہ بڑھ سکی۔ مگر پچھلے ہفتے جوں ہی ارسلان کو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب ملی تو احمد اور سیلہ نے سوچا کہ اب ارسلان کی بات پکی کر دی جائے۔ طوبی کا مشرزی بھی مکمل ہونے والا تھا اور ارسلان بھی خیر سے اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو چکا تھا۔ سو آج سیلہ نے منہ کو اپنی آمد کے مقصد سے فون پہ آگاہ کر دیا تھا۔

راشدہ تو خوشی سے جھوم اٹھیں۔ اونچا لبائے بے حد خورہ فرماں بردار اور سلجھا ہوا بھتیجا۔ ارسلان اپنی اولاد سے بھی پیارا لگتا ہے۔ وہ طوبی کے لیے جیسے ہم سفر کی خواہاں تھیں وہ ارسلان کی شکل میں انہیں مل چکا تھا۔

انہوں نے بے حد مسرور ہو کر اسی وقت ڈنر کی تیاری شروع کر دی۔ بلال کو بھیج کر کافی لبا چوڑا سودا منگوایا گیا۔ طوبی یکن میں جت گئی اور عمارہ پردوں اور فرنیچر کی سیٹنگ تبدلنے لگی۔

ماموں، ممانی بلا مبالغہ ہر ماہ باقاعدگی سے ان کے گھر کا چکر لگاتے رہتے تھے۔ مگر آج ان کی آمد کی وجہ ہی خاص تھی۔ سوا ہتھام تو بنتا تھا۔

”اس نے محسوس کیا کہ راشدہ بہن کے کھرے واپسی پر کچھ چپ چاپ تھیں۔ چہرہ مسوج لکیروں سے سجھا تھا۔“  
”کھانا ہوا ایسی زہبی آئی کے ہاں سب خیریت تو ہے نا۔“  
”گئے ہاتھ دوپٹے سے خشک کرتے ہوئے وہ ان کے پاس آ بیٹھی۔“

”ہاں! سب ٹھیک ہے۔“ راشدہ نے ایک لمبی سانس لی۔  
”تمہاری آئی بتا رہی تھیں کہ ماہا کے بے شمار رشتے آ رہے ہیں۔ تمہارے خالوان ہی میں سے کسی

کھانا بے تکلف ماحول میں کھایا گیا۔ سیلہ اور اپنے ساتھ کافی کچھ لائے تھے۔ سونے کا تیس سیٹ پانچ عدد ریڈی میڈ کام وار سوٹ، مٹھائی، پھل۔ شادی طوبی کے ماسٹرز کے بعد ہونا قرار پائی تھی۔



زہبی آئی کی ماہا نے ایف ایس سی میں بورڈ میں تیسری پوزیشن لی تو سارے خاندان میں خوشی کی لہر دو گئی۔

”رات فون پر تمہارے ابو اور میں نے زہبی مبارکباد دی تھی۔ مگر جانا تو بنتا ہے۔ سارا خاندان ان کے گھر جا کر مبارکباد دے رہا ہے۔ میں خالہ ہوں لیٹ جاؤں تو زہبی ضرور محسوس کرے گی۔“  
”جرج کے بٹن بند کرتے ہوئے راشدہ بویں۔“

”جی امی! گھر جا کر مبارکباد دینا فون پر مبارکباد دینے سے کہیں زیادہ اہم ہوتا ہے۔ آپ آئی اور ماہا ہمارے طرف سے بھی ضرور مبارکباد دیجیے گا۔ ہم خود بھی چکر لگائیں گے۔“  
”طوبی نے ماں کو چادر تھمائی۔ باہر بلال ہارن پہ ہارن دے رہا تھا کہ اسے بہت جلدی ہے۔“

”اچھا! تم گھر کا خیال رکھنا۔ یہ لڑکا تو اتولا ہوا جا رہا ہے۔ آ رہی ہوں بھئی۔“ بلال کو زور سے بانگ لگا کر راشدہ پرس اٹھا کر باہر نکل گئیں۔

عصر کے قریب ان کی واپسی ہوئی۔ گھر کا تقصیر سارا کام طوبی نے سنبھالا ہوا تھا۔ آٹا کوندھتے ہوئے

ایک کوہاں کہنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“  
”تو؟“ اسے ماں کی الجھن پھر بھی سمجھ میں نہ آئی۔

”طوبی! میرا دل بہت چاہتا ہے کہ میں ماہا کو اپنے بلال کے لیے مانگ لوں۔“

”سچ امی! آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔“  
وہ ان کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی خوشی سے حج پڑی۔

”مجھے ماہا کتنی اچھی لگتی ہے۔ میں آپ کو بتا نہیں





کتی۔ بلکہ مجھے کیا عمر کو اور بلال کو بھی۔  
”کیا بلال نے کوئی ایسی بات کی تھی؟“

راشدہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹیں۔ انداز  
کھوتا ہوا تھا، جیسے طوبی کی بات کی صداقت کو جاننا  
چاہ رہی ہوں۔

”جی ای! بلال نے مجھے بہت پہلے کہا تھا کہ اسے ماہ  
اچھی لگتی ہے۔ تو کٹ کھنی اور بھگڑالو، لیکن خوب  
صورت اور ذہن ہے اس لیے چل جائے گی۔“ بولتے  
ہوئے طوبی ایک دم ہنس پڑی۔ ہنس، بھائیوں میں  
دوستانہ بے تکلفی تھی۔ بلا جھجک اپنے دل کی باتیں  
ایک دوسرے سے کر لیا کرتے تھے۔

”ہاں! اچھی تو مجھے بھی لگتی ہے۔“ راشدہ نے سر  
اثبات میں ہلایا۔ ”زہبی اور اکرام بہت بے صبرے  
ہو رہے ہیں۔ ورنہ عمر ہی کیا ہے بچوں کی۔ میں چاہتی  
تھی ذرا سمجھ دار ہو جائیں۔“

”رے امی! اپنی اہلالتور شہ پکا کرتے ہیں۔ شادی  
بلال کی جاب کے بعد ہی ہوگی۔“ طوبی چارپائی سے  
اٹھتے ہوئے بولی۔

”چلو! دیکھتے ہیں۔ تمہارے ابو سے شام کو بات  
کرتی ہوں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔“

اور سجاد احمد کو کیا کہنا تھا۔ سوئے اس کے کہ بچوں  
کی خوشی میں ہی ان کی خوشی ہے۔ سو اسی ہفتے ماہا اور  
بلال کی نسبت طے کر دی گئی۔

\*\*\*

ادھر طوبی کا ایم اے کا رزلٹ آیا۔ ادھر راشدہ نے  
گھر بازار ایک کر کے رکھ دیا۔ انواع و اقسام کے برتن،  
کپڑے اور اشیائے آرائش و تہنشت وغیرہ  
خریدیں۔ زیورہ بہت پہلے کا بنا چکی تھیں۔ فرنیچر عین  
نئے لیے کا ارادہ تھا۔

پہلی اولاد کیا بنائے جارہی تھیں۔ سو ضرورت سے  
زیادہ پھرتی دکھائی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بھائی اور بھابی  
تاریخ طے کرنے آج نہیں اور ان کی تیاری ہی مکمل نہ  
ہو، کیونکہ ان کے درمیان یہ ہی طے پایا تھا کہ شادی

طوبی کے ماشرو کرنے کے بعد ہوگی اور اب طوبی  
رزلٹ کو چھ ماہ ہو چکے تھے۔ سہیلہ کی آمد کسی وقت  
متوقع تھی۔

سہیلہ اور احمد نے سابقہ معمول پر قرار رکھا ہوا تھا  
یعنی ہر ماہ ان کے گھر کا چکر لگنا۔ مگر ارسلان کی شادی  
تذکرہ بھی بھولے سے بھی نہ چھوڑتے۔

راشدہ باتوں ہی باتوں میں طوبی کے جینز کے ایک  
ایک آئٹم کا خا صے جتاتے ہوئے انداز میں ذکر کرتی  
مگر سہیلہ انہیں اپنے گھر کے مسائل لیے بیٹھتیں۔

”راشدہ! تمہارے بھائی کا بزنس آج کل کافی ڈاؤن  
چل رہا ہے۔“ سہیلہ بے حد محموم اور مایوسانہ ہوتی۔

”تو بھابھی! اخیر سے ارسلان کی جاب بھی تو ہے۔  
راشدہ خوش دلی سے انہیں امید کا جٹو پکڑا تیں۔

”آج کل کی مزدگانی کے مقابلے میں ارسلان کا  
تنخواہ تو بس اونٹ کے منہ میں زیرے والی جتنی ہے۔

سات بندوں کا کھانا پینا، فیضان کی یونیورسٹی، نعمان کی  
اکیڈمی، فضا کا کالج اور تمہارے بھائی اور میر  
دو ایسٹل۔ سوچو! ارسلان کے چند ہزار روپے کہا

کہاں خرچ ہوتے ہیں۔ بچت تو نہ ہونے کے برابر  
ہے۔ سونا کہاں سے کہاں چلا گیا اور ابھی تک ہو۔

لیے ایک چھٹا تنک نہ بنوا سکی۔ بہت ہے تمہاری جو  
کچھ اتنی جلدی ہو ڈیلا ہے۔“

لوجی اقصیٰ ہی ختم۔  
راشدہ کو بھابھی کا یہ سرد رویہ خاصا کھلا تھا۔ اب

خاندان کی تقریبات میں بھی اوٹنی اوٹنی سنی تھی  
سہیلہ بھابھی کافی اہلالتور پانچ سال تک بیٹے کو بیاہنے

کوئی ارادہ نہیں ہے۔  
”طوبی تینس کی تو ہو چکی ہے۔ پانچ سال بعد تو

ان کی راتوں کی نیند حرام ہو چکی تھی۔  
\*\*\*

سخت ذہنی دباؤ کے سبب راشدہ کالی بی خطرناک  
تک شوٹ کر جانا تھا کھڑے کھڑے گر جاتیں۔ ہاتھ  
پاؤں من ہو جاتے۔

”تھکے خا تنخواہ طوبی کی شادی کو سر پہ سوار کر لیا  
ہے۔ کتنی چھوٹی تو ہے ہماری بیٹی۔“ جلدان کا ہاتھ  
پکڑنے کے نرمی سے بولے۔

”آپ سمجھ نہیں سکتے ایک ماں کی پریشانیوں کا  
اندازہ لگانا آپ کے لیے مشکل ہے۔“ راشدہ یاسیت  
سے بولنے لگیں۔

”طوبی کی ہم عمر تقریباً“ ساری لڑکیاں شادی شدہ  
ہیں۔ بچوں والی ہو چکی ہیں۔ چار سال کتنے آرام سے گزر

گئے ہیں پتا ہی نہیں۔ بھابھی تو جیسے بھول ہی گئی ہیں کہ  
بیٹے کی بیوی میں کتنی بھی کی تھی۔ بہت اچھا کاروبار چل

رہا ہے بھائی جان کا۔ ارسلان کی بھی پچھلے دنوں  
پروموشن ہوئی ہے۔ سب بہانے ہیں۔ خرچا کرنے

سے جی چرائی ہیں۔“ بولتے بولتے ان کا لہجہ ایک دم  
کڑوا ہو گیا تھا۔

”جو بھی ہو، اب ان سے اپنے منہ سے کہنا بھی تو  
بیٹی کی تو قیر گھٹانا ہے۔ کیا کہیں گے کہ ہم بیٹی کی دو

وقت کی روٹی بھاری پڑ گئی ہے۔“ سجاد رسانییت سے  
کہنے لگے۔

”بس میری طبیعت ذرا ٹھیک ہو جائے میں خود احمد  
بھائی سے ڈائریکٹ بات کرتی ہوں۔ میری بیٹی آخر

کب تک ان کے بیٹے کے نام پہ بیٹھی رہے۔“ راشدہ  
کا انداز فیصلہ کن تھا۔

”نہیں اب یہ مناسب نہیں لگتا۔“ سجاد نے ان سے  
اتفاق نہ کیا۔

”مناسب کیوں نہیں۔ اپنیوں میں مناسب“  
نامناسب نہیں دیکھا جاتا۔“ راشدہ کا انداز ہنوز تھا۔

ابھی وہ اسی بحث میں اٹھے ہوئے تھے کہ زہبی اور  
اکرام کی آمد ہوئی۔

”ہائے آ! آپ تو سوکھ کر کاٹنا ہوتی جا رہی ہیں۔ اپنا  
خیال کیوں نہیں رکھتیں۔“ زہبی ان کے گلے لگتے

ہوئے محبت سے بولی۔ دونوں میاں بیوی ان کی  
عیادت کے سلسلے میں آئے تھے۔

”چھی بھلی تو ہوں۔ تمہیں پتا نہیں کیوں کاٹنا  
دکھائی دے رہی ہوں۔“ وہ ہلکے سے مسکرائیں۔ طوبی

اسی وقت چائے اور دیگر لوازمات لے آئی۔  
”آپ! میں اور اکرام سوچ رہے ہیں کہ اب ماہا کو  
اپنے گھر کا کر دیں۔“ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے  
زہبی سنجیدگی سے بولی۔ ”دیکھیں نا! مگنی کو چار سال

ہو گئے ہیں۔ جو نصیب میں ہے، وہ تو میں نے تیار کر لیا  
ہے۔ آپ کے کیا ارادے ہیں۔“ زہبی سوالیہ انداز  
میں انہیں دیکھنے لگی۔

”ہاں زہب! کیوں نہیں۔ بلال کی جاب کوئی اہلالتور  
سال ہوا ہے۔ ان شاء اللہ میں زیورہ تو اسی ماہ بننے دیتی

ہوں۔“ راشدہ بدقت مسکرا کر بولیں۔  
”آپ! جو بھی کرنا ہے، جلدی کرنا ہے۔ آپ کو علم تو

ہے، میری دو بیٹیاں اور بھی ہیں، ایک بھتیجی، مجھے ان کا  
بھی تو سوچنا ہے۔ پہلے ماہا کے ہاتھ پہلے تو کروں۔“

چائے ختم کرنے کے بعد زہبی نے صوفے سے آرام  
سے ٹیک لگائی تھی۔

”بس زہب! تم طوبی کی شادی تک صبر کرو۔ میں  
جیسے ہی طوبی کے فرض سے سکدوش ہوتی ہوں، اسی

دن خیر سے بلال کی مہندی ہوتی ان شاء اللہ۔“  
راشدہ کسی قدر بے چارگی سے بولیں۔ زہبی کے

سنجیدہ انداز و اطوار انہیں بری طرح کھٹکتے تھے۔ بہن کی  
طرف سے معمول کی خوش اخلاقی میں بھی کمی پائی

تھی۔  
”تو کیا جب تک طوبی کی شادی نہیں ہوتی، میری ماہا

بیٹھی رہے گی؟ فرض کیا، طوبی کی شادی مزید چار سال  
آگے ہو جائے تو کیا ماہا کی شادی بھی نہ ہوگی؟“

زہبی کا انداز تنکھا اور لہجہ سخت تھا۔  
راشدہ کو کوئی جواب نہ مڑ سکا۔

\*\*\*

”سیک! کیوں نہ طوبی اور بلال کی شادی ایک ساتھ“  
اکٹھے کر دیں۔ کم خرچ بلال نشین والی بات ہوگی۔

دوسرے تمہاری خدمت کے لیے ہو بھی آجائے  
گی۔“ صبح کا دم پڑ جاتے ہوئے سجاد کو اچانک خیال آیا  
تھا۔ فوراً ”کہہ بھی ڈالا۔“



”چتا نہیں، کیسے اٹلے سیدھے خیالات سُوجھتے رہتے ہیں آپ کو بھی۔“  
 راشدہ تپ کر بولیں۔ وہ بولیں بھی آج کل خاصی چڑی ہوئی تھیں۔ زب کادیاؤ جو بڑھتا جا رہا تھا۔  
 ”ہونہہ! ابھی عمر کیا ہے بلال کی۔ جوانی بڑی ذمہ داری اس کے سر پر ڈال دوں۔“

یہ خوب صورت سا وسیع گھر جس کی وہ بلا شرکت غیرے مالک تھیں۔ اپنی راج دھانی میں کسی دوسری ہستی کی شراکت کا خیال ہی انہیں بے چین کر ڈالتا تھا۔ اس گھر کو سجاد نے بہت محنت سے تعمیر کرایا تھا اور انہوں نے بہت محبت سے سجایا اور ان کا اکو بالاد لایا تھا بلال جس کی محبت اور کمائی پہ پہلا حق ان کا تھا۔ بھلا اتنی جلدی کیسے بواہ کر لیتیں۔

”امی! ابو ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں۔ اتنا مزہ آئے گا“ اس طرح ہمیں طوبی کی کمی بھی قیل نہیں ہوگی۔“  
 بالوں پہ ہیر بنڈ چڑھاتے ہوئے عمارہ نے بھی باپ کی رائے سے اتفاق کیا۔ وہ اس وقت کالج کے لیے نکل رہی تھی۔

”تم چپ رہو۔“ راشدہ نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

”جس بات کا علم نہ ہو، اس میں دخل دینا ضروری نہیں ہے۔ زہی اور اکرام سے تو اللہ پوچھے۔ ہتھکی پہ سرسوں جمانا چاہتے ہیں یہ تو۔ جیسے میں رشتے سے انکار کر رہی ہوں یا جیسے ان کی بیٹی کہیں بھاگی جا رہی ہو۔“ راشدہ کا لہجہ حقارت لیے ہوئے تھا۔

”امی! طوبی صدے سے جیسے لنگ رہ گئی۔“

”ہاں! تو ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔“ وہ بری طرح جھنجھلا میں۔ طوبی کی ملامت آمیز نظریں ان پر جمی تھیں۔

”ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہی تو ہوئے ہیں بلال کو کما تے ہوئے شادی ہوگی، پھر فیملی تو بڑھے گی تا مزید خرچے، ابھی تو سامنے والا پورشن بنونا ہے۔ عمارہ کی پردھانی، جینز۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ باہر صحن میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”تو پھر ہو سکتا ہے، مای سہیلہ کا ہاتھ بھی تنگ ہو۔ ارسلان کی تنخواہ پوری نہ پڑ رہی ہو۔ ان کے بھی سارے بچے زیر تعلیم ہیں۔“ پلپٹیں خشک کر کے اسٹین میں لگاتے ہوئے طوبی سادگی سے بولی۔ اس کا چہرہ سہا تاڑھا۔

راشدہ نے ٹھٹک کر بیٹی کا چہرہ دیکھا۔ نہ جانے انہیں کیوں محسوس ہوا کہ طوبی کی آنکھیں غم میں سادہ سیٹ چرو۔

انہیں کئی بار محسوس ہوا تھا کہ طوبی بہت کم آمیز ہوتی جا رہی ہے۔ کہیں آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ بہن بھائی اور کزنوں کی محفل میں بیٹھنے سے بھی آگے نہ بڑھتی تھی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں اعتماد کی چمک بھی مایا پرانی جا رہی تھی۔ اپنی ذات سے دن بدن لا پڑا ہوئی جا رہی تھی۔ میلا ملگجاسوٹ، الجھے بکھرے بال، کاجل سے خفا آنکھیں۔ نہ جانے انہیں کیوں لگا جیسے بیٹی کے زندگی کے رنگوں کو پھیکا کرنے میں ان کا اپنا قصور ہو۔ غلطی ان سے ہوتی تھی اور سزا ان کی بیٹی کو مل رہی تھی۔

ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے طوبی، جیسے میں ہو لا۔ سے کترا رہی ہوں۔ یہ ہی سوچ سہیلہ بھابھی کی بھی ہو سکتی ہے۔ اگر ہریٹے کی ماں سمہ صحن کی بیٹی کو انی سمجھنے لگے تو سب بچیاں مناسب وقت پہ اپنے گھر کی ہو سکتی ہیں۔

اپنے کمرے میں آکر وہ فوراً ”زہی کا نمبر ملائے لگیں۔ اسے یہ بتانے کے لیے کہ وہ لوگ آج ماہا کی تاریخ لینے آرہے ہیں۔“





# آہاں کا سفر

ہم سب کی متفقہ رائے تھی۔ شفاعت بھیا کبھی نہیں بدل سکتے۔ ان کا مکمل کنٹرول ماں کے ہاتھ میں تھا اور ہم تینوں بھائیوں اور دونوں بہنوں کو اندازہ تھا کہ شادی کے بعد شفاعت بھیا کی بیوی کو کتنے جوہم اٹھانے پڑیں گے۔ اگر اس نے شفاعت بھیا کو خوش رکھنے کے لیے ماں سے خوش گوار رشتہ استوار کرنے کی کوشش نہ کی۔

بظاہر وہ ہماری بھی ماں تھیں۔ مگر ان سے محبت صرف شفاعت بھیا کو تھی۔ باقی سب ماں کی زبان کی تیزی ان کے غصے اور حاکمیت کی وجہ سے ان سے دور بھاگتے تھے اور ماں بھی ہماری تو خوب گوشمالی کرتیں۔

## کانولٹ



مگر ان کے ماتھے کی ساری سلونیں شفاعت بھیا کو دیکھ کر یوں گم ہو جاتیں جیسے کبھی ہی نہیں۔ شفاعت بھیا کی مسکراہٹ بھی ماں کو دیکھ کر اتنی ہی گہری ہو جاتی تھی۔

میں نے ماں کو نرم یا دھیسے لہجے میں بات کرتے نہیں دیکھا۔ بڑے بھیا تو اسی وجہ سے شادی کے چھ ماہ بعد ہی الگ رہنے لگے تھے۔ ان کی بیوی سے ماں کے ناز نخرے نہیں اٹھائے گئے تھے۔

جب بڑے بھیا کی شادی ہوئی تھیں اس وقت سینڈری کلاس میں گیا تھا۔ عائنہ باجی بھائی بھائی تھیں۔





”راحت! اماں، عنایت بھیا کی شادی کر دی ہیں۔“

”شادی۔ وہ کیا ہوتی ہے؟“ اس زمانے میں سب گھروں میں صرف پانی دی آ کر تھا جبکہ ہمارے گھر میں بی وی بھی نہیں تھا۔ میری معصومیت بجا تھی۔ عائشہ باجی یوں خوش ہو رہی تھیں جیسے انہیں ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔

”شادی۔ وہ بی بی ہوا کی اماں سے ہوئی تھی۔ اسی طرح عنایت بھیا کی دلہن آئے گی۔“

”اماں کی اماں سے شادی ہوئی تو وہ اماں بن گئیں۔ عنایت بھیا کی دلہن ہماری کیا کھلائے گی؟“ میرا اگلا سوال تھا۔ عائشہ باجی میرے قریب بیٹھ گئیں۔

”بھابھی۔ وہ ہماری بھابھی کھلائے گی۔ اتنی خالہ کہتی ہیں بھابھی ماں کی طرح ہوتی ہے۔ جیسے ماں ویسے بھابھی۔“

مجھے آج بھی یاد ہے، میں نے اپنی آنکھیں تکلیف سے میچ لی تھیں۔ میں جس پرانی ٹوٹی ہوئی گاڑی سے کھیل رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے آپ سے دور کر دیا تھا۔

”مجھے نہیں چاہیے بھابھی۔“ عائشہ باجی حق دق مجھے دیکھنے لگیں۔

”بھابھی تو اچھی ہوتی ہیں۔“ اجمل بھیا میرے پاس آگئے۔ اجمل بھیا شفاعت بھیا سے چھوٹے اور عائشہ باجی سے بڑے تھے۔ میں نے ان کے پیار سے تھامے ہاتھ جھٹک دیے۔

”نہیں اچھی ہوئیں۔ عائشہ باجی کہتی ہیں، جیسی اماں کی بھابھی۔ مجھے ایک اور اماں نہیں چاہیے۔ گھر میں ہر وقت شور نہیں چاہیے۔“

رات کو عنایت بھیا نوکری سے لوٹے تو سیدھے میرے کمرے میں آگئے۔ میں کم صم چا پانی پر لیٹا تھا۔

”راحت! کیا سوچ رہے ہو۔“ میں نے ان کی شکل دیکھ کر کروش بدلی۔

”مجھے آپ سے بات نہیں کرنی۔“ میرا انداز نروٹھا

تھا۔ عنایت بھیا میرے قریب بیٹھ گئے۔

”تمہیں کمائیاں سننے کا شوق ہے نا؟“ انہوں نے میری ٹوٹ ہوٹ، عمر عیار کی زنجیل سے سجے بسکریک کی طرف دیکھ کر جملہ خیر گلی ادا کیا۔ میں نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا۔

”اب مجھے بے وقوف نہ بنائیں۔ اماں نے آج تک مجھے ایک بھی کمائی نہیں سنائی اور وہ بی وی نہ لانے کی ضد پر بھی ایسے اڑی ہوئی ہیں جیسے بی وی کوئی بھوت ہو، جو سب کچھ بدل کر رکھ دے گا۔“ عنایت بھیا مسکرائے۔

”بی وی اگلے ماہ لا رہا ہوں میں۔ صفیہ کو بی وی دیکھنے کا بہت شوق ہے۔“ میرا منہ اور پھول گیا۔ بی وی بھابھی کے لیے لا رہے تھے۔ یہ تو اماں سے بھی آگے تھیں اپنی بات منوانے کے حوالے سے۔

”صفیہ بہت پیاروے گی تمہیں۔ وہ مہتمم میں بھی بہت اچھی ہے۔ تمہیں اس سے کافی مدد ملے گی۔“ عنایت بھیا ساری باتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کے لا رہے تھے۔ جن سے میرے اور صفیہ بھابھی کے تعلقات اچھے ہو سکتے۔

”شفاعت بھائی کو پتا ہے یہ بات؟“ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”شفو۔۔۔ اسے کیسے نہیں پتا ہوگا! اماں کا چچا ہے وہ۔“ عنایت بھیا نے شرارت سے کہا تھا۔

اور یوں صفیہ بھابھی دلہن بن کر آگئیں۔ ان کا نکھر انکھارو پ میری طبع نفارت کو بہت فرحت بخشا تھا۔ وہ شوخ اور چٹل سی تھیں۔ اماں کو ان کا انداز زیادہ پسند نہیں تھا۔ مگر مجھے ان کا ہر انداز پسند تھا۔ وہ محبت ہو، بیش اماں سے ملنے کی توقع رہتی تھی، وہ صفیہ بھابھی سے مل رہی تھی۔

مگر اماں کا رویہ ناقابل برداشت تھا۔ صفیہ بھابھی کے ہر کام میں نقص ہی نظر آتے تھے۔

”بہت زیادہ نہ ہنسو۔ بی وی کی آواز کم رکھو۔ گھر میں آواز نہ ہو۔“

ہوتی ہے۔“

میں اماں کو نظر بچا، بچا کے گھورتا رہتا، کیونکہ ایک بھی کام ایسا نہیں تھا جو میرے ننھے سے ذہن کے لحاظ سے برا ہوتا۔ صفیہ بھابھی اماں کے پیٹھ پیچھے بڑبڑاتی رہتیں، ان کے سامنے مسکراتی ”جی اماں جی اماں۔۔۔“ کی گردن کرتی رہتیں۔

شفاعت بھیا صفیہ بھابھی سے دور رہتے۔ ان کی کل کائنات صرف اماں تھیں۔ دنیا ادھر سے ادھر ہو جاتی مگر شفاعت بھیا کا محور گول گول اماں کے گرد پھیرے لیتا رہتا۔ یہاں تک کہ بڑے بھیا کاڑا سفر کراچی ہو گیا۔ وہ صفیہ بھابھی کے ساتھ شفٹ ہو گئے اور میرا دل اس گھر میں رہنے کو کرنے کے لیے ہلنے لگا۔ جہاں صفیہ بھابھی تھیں۔

اور اماں تھیں کہ روز فون کر کے۔ وہاں بھی ان کا ناطقہ بند کر دیتیں۔ ”یہ کھایا کرو۔ وہ پیار کرو۔“

میں چڑ جاتا تھا۔ کاش! میں اماں کو صفیہ بھابھی کی زندگی سے غائب کر دیتا مگر پھر شفاعت بھیا کا کہنا ہوتا۔ یکدم دھبی مسکراہٹ والے شفاعت بھیا آنکھوں میں تیز جلتے۔ ان کی تو دنیا ہی لٹ جاتی۔ میں سوچتا رہتا۔

پھر اچانک پتا چلا۔ اماں کراچی چلی گئیں۔ مجھے صفیہ بھابھی پر ترس آنے لگا۔

ایک رات میں سو رہا تھا، جب عائشہ باجی نے مجھے سوتے میں سے جھنجھوڑ کر اٹھایا تھا۔

”راحت۔ سونا۔۔۔ راحت!“ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں میں نیند بھری تھی۔

”کیا ہو گیا ہے عائشہ باجی! اتنی رات کو کیوں جگایا ہے؟“

”ایک اچھی خبر ہے۔ اپنی صفیہ بھابھی ہیں نا، ان کے ہاں منا آیا ہے۔“

”مننا آیا ہے۔ کہاں سے آگیا؟“ عائشہ باجی جزیب ہو گئیں مگر پھر سنبھلا لے کر بولیں۔

”ان کے پیالے انگلیڈ سے بھیجا ہے۔ بہت پیارا

**خواتین ڈائجسٹ**

کطرف سے، جنہوں کے لیے ایک اور ناول



**میں عبدالقادر ہوں**

شروت تیز

قیمت - 225 روپے

نکولے کا پتہ:

کتبہ و مران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021



میں نے مسکراہٹ اور خوشی دیکھی۔ شفاعت بھیا بھاگ بھاگ کر صفیہ بھابی کے کام کر رہے تھے تاکہ کچھ درودھ نہ کوئی خود میں لے سکیں۔

”اماں! صفیہ بھابی کو کہیں نا ہییں رک جائیں۔ ابھی تو نے سے میرا دل بھی نہیں بھرا۔“ کھانا کھاتے شفاعت بھیا نے منت کی۔ عاشری بائی بھی لقمہ لیتے لیتے اماں کو امید سے دیکھنے لگیں اور میرا دل بلیوں اچھلنے لگا کہ صفیہ بھابی نے ساتھ رہوں گا۔

”کہہ کر دیکھتی ہوں عنایت سے مگر مجھے امید نہیں ہے کہ وہ مانے گا۔“ اماں نے گری سانس لی۔

”کیوں نہیں مانتیں گے؟ آپ کہہ کر تو دیکھیں۔“ عاشری بائی کے لہجے میں شفاعت بھیا سے کہیں زیادہ منت سم آئی تھی۔

پھر شام گئے ملے ملانے سے فارغ ہو کر وہ آنگن میں پڑے تخت پر آکر بیٹھے ہی تھے کہ باتوں باتوں میں اماں نے یہ بات بھی کر دی اور شفاعت بھیا کا نام پوچھ لیا، جیسے ان کی بات ماننا گناہ تھا۔

عنایت بھیا نے وہ بات دوسری باتوں میں گم کر دی، مگر جب میں رات کو سونے کو لینے کے لیے ان کے کمرے کی طرف گیا تو مجھے باہر ہی سے صفیہ بھابی کی آواز سنائی دی۔ وہ عنایت بھیا سے تیز لہجے میں بات کر رہی تھیں۔ مجھے ان کے لہجے پر حیرت ہوئی۔

”آپ کے گھر والوں میں ایسی کھٹکس نہیں۔“ اٹھنے بیٹھنے کی تیز ہے، نہ بات کرنے کا سہاوا۔ میں اس ٹپیکل ماحول میں اپنے حاتم کی پرورش نہیں کر سکتی۔ کیسے ایک ہی پلٹ میں جانوروں کی طرح کھاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی اتریں پہننے ہیں۔ عنایت! آپ کیوں چاہتے ہیں جیسا بچپن آپ نے گزارا ہے، میرا بھائی ویسی ہی زندگی گزارے؟ پڑھے لکھے ماں باپ کا ہو کر بھی وہ راحت جیسا، جمل جیسا بچہ ہے؟

میرے قدم وہیں رک گئے میں نے خود کو ٹٹول کر دیکھا۔ مگر کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ عنایت بھیا کی منمنہاٹ میرے کانوں کو بہت بری لگ رہی تھی۔

صفیہ بھابی پھر تیز آوازیں مخاطب ہوئیں۔

”شفاعت۔ شفاعت۔ آخر سے کیا شفاعت؟“ خود کو اماں کا چہرہ بنا کر سمجھتا ہے ساری کی ساری اماں اسی کی ہیں۔ ان کی ایک ایک مرضی پر صرف اس کا حق ہے۔ ہلکے نہیں کہا مگر اب کے دیتی ہوں، مجھے اس کو سے شفاعت کی وجہ سے ہی جانا تھا۔

”شفاعت کی وجہ سے کیوں؟“ بھیا کا لہجہ حیرت انگیز تھا اور میرا چہرہ ان کی اس حیرت سے دنگ رہ گیا۔

”وہ سمجھتا ہے، وہ اماں کے بعد اس گھر کا والد وارث ہے۔ ابھی سیکڑ ایر نہیں کیا، مگر کیسے اجمل عاشری سلی پر رعب کا شفا ہے۔ کبھی اس کی نظریں آپ کے لیے عزت نہیں دیکھی میں نے۔“

”مگر اس نے کبھی مجھ سے بد میزبی بھی نہیں کی ماننا ہوں وہ اماں کا بچہ ہے، مگر ہمیشہ مجھ سے دھیمے لہجے میں بات کرتا ہے۔ میری آواز پر اپنی آواز کو اونچا نہیں ہونے دیتا۔“

”مگر آپ نے دیکھا ہے، وہ اس چال بازی سے اپنے من پسند فیصلے کروا رہی ہیں؟ کوئی بھی اس کے اثر سے نہیں بچ سکتا۔ وہ ایک برگہ کا درخت ہے، جس کے نیچے اگنے والے سارے پیز پوزے جل جاتے ہیں اور مجھے اپنے بیٹے کو الگ طرح سے پالنا ہے۔ مجھے روک ٹوک، اپنی مرضی ٹھونسنے کی عادت نہیں ڈالنی اپنے حاتم میں۔“ عنایت بھیا کچھ دیر چپ رہے، مگر پھر کچھ یاد آنے پر بولے۔

”مگر اماں جی جس بات پر تم دل گرفتہ ہوتی تھیں، صرف وہ ہی تو تمہاری دل جوئی کرتا تھا۔ تمہیں اپنی مرضی پوری کرنے کے لیے راستہ نکالنا اسی نے سکھایا ہے۔ تمہیں اماں نے ٹپ ریکارڈر چلانے سے روکا تھا تو وہ ہی تو تمہارے لیے واک مین لایا تھا۔ اماں نے تمہاری پائل کی چھن چھن پر اعتراض کیا تو اسی نے تمہیں سٹارے ایسی پائل لا کر دی، جو دیکھنے میں تمہاری پائل جیسی تھی، مگر اس میں چھن چھن نہیں ہوتی تھی۔ اور پھر ایک دفعہ۔“

”بس کر دیں۔ آپ نے تو شفاعت نامہ ہی شروع کر دیا۔ اس نے کچھ اچھا کیا ہے تو کیا ضروری ہے، ہر وقت اسے گھمایا جائے؟ میں اس وقت ہی نئی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اماں سے ڈر لگتا تھا۔ اس لیے شفاعت سے بنا کر رکھتی تھی تاکہ اماں کا من نہ پھول جائے، مگر کسی چیز کو زبردستی قبول کرنے اور مرضی سے قبول کرنے میں فرق ہوتا ہے۔“

عنایت بھیا کچھ نہ بولے میں پلٹا اور بت بن گیا۔ شفاعت بھیا سامنے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے مگر مجھے شفاعت بھیا سے کوئی ہمدردی نہیں ہوئی۔

ٹھیک تو کتنی ہیں صفیہ بھابی۔ ہر کسی کو شفاعت بھیا سے کوئی نہ کوئی شکایت ہے، اور وہ شکایت بے معنی بھی نہیں۔ شفاعت بھیا واقعی آسان زندگی کو مشکل بنا دیتے ہیں۔

”راحت۔“ وہ دبے قدموں میرے پیچھے چلنے لگے۔ ”کیا میں ایسا ہوں۔“

میں نے پلٹ کر انہیں سر سے لے کر پیر تک دیکھا۔

”اس سے بھی زیادہ ناقابل برداشت۔ جتنا صفیہ بھابی نے کہا۔“

شفاعت بھیا نے دوبار سے ٹیک لگالی۔ مجھے لگا، وہ چھین گئے، چلائیں گے، مگر وہ جیسے سے بولے۔

”چھا! پھر ایسا ہی ہو گا۔“ کہہ کر وہ مڑ گئے۔ اور بستر پر لیٹنے کے بعد میرے دل کو کچھ ہوا۔

”یہ میں نے شفاعت بھیا سے کیا کہہ دیا۔“ میں اٹھ کر بیٹھ گیا مگر یہ شرمندگی نہیں ڈرتا تھا۔ اماں کے چچے یعنی شفاعت بھیا نے میری اور صفیہ بھابی کی شکایت اماں سے لگا دی تو میری تو جگہ اس گھر میں بچنے کی ہی نہیں۔

ساری رات میں سو نہیں سکا۔

اماں خیر میں ہی میرے سر پر آکر کھڑی ہو گئیں۔

”مجھ جاؤ تو اب زادے! غلطی سے مسلمان گھر میں پیدا ہو گئے ہو۔“

اور شرمندگی کا احساس مجھے اسی انداز میں دلایا جاتا

اس لیے مجھے اماں اچھی لگتی تھیں، نہ یہ گھر۔ صفیہ بھابی کا گھر میرے خیالوں میں چھا تھا۔ باتوں باتوں میں صفیہ بھابی نے اپنی چند ایڈز زمین اور دو یاغوں کا حساب کتاب شفاعت بھیا سے پوچھا تو اماں کو ہنسنے لگ گئے۔

”صفیہ بی بی! اس کا حساب کتاب میں جانوں یا میرا شفاعت۔ تم کون ہوں ہو پوچھنے والی؟ کیا اب بھائیوں بھائیوں کے بیچ زمین کو لا کر دو بار اٹھاؤ؟“

عنایت بھیا کی منمنہاٹ سنائی دی۔ ”نہیں نا اماں جی! صفیہ حساب کتاب میں گولڈ میڈلسٹ ہے۔ وہ تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ شفاعت کو اگر کہیں کوئی اچھن ہے تو وہ حل کر دے۔“

شفاعت بھیا نے اماں کا ہاتھ پکڑا اور اماں کے چہرے پر غصے کا گراف ایک دم نیچے اترنے لگا، جیسے شفاعت بھیا ٹھنڈے میٹھے پانی کا دریا ہوں۔ جسے ہلکا سا چھو لینا ہی اماں کے غصے کے سمندر کو ٹھنڈا اور پرسکون کر دیتا ہو۔

”بھابی ٹھیک کہتی ہیں اماں! گھر کے معاملات کم از کم تین چار بندوں کو معلوم ہونے چاہئیں۔ عاشری سلی تو دیکھی نہیں لیتیں۔ اہمل کو آپ نے فوج میں بھیج دیا۔ پیچھے بچے، عنایت، صفیہ بھابی میں اور آپ۔ اگر کل کو مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو کوئی اور تو ہونا چاہیے نا جو آپ کی مدد کر سکے۔“

”ہاں ہاں! جاؤ۔ تم بھی مر جاؤ۔ میں تو سدا کی گناہ گار ہوں نا! آخری وقت تک قیامت کے پورے سمیٹتی رہوں گی۔“ شفاعت بھیا نے اماں کو اپنے چوڑے سینے میں چھپا لیا۔

”اماں! پیچھا کریں۔ میں صرف فرض کرنے کو کہہ رہا ہوں۔ میں واقعی ٹھوڑی مر رہا ہوں۔ آپ بہت جلد ہمت ہار دیتی ہیں۔“ اماں وہیں بیٹھ گئیں اور ان کا رونا شروع ہو گیا۔

”کیا کروں۔ جب سے تمہارے ابا یہ زے داریاں میرے سر ڈال گئے ہیں، میرے تو حواس ہی ہونق رہتے ہیں۔ یہ نہ ہو جائے نہ نہ ہو جائے۔ ہر



وقت دل دھڑکتا ہی رہتا ہے۔

مجھے اماں پر غصہ آیا تھا۔ اچھا خاصا میلو ڈراما تھیں اماں۔ جہاں موقع نکلتا، نہیں نکلتا ڈراما شروع ہو جاتا۔ وگرنہ یہی اماں تھیں، ہر وقت ابا سے لڑتی جھگڑتی ہوتی نظر آتی تھیں یہاں تک کہ جب ابا دنیا سے جا رہے تھے، تب بھی انہوں نے سکھ کا سانس نہیں لینے دیا تھا۔ جاںبداد کی منتقلی کے بھیڑے لے کر بیٹھ گئی تھیں۔ مجھے تو ابا کے زندہ رہنے سے ان کے مرنے پر ترس آیا تھا۔ میں نے پھر براسمانہ بنا کر اماں کو دیکھا اور اسی وقت اماں کے ”وڈر بوائے“ سارے کھاتے اٹھا لئے۔

صفیہ بھابھی جیسے جیسے کھاتے دیکھتی جاتیں، حساب کتاب سخت ہوتا جا رہا تھا۔ شفاعت بھائی مانو کٹہرے میں لا کر کھڑے کر دیے گئے تھے۔

”یہ ساری زمین کس کے نام ہے؟“ صفیہ بھابھی نے سوال کیا اور اماں کی آنکھیں ماتھے پر آ گئیں۔

”تمہیں اس زمین کے حساب کتاب سے بھی مطلب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ شفو نے کہا تو میں نے تمہیں دکھا دیا، مگر زمین کس کے نام ہے، کس کے نہیں اس سے تمہیں کیا سروکار۔“

عنایت بھیا جزیر ہونے لگے۔ گھبراہٹ واضح تھی۔ صفیہ بھابھی نے واقعی ایک غلط بات کر ڈالی تھی، مگر صفیہ بھابھی ڈری تھیں نہ گھبرائی تھیں۔

”مرانے زمانے میں ہوتا ہو گا یہ سب کہ ساری ذمہ داری ایک کے سر ڈال کر سکون سے ہو گئے سب پر بھ لکھ رہے ہیں تو کس کے لیے؟ اماں سب کی زمینیں ان کے نام رجسٹر کروائیں اور خود کو اس گورکھ دھندے سے نکالیں۔ جس کی زمین ہے، وہ خود سنبھالے نا! آپ کہاں اپنے بڑھاپے کو بے آرام کیے پھرتی ہیں؟“

”ہاں ہاں اماں۔“ عنایت بھیا نے سنبھالا لیا اور اماں نے ماضی کی طرح جوتی عنایت بھیا کے پیچھے ماری۔

”ہورو کے غلام! تیری اپنی سمجھ بوجھ بھی کام کرتی

ہے کہ نہیں؟“

عنایت بھیا کا چہرہ سرخ ہو گیا اور میرا چہرہ ان کی اور بھابھی کی بے عزتی کرنے پر تن گیا۔ بھابھی غصے میں اٹھ کر چلی گئیں اور عنایت بھیا اماں کے ہاتھ پکڑے بیٹھے تھے۔

”آپ غلط نہ سمجھیں۔ مجھے زمین جائیداد سے کوئی سروکار نہیں اماں! آپ جانتی ہیں۔“

اماں نے چشمے کی اوٹ سے عنایت بھیا کو پرکھا۔ رنج جھوٹ کی کسوٹی لگائی اور غصے سے بولیں۔

”پھر تری بیوی کہاں سے سیکھ کر آئی ہے یہ سب؟ اسے مال و دولت سے سروکار تیرے سروکار سے زیادہ

لگتا ہے۔ بڑی لوبھی ہے۔ بھی تیری بیوی۔“ عنایت بھیا کچھ کے بغیر اٹھ گئے۔ پھر دوسرے دن میں حاتم کے ساتھ کھیل رہا تھا، جب چھت پر بیٹھے بیٹھے صفیہ بھابھی عنایت بھیا پر بیٹھ پڑیں۔

”اسی لیے نہیں آتی میں یہاں۔ آپ کے گھر والوں کو آپ سے مطلب ہے نہ آپ کی اولاد سے۔ نہ آپ کے آنے کی خوشی ہے۔ سارے سارے کم بخت لالچی ہیں۔“

”ابا آں۔“ یہ کیسی زبان بول رہی ہیں آپ؟ یہ آپ کو زیب نہیں دیتا۔“ صفیہ بھابھی کی بڑی بڑی آنکھوں میں لال ڈور اسادھ آنسو بن کر تیر گیا۔

”مجھے بھی پتا نہیں تھا، میں کبھی ایسی زبان بولوں گی۔ میں کالونٹ کی بڑھی اسٹوڈنٹ کو آپ نے کہاں ان جاہلوں میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اماں ویسے ہر وقت اولاد کے دکھ سے تڑپتی نظر آتی ہیں، مگر اندر سے ان کی لالچ کا پیالا ہی نہیں بھرنا۔ اہی خالہ بتاتی ہیں، مرتے مرتے بھی ابا کی جان نہیں چھوڑی تھی۔ جب تک انہوں نے ساری جائیداد ان کے نام نہیں کر دی تھی۔“

عنایت بھیا نے خفگی سے گھورا تھا۔

”انی خالہ کا ذکر مت کرو۔ وہ تھیں تو اماں کی چچا زاد، مگر ہمیشہ انہیں اماں کے رہن سہن، اچھے حالات سے جڑی ہوئی رہی۔ وہ اماں کو اور ابا کو بھی اک ساتھ

جتنے بولے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اگر اماں ذہانت سے کام نہ لیتیں تو کب کا وہ ابا سے عقد خانی کر چکی ہوتیں۔ بیوی کو بھی ہمیشہ انہوں نے نمانی دکھ کی طرح چہرے پر سجا کر رکھا۔ ہمیشہ اس دکھ کا کھایا ہے انہوں نے۔ دنوں اسی گھر میں ڈیرا ڈالے رکھتے تھیں اپنے بچوں کے ساتھ۔ ان کے بچے بھی ان کی طرح آنکھ سے سرمہ چرا لینے والوں میں سے تھے۔ مگر اماں نے ہر کم ہونے والی چیز پر صبر کیا اور یہی کہا، شوہر کی ہر اسی کی بہت کم قیمت ہے۔ جیسے پتا ہے، فانی خالہ چیزیں چرا کر ان کے سامنے ہی استعمال کرتی تھیں، مگر اماں نے کبھی زبان پر اف نہ کیا، کبھی میں یا شفاعت کہہ بھی دیتے کہ یہ چوڑیاں آپ جیسی ہیں، جو کم ہوتی ہیں، یہ کان کی بالی یہ ہنسی تو بالکل اسی کٹاؤ کی ہے جو ابا نے آپ کے لیے خاص طور پر بنوائی تھی تو اماں مگر جاتی تھیں کہ ”نہیں! یہ اہی خالہ کی ہیں۔ تمہارے ابا نے ان کے زیور کو دیکھ کر ہی میرے لیے بنوائی تھی۔“ اہی خالہ مسکراتی رہیں اور اماں ”عنایت بھیا مٹرے۔“

صفیہ بھابھی واک مین کلن میں لگائے جھوم رہی تھیں۔ عنایت بھیا کو پہلی بار میں نے غصے میں دیکھا انہوں نے واک مین ان کے کان سے نکال کر انہیں گھورا۔

”تمہیں لگتا ہے، میں اب تک جھک مارا ہوں۔“

”کواس کرتا رہا ہوں؟“

”پتا نہیں مگر مجھے یہ پتا ہے کہ مجھے آپ کے ”اماں“ نامے میں کوئی دلچسپی نہیں۔“ صفیہ بھابھی نے کندھے اچکا دیے۔

پھر جس شام انہیں کراچی کے لیے نکلتا تھا وہ ٹیلی فون پر بیٹھی ہوئی کسی سے کہہ رہی تھیں۔

”بس! کیا بتاؤں ماما! اس گھر میں سارے سکی اور خبیث لوگوں کا جمعہ بازار لگا ہوا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا، کالونٹ میں بڑھنے والے، سول سروس میں ایسی پرسنٹ آئی کیو پولیٹ ج جتنے والے عنایت ایسے گھر میں رہتے ہیں۔ سب کچھ بس سمجھیے شفاعت کے اندر

ہے۔ کل اماں کی آنکھ بند ہوئی تو شفاعت نے توبہ کو ہاتھ پکڑ کر باہر نکل دینا ہے۔ نہیں ماما! مجھے یہ کنٹرول روڈ اور لوہے ٹیلٹی پر سبز کے ساتھ نہیں رہنا۔ میں واپس آ رہی ہوں شام میں۔ حاتم بھی اوب گیا ہے یہاں کے ماحول سے۔ سب نے بچے کو چوما چائی کر کے اسپالٹ کر کے رکھ دیا ہے۔“

پھر پتا نہیں وہ جا رہے تھے، جب اچانک میں نے ضد شروع کر دی، مجھے عنایت بھائی کے ساتھ جانا ہے۔ عائنہ بادی حیران پریشان تھیں۔

”وہاں اماں نہیں ہوں گی۔“ شفاعت بھیا نے ڈرایا۔ میں اور شیر ہو گیا۔

”میں ریلوں کا کیلا۔ مجھے کراچی میں پڑھنا ہے۔“ عنایت بھیا نے اماں کی طرف دیکھا۔

”جاتا ہے تو لے جاؤ۔ مجھے تو اس سے پہلے بھی کوئی اچھی امید نہ تھی۔“ اماں کی سخت رائے میرا منہ چڑا رہی تھی۔

صفیہ بھابھی کمرے میں جا کر چیزیں اٹھا کر کرنے لگیں۔

”اب یہ نئی کیا سوچھی؟ ایک نئی ذمہ داری۔ میں کے دیتی ہوں، میں حاتم کے حق پر ڈاکا نہیں ڈالنے دوں گی۔ آپ کی ذمہ داری، آپ کی توجہ صرف حاتم کے کے لیے ہونی چاہیے۔“

”تم بے فکر رہو۔ میں تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“

میں چھوٹا سا بیگ تھامے جو عائنہ بادی نے تیار کر کے دیا تھا، وہیں سے واپس پلٹ آیا۔

”مجھے نہیں جانا عنایت بھیا کے ساتھ۔“

”اے لڑکے! تمہاری کوئی ایک زبان ہے کہ نہیں؟“ اماں نے گھورا اور میں بے دھڑک ان پر چلا پڑا۔

”آپ کو رکھنا ہے واپس گھر میں یا ضد کرنے کے جرم میں ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نکالیں گی؟“

”ماں سے بات کرنے کی تمیز نہیں تمہیں؟“ اماں نے میرے قد کا خیال کیے بغیر مجھ پر پھنڈر مارنا شروع

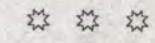


کر دیے۔ شفاعت بھیانک میں آگئے۔

”ماں! اچھوٹا ہے، مانا سمجھ ہے، اتنا نہیں مارتے۔“  
ماں کے مشینی انداز میں جلتے ہاتھ یکدم رک گئے۔  
جیسے ماں کا ریوٹ کشول جس شفاعت بھیاء کے پاس  
تھا۔ اس کے علاوہ پوری دنیا جو کہتی ہے، بیکواس کرتی  
ہے، جو کام کرتی ہے، بھاڑ چھوکتی ہے۔

مجھے عنایت بھیاء سے کم شفاعت بھیاء سے خدا  
واسطے کا پیر اور نفرت محسوس ہونے لگی۔ اس دن مجھے  
لگا تھا صفیہ بھابھی کہیں غلط تھیں تو بہت سی جنگوں  
میں ٹھیک بھی تھیں۔ شفاعت بھیاء ماں کے راج  
دارے تھے۔ ان کی غلطی بھی ماں کو حد سے بڑھا  
ہوا ایثار نظر آتی تھی اور ہمارا ایثار بھی ماں کو شک  
میں لپٹا ہوا غرض سے پردہ کھائی دیتا۔

”مجھے ماں سے نفرت ہے۔ مجھے شفاعت بھیاء سے  
نفرت ہے۔“ میرے دل نے کہا اور میرے دل غ نے یہ  
بات من و عن تسلیم کر لی۔ میرا وقت اب گھر سے باہر  
گزرنے لگا۔



اس دن میں جیسے ہی گھر میں آیا۔ شفاعت  
بھیاء کے پیچھے کی آواز سنائی دی۔  
”عائشہ.... اوھر آئیں۔ آپ کو پتا بھی ہے ای کا  
بلڈ پریشر ہائی رہتا ہے، پھر بھی انہیں مشین لگانے  
دی؟“

عائشہ باجی کی جگہ سہلی آباد دڑی آئیں۔ شفاعت  
بھیاء ماں کو بیڈ پر لٹا رہے تھے۔  
”ہو نہ! ہم سب چار پائی پر۔ ماں کے لیے وال ٹو  
وال کارپٹ اور یہ آرام دہ بیڈ۔“ مجھے ایک پرانے عم  
نے نئی طرح سے چٹکی کلن۔

شفاعت بھیاء لیٹی فون کر کے ڈاکٹر انکل کو بلا رہے  
تھے۔ وہ لیٹی آپریشن سے لیٹی چیک کر چکے تو وہاں دینے  
کے لیے آنا نہ کرنے لگے، مگر ماں بلا کی ضدی۔ میں  
نے گردن موڑ کر حالات دیکھے اور پھر سے کارٹون دیکھنے  
لگا۔ میں بڑا تھا، مگر بچہ بن گیا تھا۔ شاید میں اس منظر

سے جان کر بھانگنا چاہ رہا تھا۔ خاص طرح کی بے حسی  
طاری ہو گئی تھی، مجھ پر۔ مجھے ماں سے لگاؤ ہی نہیں رہا  
تھا۔

”تم بے حس ہو گئے ہو یا بین رہے ہو؟“ شفاعت  
بھیاء نے لی وی بند کر دیا اور میں نے محسوس کے انہیں  
دیکھا۔

”کیا کوئی اس گھر میں اپنی مرضی سے کام کر سکتا  
ہے؟“ میں نے لی وی پھر کھول لیا۔

”راحت! ماں کی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر انکل  
کہہ رہے ہیں، انہیں پر سکون ماحول چاہیے۔“ میں  
نے لی وی بند کر دیا۔

”پر سکون ماحول ان کو ہی ملتا ہے، جو پر سکون ماحول  
کے متلاشی ہوتے ہیں۔ ماں جیسے لوگ نہیں۔ ہر  
وقت کل کل۔ زندگی بھر ان کو کمر ہوا ہے۔“

”راحت۔“ زندگی میں پہلی بار شفاعت بھیاء نے  
میرا بازو پوری قوت سے بھینچا تھا۔ ان کی آواز تیز نہیں  
تھی، مگر گجہ ضرور تیز تھا۔ ایک لمحہ کے گھورنے سے  
میرے دل کی ساری دنیا لپٹ ہو کر رہ گئی تھی۔  
شفاعت بھیاء کو میں نے کب اتنے غصے میں دیکھا تھا۔

”مگر اہمل بھاء ہونے نا تو دو تین ہاتھ جڑ دیتے  
پوری بیتی باہر لنگھتی ہوتی۔ چھوٹے بڑے سے بات  
کر کے کی تیز نہیں رہی نہیں۔“ سہلی تپانے خفگی  
بھری محبت سے میرے بالوں کو چھوا اور میں نے ان  
کے ہاتھ جھٹک دیے۔

”شفو بھاء ماں کے چچے اور آپ سب شفو بھیاء کی  
چچیاں۔ مجھے کسی سے بات نہیں کرنی۔“

میں گھوم کر گھر کے پچھلے حصے میں نکل گیا، جہاں  
تخت بڑا ہوا تھا۔ ساری سردیاں اوک میں دھوپ بھر کر  
صرف اسی حصے کو بھگونے آیا کرتی تھی، مگر ابھی سردی  
نہیں تھی۔ میں نیم کے درخت کے نیچے بچھے تخت  
پر بیٹھ گیا۔ نیم کے درخت سے ماں کے کمرے کی  
پوری کھڑکی بائیں کرتی تھی۔ چاند کھڑکی پر ہوتا تو دور  
زور سے دستک دے کر کھڑکی سے بات کرنا۔

مگر ماں جیسے سرد مزاج، حس لطیف سے خالی لوگوں

کے لیے چاند کو نگاہی بھلا لگتا تھا۔ شفاعت بھیاء صاف  
نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ماں کا ہاتھ یوں پکڑا ہوا تھا  
جیسے ڈاکٹر کا انجکشن ماں کو نہیں، شفو بھیاء کو لگنے لگا  
تھا۔

”وہ نہ! ڈراے بانہ۔ نوٹکی۔“ میں باہر بیٹھ بیٹھ  
کر اپنی زبان عجیب سب بھول گیا۔ میں نے اپنے کلی  
کے یا عبدال کی طرح زمین پر تھوکا بھی تھا۔ عمو! وہ  
ایسا اس شخص کو دیکھ کر کرتا تھا جس سے وہ نفرت کرتا  
تھا اور مجھے شفاعت عرف شفو بھیاء سے شدید نفرت  
تھی۔

میں دیکھ کر جا رہا تھا۔ ماں نے آنکھیں بھینچ لی  
تھیں۔ میں دبے قدموں چلتا ماں کی کھڑکی کے نیچے  
بیٹھ گیا۔

”ماں! سن لیں، ڈاکٹر انکل کیا کہہ رہے ہیں۔ کل  
جانا ہے آپ کو میرے ساتھ نیٹ کروانے۔ خون  
بھی نیٹ ہو گا اور ای سی جی بھی کروا کے دل کی پی  
بھی نکالونی پڑے گی۔ آج آپ کا بی بی بہت ہائی تھا  
کچھ بھی ہو سکتا تھا آج۔“ پھر ماں کی نوٹکی آواز  
میرے کانوں میں جھپٹ گئی۔

”مجھے عنایت کا دکھ ہوتا ہے۔ کیا ہیرے جیسا لڑکا  
صفیہ جیسی چریل کے سر منڈھ دیا میں نے۔ بس سوچا  
تھا، رامی لکھی لوکی ہے، گھر کو سنبھال لے گی، مگر اس  
نے تو پورے گھر کو ہی تتر بتر کر چھوڑا ہے۔ اجمل اتنی  
دور ہے مجھ سے اور یہ چھوٹا تو نا، ہاتھوں سے نکلا جاتا  
ہے۔ کسی کی نہیں سنتا۔ کسی کو کچھ نہیں مانتا۔“

”کچھ نہیں ہوا ہے اسے ماں! کچھ ہے۔ اس عمر  
میں بچے ایسے ہی ضدی خود سر ہو جاتے ہیں۔ اہمل  
بھی تو ایسا ہی تھا۔ سہلی باجی بھی کتنا تنگ کرتی تھیں،  
مگر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو گیا نا! وہ بھی ٹھیک  
ہو جائے گا۔ بس تھوڑا الگ ہے، مگر بہن بھائیوں میں  
اتفاق تو چلتا ہی ہے، ورنہ ایک جیسے مزاج سے دل  
اوپ نہ جائے۔ اہمل غصیلے ہے، عنایت بھی شیریں  
ہیں، میں تھوڑا نمکین اور ذہیل ہوں۔ اسی طرح وہ  
تھوڑا دیکھا ہے، مگر جب وہ اپنی ذمہ داری سمجھے گا تو خود

سیدھا چلنے لگے گا، روک ٹوک لگائیں گی تو انہیں  
گھوٹنے کی طرح بد کے گالات مارے گا، رسی تڑانے  
کی کوشش کرے گا۔ اس کو اس کے مزاج سے سنبھالنا  
پڑے گا۔“

میں چڑ کر پھر نیم کے درخت کے نیچے آکر بیٹھ گیا۔  
پھر ایک ہلکی سی ننگری لگی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا اور  
کی منزل کی کھڑکی پر سہلی تپا کھڑی مسکرا رہی تھیں۔  
”کیا غضب کرتے ہو راحت! ایک تو کرپلا۔ وہ۔۔۔  
بھی نیم چڑھا۔ ماں تو پاؤں ہو جائیں گی تھیں  
سدا رہنے میں۔“

”ہاں! آئی بڑی ثریا بھوپالی۔“ میں نے کانوں پر ہاتھ  
لے جا کر انہیں چڑایا اور وہ مٹھ میں نیچے تھیں۔  
”کیا کیا، کون ثریا بھوپالی؟“

مجھے ان کا گنا پسند نہیں تھا۔ ایک بار چھپ کر  
دوستوں کے ساتھ اداکارہ رانی کی فلم دیکھی تھی تب  
سے جہاں سہلی تپا کی پڑی بدلنے لگتی میں امین ”ثریا  
بھوپالی“ کہہ کر چڑایا کرتا۔ میں چڑائے جا رہا تھا، وہ  
بیٹھنے جا رہی تھیں، جب شفاعت بھیاء کی آمد ہوئی۔  
”کچھ خیال ہے ماں کی طبیعت کتنی خراب ہے۔  
تم دونوں ان کی کھڑکی کے قریب ہو کر اتنا شور۔“

”کھڑکی بند کرویں۔ ہم کسی کے لیے خود کو باؤنڈ  
نہیں کر سکتے۔“

”کسی کے لیے۔ وہ ماں ہیں تمہاری۔“ شفاعت  
بھیاء صدمے میں تھے کہ سکتے ہیں، مجھے اس سے کوئی  
غرض نہیں تھی۔ مجھے بس غصہ تھا تو سہلی تپا کہ وہ  
شفاعت بھیاء سے اپنی غلطی کی معافی مانگ رہی تھیں۔  
پھر وہ ڈرائنگ روم میں تھیں، جب میں نے ان کے  
لے لیے تھے۔ ڈروپک، بلیک شپ اور تیا نہیں کیا کیا  
کہا اور وہ سر جھکا کر گئیں اتنا بولیں۔

”شفاعت بھیاء صبح کہہ رہے تھے۔ غلطی ہماری  
تھی۔ ہماری ایک ہی تو ماں ہیں۔ اگر ہم ان کا خیال  
نہیں رکھیں گے تو کون رکھے گا۔“

”آپ کی ہوں گی۔ میری نہیں۔“ عائشہ باجی نے  
میرا کان پکڑ لیا اور یہ اقتدار بالکل غیر متوقع تھی۔



”تمہاری اماں نہیں ہیں تو کیا ہم تمہیں کسی گھوری سے اٹھا کر لائے تھے؟ اماں بے اولاد تھیں کیا؟ بولو۔ خاک تم پر اپنی انجمنی ویسٹ کی انہوں نے۔ کسی گھوری پر ہوتے۔ تو قدر ہوتی نام کیا ہوتا ہے شناخت کیا ہوتی ہے پاپ کیا ہوتا ہے اور ماں کی نرم گود کیا ہوتی ہے بن مانگے سب کچھ مل رہا ہے تو تیر ہی بگڑتے جا رہے ہیں صاحب بہادر کے۔“

مجھے انتہائی بے عزتی محسوس ہوئی تھی۔ میں پہلی بار رويا تھا۔ اور جب میری ہچکچاہٹ بندھ گئی تھیں تب کسی کے چوڑے سینے اور مضبوط بازوؤں کے حصار نے مجھے بچھڑایا تھا۔

”وہ پاگل ہے اماں کی بیماری کی وجہ سے بوکھلا گئی ہے۔ میں نے اسے خوب ڈانٹا ہے کہ اماں کے چھوٹو سے پھر بھی ایسے بات نہ کرنا۔ وہ اماں کی ہی نہیں میری بھی جان ہے۔“ میں جو ہچکچاہٹوں سے رو رو کے بیڑھال تھا اپنی سدھ بدھ کھو چکا تھا اس آواز پر کرٹ لگنے کی رفتار سے چوٹا تھا۔ شفاعت بھی کاسینہ عن کا ولا سا۔

آئی ہیٹ بوشو خویا۔ میں نے یکدم چھلانگ لگا کر ان کی طرف سے منہ موڑ لیا اور انہوں نے پلٹ کر اس بے عزتی کی وجہ تک جاننے کی کوشش نہیں کی۔

\*\*\*

پھر دو سوا دن تھا جب شفاعت بھی عاشرہ بابی کو ساتھ لے کر اماں کے چیک اپ کو چلے گئے تھے۔ پھر ایک ہفتے بعد وہ اسی تخت پر ہراساں بیٹھے تھے۔ میں نے اوپر کی منزل سے دیکھا مگر ان کا وہیام کسی کی طرف نہیں تھا۔ میں خاموشی سے بچن میں کلام کرتی عاشرہ بابی کے پیچھے کھڑا ہو گیا ان کے انداز میں بھی بے دھیانی پڑھی ہوئی تھی۔ فکر چرے پر یہاں سے وہاں تیر رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے۔“ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا سہلی آئے سوال داغ دیا اور میں کو لڑ سے پانی لے کر وہیں بیٹھ گیا کہ وہ کیا کہیں گی۔

”خیر مگر انی بتائی ہے ان کے لیے ہر طرح کا صدمہ جان لیوا ثابت ہو گا۔ اس کے لیے پہلے سے بہت سے لوگ لٹ رہے ہیں مگر انکل کی جان بچان کی وجہ سے اماں کی انجیر مگر انی اگلے ماہ کی انٹارہ کو طے پائی ہے۔“

”اگلے مہینے کی انٹارہ تاریخ۔“ میرے دل کو کچھ ہوا۔ اسی اکتوبر کی انٹارہ تاریخ۔

دن تو ابانے اسپتال میں محنت کرتے ڈاکٹروں کو ناکام نامہ اور قراورے دیا تھا۔ اگر لایا کی طرح اماں بھی چل گئیں تو۔ میرا بدن تپتے سورج کی شعاعوں سا جلنے لگا تھا۔ مجھے لگا تھا مجھ پر جو سائبان تھا اس کے چاروں کھونٹے زمین سے ایک ایک انچ اوپر آگئے ہوں اور گزرنے والے ہر دن میں اس سائبان کی میٹھیں باہر نکلنے کو زور مار رہی تھیں۔

میں اس دن کے بعد سے آج پہلی بار اماں کے کمرے میں گیا تھا۔ اماں نیند کی دوا کے اثر سے سو رہی تھیں اور سامنے کرسی پر شفاعت بھی بیٹھے تھے۔ میری جان جل کر رہ گئی۔

لگتا ہے اماں کو صرف انہوں نے اپنے نام لالٹ کر لیا ہے۔ صبح سے لے کر شام تک اماں کے قریب رہتے ہیں۔ کسی اور کے لیے۔ کوئی در ز رہنے ہی نہیں دیتے۔

”آجائو راحت! اماں ابھی تمہارا ہی ذکر کر رہی تھیں سوئے سے پہلے۔“ وہ ہمہ وقت مسکراہٹ سے لیے پوتے چرے کے ساتھ میرے سامنے تھے اور میں طنز سے مسکرا دیتا۔

”چھال۔“ ان کو اپنی کسی اور اولاد کی یاد بھی آتی ہے۔ میں حیران ہوا سن کر۔

”یہ کیا عجیب بات کی تم نے؟ وہ ہم سب کی اماں ہیں۔ ہم سب میں ان کی جان ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کے دل سے کوئی بچہ محو ہو جائے یا وہ کسی کو بھول جائیں۔“

”ہو سکتا ہے نا اگر اماں کے پاس آپ جیسا ہیبر جیسا بیٹا موجود ہو۔ پھر کہاں یاد آوے گا میں نا فرماں

عنایت بھیا یا اجمل بھیا جو اتنی دور بیٹھے ہیں کہ مجھے تو اب ان کی شکل تک بھول گئی ہے۔“ شفاعت بھی اپر چپے کوئی اثر ہی نہیں ہوا اسی محبت سے بولے۔

”یہی تو فرق ہے اولاد میں اور ماں میں۔ سات سمندر دور بھی چلے جاؤ ماں تب بھی ہمارے خدو خال کی ایک ایک لکیر کو اسی سرعت سے دوہرا سکتی ہے جیسے اس نے پہلے بار جنم دینے کے بعد ہمارے چہرے کی ایک ایک لکیر کو چھو کر یاد کیا تھا۔“

”ہاں! مگر وہ ماں دوسری ہوتی ہوں گی۔ ہماری اماں کو تو بس دولت سے غرض ہے اپنی ران چھانی پر سالوں سال حکمرانی کے خواب کے علاوہ ان کی آنکھوں میں اور کسی چیز کا عکس نہیں۔ نہ میرا نہ آپ کا اور نہ کسی اور کا۔“ میں باہر آ گیا۔ شفاعت بھیا کی آنکھیں بچھ کر نکلیں۔

اور ٹھوٹی دیر بعد میں باہر پڑے جھولے میں بیٹھا کلس رہا تھا۔

”آخر ہماری اماں کو دولت کی اتنی طمع کیوں ہے۔ نہ کبھی گھر لگایا، نہ ہم پر۔ بس بینک بھرے جاری ہیں۔ صفیہ بھیا بھی جب یہاں تھیں تو زمینوں کے آنے والے پیسوں سے انہوں نے گھر میں بدلاؤ لانے کی کوشش کی تھی مگر اماں نے آنکھیں ماتھے پر رکھ کر صاف کہہ دیا۔

”بی بی! یہ اللہ تبارک جیسے برداشت نہیں ہوں گے۔ میرے سر پر میرے سائیں کا سایہ نہیں۔ اس رقم سے مجھے گھر چلانا ہے، گھر نہ مگر کیا سمجھو، بچانا لگانا یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔“

اس دن اماں نے عنایت بھیا سے چیک بک چھین کر شفاعت بھیا کو دے دی تھی۔ نئے دستخط، نیا انسان مگر میرے دل کا وہی پرانا دکھ اور پرانا داغ۔ آخر ایسا کیا ہے ان شفاعت بھیا میں۔ میں چڑھ کر باہر آ گیا اور ایسے میں میں ہیبر عبدل کے پاس جایا کرتا تھا۔

آج عبدل کسی نئے رنگ ڈھنگ میں تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑے لگا تھا مجھے اپنچا ہوا۔ ہم نے سگریٹ کا دھواں ایک ساتھ اڑایا تھا۔ اور بھی کچھ غلط کام ایک

ساتھ کیے تھے مگر اب یہ ایسا کیا کام تھا جس کی وجہ سے وہ مجھ سے کئی کڑا رہا تھا۔

میں نے جتایا نہیں مگر رضی سے اگلے دن ذکر کر دیا۔ رضی نے ناک پر انگلی رکھ کر خباثت سے مجھے دیکھا۔ میں پھر بھی نہیں سمجھتا تو سر پر دھب لگا کر بولا۔

”لڑکی کا چکر ہے۔ عبدل کسی سے پیار کرتا ہے۔“ میں نے پیار کی صبح تعریف بیان کرنے کی کوشش کی۔ وہ ہنستا شروع ہو گیا تو رکا نہیں۔ عبدل نے اگر وجہ جاننے کی کوشش کی اور دونوں میں ہاتھ پائی ہو گئی۔

”چل یہاں سے۔ یہ تیرے مجھے کی باتیں نہیں ہیں۔ شفو بھائی نے اگر دیکھ لیا نا اس چکر بازی میں تو تیرے ساتھ ساتھ میرا بھی جتناڑاٹھ جائے گا۔“

اور میرے دماغ کو ڈنک لگا تھا۔ شفو بھائی گھر سے نکل کر باہر بھی میرے کندھوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

میری جان راکھ ہو گئی اور تب میں نے سوچا جس کام سے ان کی جان جلے میں وہ کام ضرور کروں گا۔

\*\*\*

میں نے رضی کے ذریعے ایک دو لڑکیوں سے علیک سلیک کر لی۔ میں ان پر بے دھڑک پکٹ مٹی لٹا رہا تھا۔ جب میرے سینڈا ایر کار زلٹ آیا۔ شفاعت بھیا تو کیا پوچھے، اجمل بھیا چھٹی پر گھر آئے ہوئے تھے۔ وہ ہی مجھ پر چڑھ دوڑے تھے۔

”یہ زلٹ ہے۔؟“ خیار انہوں نے خالص فونی آفسر کی طرح میرے منہ پر کھینچ مارا۔ میرا دل ٹھہر کر کانپ رہا تھا۔

”کہاں آوارہ گردی کرتے پھرتے ہو؟ کن چکروں میں رہتے ہو؟ چندہ دن ہوں میں یہاں۔ ساری انوشی گیشن کر کے چھوڑ دوں گا۔“

میرا خوف سے دم نکلنے لگا۔ عبدل میرے ان چکروں کی وجہ سے ناراض ہو گیا تھا اور رضی ایک نمبر کا لٹا تھا۔ اسے جو پیسہ دتا وہ اسی کی زبان بولنے لگا۔ میرے والد میں پیسے کم تھے۔ شمو کی سالگرہ بھی



قرب تھی۔ میں جو حکم میں پڑ گیا۔ شمو کو تحفہ دوں یا بے غیرت رضی کا منہ بند کرنے کی قیمت۔ اور بس میرے باوجود میں آخری کیل میری سوچوں کے برخلاف ٹھونک دی گئی۔ اجمل بھیا کے سامنے بیٹھی عدالت میں عبدال شفاعت بھیا کے سامنے بول پڑا۔

”ہم کی کمین ہیں سرکار! اگر آپ کی عزت و محبت اور شرافت کی بات اور ہے۔ ہم کچھ کریں گے تو لوگ چونکیں گے نہیں۔ ہمارے باپ دادا نے بھی یہ ہی رزمن پلن کیا ہے مگر راحت جب سے اس رضی کی دوستی میں پڑا ہے کوئی اچھا کام نہیں سیکھا اس نے۔“

شفاعت بھیا نے جارے تھے اور میں سر پیٹ رہا تھا کہ دنیا گول ہے سنا تھا، مگر یہ گول گول گھوم کر شفاعت بھیا کے پاس کیوں لوٹ آتی تھی۔ پھر میں گھر آ کر اپنی آوارگی کے نشانات منا بھی نہیں سکا تھا کہ شفاعت بھیا نے چھاپہ مارا۔

حرام مشروب کی دو خالی بوتلیں۔ سگریٹ کے پیکٹ، شمو کے خوش بو میں بے خط۔

بھیا نے سب کچھ ایک کالے شاپر میں ڈالا اور باہر آ گئے۔ انہوں نے ایک لفظ نہیں کہا اور اجمل بھیا ان کے چہرے سے کیا کچھ سمجھے۔ کمر بند کر کے عدالت لگا کر بیٹھ گئے۔ شفو بھیا کو غصہ کسی چھوٹی بات پر تو نہیں آ سکتا۔ میں جانتا ہوں وہ بہت مضبوط اعصاب کے مالک ہیں اور اماں کی تربیت کی وجہ سے بہت نرم مزاج۔ میں نے احتجاجاً ”نظریں اٹھا کر دیکھا اور اجمل بھیا سمجھ گئے۔“

”تمہیں پتا نہیں، خدا واسطے کا میری کیوں ہے میری اماں اور میرے شفو بھیا۔“

”بس! وہ دونوں ہیں ہی اسی قابل کہ میں ان کی اپنی زندگی میں انٹری بند کروں۔“ اجمل بھیا غصے کے تیز اور کچھ کچھ ہاتھ چھٹ تھے شمو میرے منہ پر طمانچہ بہت زور سے پڑا تھا۔

”بہت احسان فراموش ہو۔ شفو بھیا نہ ہوتے تاں تو یہ عیش آرام یہ لگژری نہ ہوتیں۔ اماں اگر ابا کا پیسہ جو جو زکوٰۃ نہ رکھتیں تو دیکھتا عنایت بھیا کیسے اعلا تعلیم

حاصل کرتے، کیسے عائشہ میڈیکل جوائن کرتی، مسلمی وکالت میں جاتی۔ اور تم اتنے ناخیار ہو کہ ان دونوں ہستیوں کا احسان ماننے کے بجائے ان سے اتنی نفرت کرتے ہو۔“

میں کہنے کو تو ایک بار پھر جتا بلتا مضمون پڑھ سکتا تھا ان دونوں کی شان میں، مگر فوجی ہاتھ سننے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس لیے چپ رہا۔ شفاعت بھیا نے دروازے پر دستک دی تھی۔ اجمل بھیا یکدم گھبرا گئے۔

”اگر شفو بھیا کو پتا چلا تاں میں نے تم پر ہاتھ اٹھایا ہے تو سمجھ لینا، کیل ڈال دوں گا تم پر۔“

میں سر جھکا کر بیٹھ گیا کیونکہ جانتا تھا فوجی آمروں کے دور میں ”کیل ڈالنے“ کا مطلب تھا صفحہ ہستی سے کلیتہاً یا عارضی طور پر کہیں غائب کر دو اور میں ابھی زمین میں دفن ہونے کا ڈر نہیں رکھتا تھا۔

شفاعت بھیا کمرے میں آئے اور بہت تیز نظری سے میرے چہرے کو دیکھا۔

”اجمل نے تم پر ہاتھ اٹھایا ہے؟“ میں جڑ بڑھ گیا۔

”نہیں تو شفو بھیا! وہ شاید الہی کی وجہ سے لالی آ گئی ہے کل سے بہت خارش ہو رہی تھی۔“

شفاعت بھیا نے تولیے والی نظروں سے دیکھا پھر دھیمے لہجے میں بولے۔

”تم واقعی شمو سے محبت کرتے ہو؟“ یہ سوال تو شاید میں نے بھی اپنے آپ سے بھی نہیں کیا تھا۔ شمو کو نظروں میں لے کر چلی بار خود سے پوچھا۔

”ہاں بھائی راحت! کیا واقعی شمو پر جان چھڑکتے ہو؟“ جواب نہ در۔

میں تو بس یا دوستوں میں کالز اکڑا کر بڑائی مارنے کے لیے شمو کی جان کا قذوق بن گیا تھا مگر مجھے خبر نہیں ہوئی کہ شمو میری جان کو آجائے گی۔ بات اس طرح اور اس قدر پھیلے گی مجھے اندازہ نہ ہوتا تو کبھی شفو بھیا کی ضد میں اس میدان کارزار میں نہیں کودتا۔

”رضی تمہارا مخلص دوست نہیں۔ جاننا چاہتے ہو تو آج شام کو ایسٹ پارک میں جانا۔ تمہیں رضی پر غصہ آئے گا۔“

وہ کہہ کر چلے گئے اور میرے اندر ایک سوال گھوڑے کی طرح دوڑنے ناچھوڑ گئے۔ میں کبھی اس گھوڑے کے کان پکڑتا۔ کبھی دم پر سوار ہونے کی کوشش کرتا تو یہ گھوڑا مجھے منہ کے بل کر کر مٹی چٹا دیتا۔



خدا خدا کر کے شام آئی۔ میں شفاعت بھیا کی آنکھوں سے بچ کر ایسٹ پارک چلا گیا اور میری آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر آ گئیں۔ شمو رضی کے ساتھ بھی راز و نیاز کی باتیں کر رہی تھی اور ایک بہت بڑا شاہی بر میرا منہ پڑھا رہا تھا۔ کچی عمر کی پہلی چاہت کا یہ المناک انجام۔

میں کمر موڑ کر گھر آ گیا۔ مجھے شمو سے محبت نہیں تھی، مگر میں پھر بھی جیج کر رو رہا تھا اور اپنی چیخوں کو تکیے میں دبا کر مار ڈالتا تھا۔

پھر میں یوں ہی کھڑکی پر کھڑا تھا، جب پچھلی گیلری میں عبدال اور شفاعت بھیا کو میں نے من من، کن من باتیں کرتے سنا۔ میں سیڑھیاں اتر کر گیلری کے دہانے پر کھڑا ہوا گیا اور ساری حیات سمیت ان کی باتوں پر لگا دیں۔ ہوا کا رخ میری طرف تھا۔ عبدال کہہ رہا تھا۔

”آپ نے جیج کہا تھا، شفو بھیا! رضی اور شمول کر راحت کو لے گئے تھے۔ ایسی نشیں لگائی ہیں، اس لیے تھیں کہ وہ راحت کی جیب پر اپنے شوق پورے کرے۔ شمو نے آپ کے دیے پیسے آدھے آدھے بانٹے۔ میرا تو دل چاہ رہا تھا۔ دونوں کی تھو تھیں۔ لیکن پر ہی رگڑ دوں مگر آپ نے منع کیا تھا۔ اس لیے ضبط کرنا پڑا۔“

صدے پر یہ ایک اور صدمہ۔ دوست بھی ہاتھ سے گیا۔ میں بچوں ہو کر گھر میں پڑ گیا۔ ساری پڑھائی کھائی میں چلی گئی اور تب تک 18 اکتوبر آگئی۔ اماں اسپتال چل گئیں۔ تب پہلی بار مجھے گھر میں خاموشی کا احساس ہوا۔

شفاعت بھیا اور اجمل بھیا اسپتال میں تھے۔ عنایت بھیا مصفیہ بھیا بھی کے ساتھ سرال کے خرچ پر ورلڈ ٹور پر گئے ہوئے تھے۔ کوئی ایک جگہ ٹھکانہ نہ تھا کہ انہیں خبر کی جاتی۔

اللہ اللہ کر کے طویل اور تکلیف دہ انفجورگرافی مکمل ہوئی۔ اماں غنودی میں بھی ”میرا شفو کہاں ہے۔۔۔ شفو کو بلا دو“ کی رٹ لگائے ہوئے تھیں۔ اجمل بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

”شفو بھیا! آپ تو بھوت کی طرح اماں کے حواسوں پر چھائے ہوئے ہیں پلیز! اندر جائیے۔ انہیں اچھا فیمل ہو گا۔“

شفاعت بھیا جڑ بڑھ کر اندر گئے اور اماں کا اطمینان مانو میں اب ساری حکومت ہاتھ میں تھی۔

”شفو! جب تک مجھے نہ دیکھ لوں، دل کو اطمینان نہیں ہوتا۔ اگر مر جاتی تو بھی مجھ پر بڑی خوش گمانی ہے مجھے۔ تو گھر کو بالکل میری طرح سنبھال لے گا۔“

”ایسی باتیں نہ کریں اماں! شفو بھیا کی ساری طاقت، ساری ہمت آپ سے ہے۔ آپ ان کی سپورٹ پر ہیں، تب ہی یہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر قانون کا منہ چلا پاتے ہیں۔ ورنہ آپ تو جانتی ہیں اپنے بچوں کو۔“ اجمل بھیا ہاتھ تھامے ہوئے شفاعت کی خوبیاں پارٹ لو پھپھار رہے تھے۔

مجھے اس دن سے پہلے کبھی اجمل بھیا بڑے نہیں لگے۔ میں نے رخ موڑ لیا۔

”کب تک ناراض رہے گا اپنی اماں سے؟“ اماں نے ہاتھ پکڑا اور یوں لگا جیسے جی ہوئی برف پر کسی نے نمک چھڑک دیا ہو۔ نمک پڑتے ہی برف پگھلنے لگی مگر پیرامیڈیکل اشاف درمیان آ گیا اور میں آدھا برف آدھا انسان بنالماں کو سکتا رہ گیا۔

پچیس دن وہ آئی سی یو میں رہیں، پھر گھر آئیں تو شفاعت بھیا کی توجہ اپنے کام کی طرف گئی۔ ایک دو جگہ ان کی سی وی گئی ہوئی تھی۔ دونوں انٹرویو لیٹر ان کی ناکامی کا منہ چڑا رہے تھے۔

اماں کو پتا چلا تو بہت افسردہ ہوئیں ”اگر ڈاک دیکھتا



رہتا تو اتنا اچھا موقع ہاتھ سے نہ نکلتا۔ شفاعت بھی  
نے اہل کابا تھ تمام لیا۔  
”فکر کی کوئی بات نہیں! میں نے جہاں اپنا  
وقت صرف کیا وہ اس وقت سے زیادہ قیمتی ثابت ہو گا  
میرے لیے۔ اگر ملازمت لکھی ہے تو کس اور سے  
کال آجائے گی۔“ لمحے بھر کور کے پھر مسکرا کر بولے  
”نہ بھی اتنی تو بھی اپنی کھیتی باڑی ہے ناں! گزارہ اچھا ہو  
جائے گا۔“

”اچھا نہیں بہت اچھا ہو جائے گا۔ اب کے پیسوں پر  
عیش کر رہے ہیں اور خدمت اور ایثار کے ٹیکہ لگا لگا کر  
بے وقوف بنا رکھا ہے سب کو۔“ دل میں سوچتے  
ہوئے میں کمرے میں آتے آتے پلٹ گیا۔  
پھر سب سے پہلا مکرر دوپہر کے کھانے پر اٹھا  
اہل پرہیزی کھانے کی چور تھیں ضد پراڑ گئیں۔ وہ  
ہی کھائیں گی جو باقی سب کھائیں گے۔  
سلٹی کیا اسڈری روم میں کتاب پڑھتے شفاعت بھی  
کو اٹھالائیں۔

”یہ ہر مسئلے کا حل شفو بھی کہاں سے بن گئے ہیں؟  
کیوں بن گئے ہیں؟“ میں نے جل بھن کر سوچا اور  
شفاعت بھی اہل کابا کے ساتھ بیٹھ گئے۔ انہوں نے نہ  
ڈاکٹری نسخے کی بات کی نہ کولہسٹول کی کہانی ڈالی اور  
مسکراتے ہوئے بڑی ہی گرجو شفی سے ان کے قریب آ  
گئے۔

”ارے واہ! چکن اور لوکی۔ واہ واہ۔ بہت دن ہو  
گئے ہیں کھانے ہوئے۔“ اہل کابا نے گھور کے انہیں  
دیکھا اور وہ اہل کابا کے بیڈ پر چوڑی مار کے بیٹھ گئے۔  
پھر یہ ان کا معمول بن گیا۔ وہ ہمیشہ اہل کابا کے ساتھ  
کھانا کھانے لگے۔ اہل کابا بد مزہ کھانا شفو بھی کی  
محبت کے ساتھ چپ چاپ کھا لیتیں اور وہ جلد ہی  
صحت یاب بھی ہو جتی تھیں مگر شفو بھی کابا کے معمول  
نہیں بدلا۔ جو اہل کابا تھ وہ شفو بھی کھاتے اور مجھے  
یہ سب نوٹنی لگتا۔

☆☆☆

گھر میں تعمیراتی کام شروع ہو گیا۔ ہمارا گھر بڑا مگر

وقا نو سی تھا۔ اب اچانک نئے نقشے سے بنیادیں اٹھائی  
جا رہی تھیں۔  
تین ماہ میں گھر بن گیا۔ اندر سے پورشن الگ اور  
باہر سے گھر ایک لگتا تھا۔  
”یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تیرے ابا کی  
مرضی سے بنا تھا سب کچھ۔“ شفو بھیانے اہل کابا کے  
گلے میں بائیں حائل کیں اور میں نے چرے پر  
اسپورٹس میگزین کی چھاپا کر لی۔

”ابانے اس وقت کے حساب سے بنایا تھا اہل کابا!  
سب چھوٹے چھوٹے تھے کسمپرسی سے گزارہ ہو گیا“  
مگر شادی کریں گے تو جبکہ کی ضرورت پڑے گی۔ میں  
نہیں چاہتا عنایت بھی جیسا معاملہ پھر ہو۔“  
”تو ہم صفیہ جیسی لڑکی کیوں لانے لگے؟“ غصہ  
واضح تھا کیونکہ صفیہ بھی اسی اور عنایت بھائی ابھی تک  
ان کی عیادت کو نہیں آئے تھے۔

”سب اچھے ہوتے ہیں اہل کابا! بس کچھ میں مسائل  
سمجھنے، انہیں فیس کرنے اور حل کرنے میں مہارت  
ہوتی ہے اور کچھ جلد گھبرا جاتے ہیں۔ پھر مسائل  
ضرب و ضرب ہو کر لائیکل بن جاتے ہیں۔ انسان کو  
محبت سے ساتھ رہنا چاہیے۔ جبر اور زبردستی سے  
نہیں۔“

اور پھر اچانک اجمل بھی اکی شادی طے ہو گئی۔ اہل کابا  
اس کے بھی خلاف تھیں۔ دونوں بھینس گھر میں ہیں اور  
کر اس کر کے ایک دم اجمل بھائی کی شادی ہو جائے  
مگر بھی نور العین کے ابا بستر مرگ پر تھے اس لیے وہ  
ان کی شادی اپنی آنکھوں کے سامنے کرنا چاہتے تھے  
یوں بچا زاد بھائی کے ہل اہل کابا شگن لے گئیں اور  
تاریخ طے کر آئیں۔ رشتہ ابا نے طے کر رکھا تھا اور  
اہل کابا کو نہیں مانتی تھیں، مگر ان کے مرے پڑے  
فیصلوں کو بڑا مانتی تھیں۔ آخر مشرقی بیوی تھیں۔  
میری زبان اور دل کا زہر ہا ہر آنے لگا۔

اجمل بھیانے ایک بار مجھ پر پھر ہاتھ چھوڑا تھا۔  
شفو بھیانے سے لڑ پڑے۔ یہ ان کے سامنے کا واقعہ تھا  
جو جھٹلانا اور مکر جانا ناممکن تھا۔ وہ اجمل بھی کو دور لے

گئے اور میں تجس ہو کر ان کے قریب ہو گیا۔  
”اس پر ہاتھ نہ اٹھایا کرو اجمل! میرا دل رکنا ہے۔  
کم بخت زبان کا زہر پلاسٹی میجر ابا کی کاربن کابی ہے۔  
میں صبح سے شام تک اس کی کتنی غلطیاں انور کرتا  
ہوں۔ صرف ابا کا چہرہ دیکھ کر۔ میرے ابا نے بڑی  
تکلیف دیکھیں۔ زیادہ تر اپنے غلط فیصلوں سے ہی  
سی مگر میں ابا کو اس رنگ میں پھرے تکلیف میں  
نہیں دیکھ سکتا۔“ ان کی آنکھوں میں نمی تھی اور  
میرے حلق میں تلخی کھل گئی۔ میں نے ضد میں  
سکریٹ سا لگایا۔

”آئے بڑے نوٹنی! اہل کابا کی طرح۔ ابا زندہ تھے تو  
خوش نہیں تھے اور مر گئے تو لوگوں کے سامنے ابا کی  
محبت کا دم بھر رہتے ہیں ہونہ۔“ میں اپنے کمرے  
میں آیا۔

☆☆☆

پھر اجمل بھی اکی شادی ہو گئی۔ نور العین بھی بھی  
اچھی تھیں مگر وہ اہل کابا ہی کا جو ہو کو اچھا ہونے کا  
خطاب دے سکیں۔ روز ہی جھگڑا رہتا، مگر اجمل بھی  
کے آگے نور بھی اکی کی ایک نہ چلتی۔ وہ بھی شفاعت  
بھائی کی طرح اہل کابا کے مرید تھے۔

”اہل کابا بھی غلط نہیں سمجھتے، جہاں واقعی کمی ہوتی  
ہے وہ اسی کو پوائنٹ آؤٹ کرتی ہیں۔ تمہارے اندر  
صفیہ بھی اکی کی بہت جھٹک ہے۔ تم یہ نہ بھولو کہ  
تمہاری شادی جن حالات میں کی گئی وہ اہل کابا کی بڑا  
بنا ہے۔ چچی جان کی تمام تر بدترہیزی اور لڑائی کے  
باوجود انہوں نے ابا کی زبان کا اس بھیا۔ تمہاری جگہ  
اگر کوئی اور ہوتی تو شاید اہل کابا کی خدمت میں سرنگوں  
رہتی۔“

”اگر انہوں نے ابا کی زبان کو بھلیا ہے تو مجھے سکون  
سے رہنے بھی تو دیں۔“ اجمل بھی لال بھجھو کا ہو  
گئے ان کی بات پر۔

”کیا بے سکونی ہے تمہیں اس گھر میں؟“  
”مجھے نہیں پتا۔ بس مجھے آپ کے ساتھ جانا

”ہے۔“  
”سوچوں گا۔ جا کر حالات دیکھوں گا“ پھر ہی کوئی  
فیصلہ کروں گا وہ تیزی سے باہر نکلے اور مجھے رے  
تھامے دیکھ کر اپنے سے رک گئے۔  
”یہ کیا ہے۔ کس کے لیے ہے؟“ میں گھبرا گیا۔  
”وہ نور بھیانے نے کھانا نہیں کھایا تھا اس لیے شفو  
بھیانے کھانا بھیجا ہے ان کے لیے۔“

”شفو بھیانے۔“ وہ زیر لب بڑبڑائے۔ ”جاؤ اور  
آؤ اسے کھانا۔“ لمحہ بھر کور کے پھر میرے کندھے پر  
ہاتھ رکھ کر بولے۔ ”قدر کو شفاعت بھی اکی۔ دنیا میں  
جنتی آدمی ہے۔ اس کی ہوں پر“ ہاں ”کہو گے تو دنیا  
کے ساتھ ساتھ عاقبت بھی سنور جائے گی۔“  
میں نے گردن جھکا لی، مگر دل بھرے شفو بھیانے  
آنا کالی کرنے لگا۔ میں کھانا دے کر واپس آیا۔

☆☆☆

اجمل بھی اپنی چھٹیاں گزار کر واپس چلے گئے۔  
نور العین بھی اسی سارا دن اہل کابا کے دربار میں حاضر  
رہتیں اور میں کلستار رہتا۔ میں نے پھر سب بی کام میں  
داخلہ لے لیا تھا۔

پھر ایک جگہ پھنسا تو دوست سے کسی اچھے یوشن  
سینٹر کی بات کی۔ وہ میری بات پر ایسا ہنسا جیسے میں نے  
کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔

”شفو بھیانے ناں! ایم بی اے کیا ہے انہوں نے  
ٹاپ ون سے صرف پانچ پر سنٹ کم نمبر دیے ہیں اپنی  
ذمہ داریوں کی وجہ سے۔“

”بس کرو۔ کوئی ذمہ داریاں نہیں ہیں۔ سب خود  
پھیلار کھا ہے۔ خالی خولی پیلٹی۔“

میرا دوست میرا منہ تنگ لگے مگر واہ واہی۔ گھوم گھام  
کر بدھو کو گھر ہی آنا پڑا۔

میں جب شفاعت بھیانے کے کمرے میں گیا وہ کسی کو  
بہت ارجنٹ کال کر رہے تھے۔ اپنے ڈاکو منٹس سیٹ  
کر رہے تھے۔ مجھے دکھاؤ رک گئے۔  
”خیریت ہے راحت؟“



میں نے مدعا بتایا تو حرکت کرتے ہاتھ یکدم رک گئے۔ خاموشی سے اپنی اسٹڈی ٹیبل تک گئے اور مجھے سوالات سمجھانے لگے۔ جو چیز میں دس دن میں دور در کی خاک چھان کر نہیں سیکھ سکا تھا، انہوں نے تین گھنٹے کی محنت سے ایسے مجھے ذہن نشین کرادیں کہ میں خود کو میتھ کا ماسٹر سمجھنے لگا۔ میں اٹھنے لگا تو انہوں نے اٹنا مجھے ”تھمنکس“ کہا۔

میں حیران ہو گیا اور دل میں خیال کیا کہ شاید یہ ذلیل کرنے اور مینز رکھانے کی اعلا کوشش ہوگی، مگر میرے ذہن بے مہار سے بالکل الگ انہوں نے محبت سے مجھے کندھوں سے تھما اور ان کے لب تلے۔

”مجھے اچھا لگا کہ تم نے اپنی پرابلم میں مجھے ایک بڑے بھائی کی طرح پکارا اور مجھے خوشی ہے کہ میں تمہاری محبت کا جواب محبت سے دے سکے۔“

محبت۔ محبت۔ محبت۔

میری آنکھیں کھلیں اور شرم سے جھک گئیں حالانکہ میرا دل ابھی تک اپنی نفرت پہ قائم تھا۔ دنیا میں دو شخص تھے جن سے مجھے کبھی محبت نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک اماں اور ایک شفاعت بھیا۔

اور دوسرے جنم پر میرا عقیدہ نہیں تھا، سو مجھے یقین تھا یہ دوری ہمیشہ ایسے ہی رہنی تھی۔ میں ان کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

پھر تیرا دن تھا، جب وہ پہلی بار عنایت بھیا کی طرح تیار ہو کر باہر نکلے۔

سوٹ پہنے اور میچنگ ٹائی لگائے۔ ان کی تیاری میں سو فیصد اماں کا ہاتھ ہوتا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی چیز کے لیے اماں پر انحصار کرتے تھے۔ جو شخص زمینوں کا حساب کتاب دیکھتا تھا جس نے ایم بی اے ایچے نمبروں سے پاس کیا تھا اور آج نور بھائی کے بقول ایک آفس میں ”سٹنٹ سی“ ای، او“ کے عہدے پر جا رہا تھا، وہ شخص اپنی زندگی کے ہر کام میں اماں کا محتاج تھا۔ شاید آپ کو حیرت ہو، شفاعت بھیا کو اپنے جوتے کے نئے تک باندھنے نہیں آتے تھے۔ یہ

کام پیشہ اماں کرتی تھیں۔ اماں کی طبیعت خراب ہوتی تو وہ جوتی یا بغیر کسے کے جوتے استعمال کرتے مگر آج تک انہوں نے نئے باندھنا نہیں سیکھا تھا۔

میں نے پہلی بار انہیں غور سے دیکھا۔ وہ ہم چاروں بھائیوں میں سب سے زیادہ خوب تھے۔ رنگ ان کا ہماری طرح صاف نہیں جس گندی تھا، مگر ان کے چہرے کا نور اور شخصیت کا محر بہ حد متاثر کر دینے والا تھا۔ میں نے گہری سانس لی۔

”نظر لگانی ہے میرے بھیا کو اتنے غور سے دیکھ کر؟“ سلمیٰ آپا کا شرارتی انداز دیکھ کر شفاعت بھیا مسکرانے لگے۔ پھر اماں کے تحت پر پیر رکھ کر انہوں نے نئے بندھوائے اور عازم سفر ہوئے۔

”اچھے لگ رہے تھے ناں آج۔“ آج سلمیٰ آپا نے چھٹی کی تھی۔ وجہ شفاعت بھیا کا پسلا دن تھا اور وہ یہ دن انجوائے کرنا چاہتی تھیں۔

”کوئی نہیں۔“ میں منہ لگاڑ کے آگے بڑھ گیا۔

پھر ایک کو شفاعت بھیا کی شخصیت مسحور کن لگتی تھی۔ مگر مجھے ان سے اتنی ہی چڑ محسوس ہوتی تھی۔ پتا نہیں کیوں۔

پھر یوں ہوا شفاعت بھیا روز چلنے لگے۔ ان کی تیاری اماں کی خاص مصروفیت ہوتی۔ شفو بھیا کی مصروفیت میں وہ نور العین بھابی کو بھی بھولے رہتیں نور العین بھابی کی صفیہ بھابی سے گاڑی چھننے لگی تھی۔

میں ”اماں اور شفاعت بھیا مخالف کیمپ“ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے وہ آسانی سے ہر بات مجھ سے شیر کر لیتی تھیں۔ پڑھائی، گھر کی سیاست ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ یکدم عنایت بھیا لوٹ آئے اور آتے ہی عانت بھابی کے لیے ایک رشتہ پیش کر دیا۔

اماں حق رہ گئیں۔ شفاعت بھیا تصویر دیکھنے لگے۔

سلمیٰ آپا سے تصویر ہوتی مجھ تک بھی پہنچی، مگر میں نے عانت بھابی کے چہرے پر کوئی خوشی نہیں دیکھی۔

”مجھے شادی نہیں کرنی۔ میں ابھی اپنا ہاؤس جا

مکمل کر رہی ہوں۔“ ان کا احتجاج شفاعت بھیا کے ذریعے اماں تک پہنچا۔ اماں نے جہاں دیدگی سے انکار کی برتوں میں جانے کیا دیکھا۔ کھٹاک سے عنایت بھابی کو منع کر دیا۔

مگر شفاعت بھیا عانت بھابی کیسے پاس آگئے۔

”کون ہے وہ۔“ عانت بھابی کے ہاتھ سے ٹی وی کا ریسیور چھوٹ کر گر گیا اور رنگ اتر گیا۔ میں کمرے میں جانے چلتے ہوا رے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

کیا کہیں گی عانت بھابی؟ بڑا سا سوالیہ نشان میرے ارد گرد چمک پھریاں لینے لگا۔ سامنے شیشے میں عانت بھابی کے اثرات واضح تھے۔

”سعید احمد۔ میرے ساتھ ہی تعلیم حاصل کی ہے۔ ہم دونوں ہاؤس جا رہے ہیں۔ وہ رشتے لے کر آنا چاہتے تھے مگر میں نے منع کر دیا۔“

”منع کر دیا؟ کیوں؟ کیا تمہیں لگا ہم بھڑکائی ہیں؟“

شفاعت بھیا کے لہجے میں حیرت بھرا دکھ تھا۔ عانت بھابی نے گہرا لے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”نہیں! مگر صفیہ بھابی اور عنایت بھابی سے ڈر لگا تھا۔ کس وہ اس کو ایڈیوٹنہ بنالیں۔ آپ کو تو پتا ہے ناں، عنایت بھیا نے کس قدر میری تعلیم کی مخالفت کی تھی، پھر صفیہ بھابی آئیں تو انہوں نے بھی کو ایجوکیشن کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ حالانکہ خود انہوں نے کو ایجوکیشن سے پڑھا۔ میں کیسے بھول سکتی ہوں شفو بھیا! اگر آپ اس وقت میرے لیے اسٹینڈ نہ لیتے تو میں اپنی تعلیم تک جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس لیے میں نے سوچا میں ایک اور بوجھ آپ کے کاندھوں پر ڈال دوں یہ تو خود غرضی ہوتی۔“

”پاگل۔۔۔ سچ کہا ہے لوگوں نے۔۔۔ بہنیں واقعی پاگل ہوتی ہیں۔ محبت میں بھی۔ بے وقوفی میں بھی۔“ انہوں نے ان کا سر تھپتھپایا اور مجھے پتا چل گیا شفو بھابی ایک بار پھر عدالت میں جا کر عانت بھابی کا مقدمہ لڑنے والے ہیں۔

مگر پھر نور العین بھابی نے جانے کیا میٹھی میٹھی باتیں کیں کہ میں نے اپنی اہمیت جتانے کے لیے

عانت بھابی کا یہ راز افشاء کر دیا۔ نور العین بھابی نے چٹخارے لے کر یہ بات صفیہ بھابی تک پہنچادی اور عنایت بھیشام کو بی گھر میں دھرے تھے۔

”شفاعت بھیا کو جس طرف لے کر جا رہا ہے ناں اماں! دیکھ لیجئے گا! ایک دن سر پکڑ کر یوں کیس کی آپ۔“

”ہوا کیا ہے۔۔۔؟“ اماں حیران تھیں اور شفاعت بھیا پریشان۔

”محبت کی شادی کرنا چاہتی ہے آپ کی بی بی۔۔۔“

”آئے ہائے! امیری بیٹی کے یہ کروت نہیں، جو تمہارے تھے تم نے جس طرح ہم ماں بیٹے کو بے وقوف بنا کر شادی کی میں خوب جانتی ہوں۔ آخر قوت تک میں سمجھتی رہی، میں اپنی پسند سے لڑکے کا گھر بنا رہی ہوں۔ یہ تو بعد میں کھلا آنکھ منکا تھا دونوں کا۔ ہم تو بلاوجہ ہی بدنام ہو گئے۔“

”بس کر دیں۔ اپنی بیٹی کے کروت نظر نہیں آتے۔ مجھے کوس رہی ہیں۔ سچ کہا کسی نے سناں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔“

”شفاعت رشتہ لایا ہے۔ لڑکا ڈاکٹر ہے۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ اس لیے میں توکل لڑکے کے گھر جا رہی ہوں۔“

”عانت کو بلائیں۔ میں پوچھتا ہوں اس سے۔“

”کس حق سے پوچھو گے؟ کوئی فرض نبھایا اس کا؟“

مگر صفیہ بھابی چلترا بازی سے عانت بھابی کا ہاتھ پکڑ کر لے آئیں۔ اس دن مجھے اپنی بے وقوفی پر سخت غصہ آیا۔ اگر یہ پتا چل جاتا کہ یہ راز کہاں سے ”لیک آؤٹ“ ہوا ہے تو شفو بھیا مجھے فوراً سے پشتر۔ قتل کر دیتے۔ وہ غیروں کی بیٹیوں کی عزت رکھنے پر جان پر کھیل سکتے تھے اور میں کیسا بھائی تھا کہ اپنی بہن کے سر سے انچل کھینچ لیا تھا۔ اسے رسوا کر دیا تھا۔ میں رونے لگا شفاعت بھیا نے سینے سے لگا کر کہا۔

”مت گھبراؤ۔ شادی تو وہیں ہوگی، جہاں عانت چاہتی ہے۔“

وہ گول کمرے میں داخل ہوئے۔ صفیہ بھابی کی



زبان کو سانپ سوگھ گیا۔ نورالعین بھابھی بھی ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

”مجھے سعید میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ پس نہ کرنا کوئی جرم نہیں۔ سعید نے فیصلے کا مختار مجھے اور اماں کو بتایا تھا۔ کوئی عہد و پیمان نہیں کیے تھے۔ اگر میں یا اماں منع کر دیتے تو یہ رشتہ کبھی آگے نہیں بڑھتا مگر جب سعید مجھ سے ملا تو وہ مجھے عائدہ کے لیے سیٹھ جوائس لگا۔ اس لیے میں نے اماں کی رائے کے بعد سعید کو ”ہاں“ کر دی ہے۔ وہ اگلے ہفتے رسم کر جائیں گے۔“

اماں نے نظر اٹھا کر دیکھا اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپایا۔ سسلی آپا خبر دینے عائدہ باجی کے کمرے کی طرف بھاگیں۔

میں عائدہ باجی کا ہاتھ تھامے اب بھی روئے جا رہا تھا، مگر مجھ میں اخلاقی جرات کی کمی تھی اس لیے اپنا جرم نہ بتا سکا اور تب ہی شفاعت بھیا کمرے میں آگئے۔ عائدہ باجی بھاگ کر ان کے سینے سے لگ گئیں۔

ان کا ایک ہی خوف تھا۔ بات سارے خاندان میں پھیل جائے گی۔ صفیہ بھابھی خوب نمک مرچ لگا کر بات آگے بڑھائیں گی۔ شفاعت بھیا مسکرائے۔

”تمہاری شادی ہم صفیہ بھابھی کے لائے ہوئے رشتے سے کرواتے، تب بھی وہ کوئی نہ کوئی نقص کوئی نہ کوئی پٹھارہ ڈھونڈ ہی لیتیں۔ تم دنیا کی فکر مت کرو۔ دنیا نہ آپ کے جینے سے خوش ہوتی ہے نہ آپ کے مرنے سے۔ بس مستقبل کے ایسے خواب دیکھو۔“

سعید کہہ رہا تھا، نکاح کے بعد وہ باہر چلا جائے گا اور پھر کچھ مہینوں بعد تمہیں بھی بلا لے گا اس لیے وہ نکاح جلد چاہتا ہے۔ سر پر ہاتھ رکھ کر وہ دھیمے لہجے میں بولے۔

”تم یہاں نہیں ہو گی تو پھر فکر بھی مت کرو کہ دنیا تمہارے لیے کیا کیا کمائیاں بناتی اور لگاؤتی ہے۔ جب سال دو سال بعد لوگوں کو تمہارے چہرے کی خوشی سے ہی ان سب کے منہ بند ہو جائیں گے۔“

\*\*\*

دوسری صبح عنایت بھیا اور صفیہ بھابھی واپس چلے گئے۔ اس بار وہ اپنا جینا مرنا ختم کر کے گئے تھے۔ اس دن اماں کو پھر درد ہوا تھا۔ ساری رات شفاعت بھیا ان کے سرہانے بیٹھے رہے۔

”اولاد اماں سے دور نہیں رہ سکتی۔ ابھی وقتی غصہ ہے۔ آپ گھبراہٹیں نہیں۔ عنایت بھیا خود لوٹ آئیں گے۔“

”اگر میں نہ رہی تب لوٹا تو کس کام سے۔“

”اماں۔۔۔ شفاعت بھیا نے خفگی سے اماں کو دیکھا۔ پھر وہ ساری رات کونسلنگ کرتے رہے۔ دوسری صبح اماں کھڑی ان کے لیے ڈریس اور میچنگ ٹائی نکال رہی تھیں۔

”شفاعت بھیا جاؤ مگر میں واقعی۔۔۔ میں نے سوچا اور دل میں ٹٹولا۔ نفرت کے منہ پر کسی نے کس کو دونوں ہاتھ رکھ دیے تھے۔ نہ وہ بول پار ہی تھی نہ وہ دیکھ پار ہی تھی۔

نکاح میں اجمل بھیا شامل نہیں ہو سکے تھے مگر انہوں نے فون کر کے عائدہ باجی کو مبارکباد دی تھی۔ سسلی آپا ہواؤں میں اڑی پھرتی تھیں۔ سب جگہ خوشی ہی خوشی تھی مگر نورالعین بھابھی کا منہ نہ ہلکا ہوا تھا۔

”آپ کو کیا ہوا؟“ میں نے چاہا میں انہیں صفیہ بھابھی کے سحر سے باہر نکالوں۔ وہ مجھ پر ہی اٹ گئیں۔

”تم سب کے سب فوننگی ہو۔ اپنے مطلب کے لیے کچھ بھی کر جاتے ہو۔ اماں اور بہنوں کی باتوں پر کلید دھڑکتا ہے۔ ہم بہنوں کچھ کہیں تو مجرم ظالم مکار۔“

میں کان دبائے سنتا رہا۔ اجمل بھیا کے غصہ کی وجہ سے نورالعین بھابھی کو عائدہ باجی کے نکاح کی خریداری میں ہر طرح کا ساتھ دینا پڑا تھا اور وہ یہ غصہ مجھ پر نکال رہی تھیں کیونکہ صفیہ بھابھی روز فون کر کے ان کی غیرت اور حیمت کو جگاتی رہتی تھیں۔ ان کا خیال تھا نورالعین بھابھی کو اس کام میں ہاتھ بٹانے کی

قطع ضرورت نہیں مگر انہیں کرنا پڑ رہا تھا۔

\*\*\*

عائدہ باجی کا نکاح ساوگی سے ہو گیا۔ چھ ماہ بعد سعید بھائی واپس آئے تو عائدہ باجی کی رخصتی ہو گئی۔ گھر خالی خالی ہو گیا۔

ولیمہ والے دن عائدہ باجی کی مسکراہٹ بہت کھلی تھی۔

”اس مسکراہٹ پر سو بار قربان۔“ میں نے دل میں سوچا اور شفاعت بھیا میرے قریب آکر گنگنائے۔

”بہنیں مسکراتی ہوئی۔ اچھی لگتی ہیں ناں؟“

میں نے ”ہاں“ میں سر ہلایا اور وہ دوبارہ بولے۔

”اسی لیے میں نے ان دونوں کو کبھی بھائی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ اماں کی نظر سے ٹٹ گیا ہے۔ بہنوں کو باپ کی نظر سے دیکھو تو کبھی کبھی ان کی ناچاز بات بھی جائز اور ان کا حق لگتی ہے۔ مجھے خوشی ہے میں نے امانت داری کا ثبوت دیا۔ کسی کا حق نہیں روکا۔“

”تذکرہ شفو بھیا کی دنیا میں رہ کر وہ جنتی ہیں۔“

اجمل بھیا کا جملہ آج میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ مکرمش نے نظر ہٹائی۔ اتنے برسوں کا ”ایٹی ٹیوٹ“ ایک دم سے کمال ختم ہونا تھا۔

\*\*\*

پھر سسلی آپا کی شادی طے ہو گئی۔ میں بہت خوش ہوا تھا کہ سسلی آپا کی شادی اور اجمل بھیا کے ہاں پہلی بیٹی کے بعد دوسرا بیٹا ساتھ ہی ہوا تھا۔ سب ہی خوشی سے جاگل تھے۔

مگر سسلی آپا کو یہ خوشی راس نہ آئی۔ ان کے شوہر، صفی بھیا شادی کے چند روز بعد ہی کراچی کے کسی ہنگامے کی نذر ہو گئے۔ یوں سسلی آپا بیوگی کا آچل اوڑھ کر ایک کمرے میں قید ہو گئیں۔ اماں کا دل غم سے پھٹا جا رہا تھا عائدہ باجی شادی میں شرکت کے لیے آئی تھیں اور انہیں کیا راسیم ادا کرنی پڑی تھیں۔ سسلی آپا کے کمرے سے ہر وقت تلاوت کی آواز آتی رہتی۔

شفاعت بھیا رات رات بھر ملتے رہتے۔ اماں بستر پر لیٹ جاتی رہیں۔

”اب کیا ہو گا؟ کون اپناے گا میری بیٹی کو۔“ ایک ہی غم کھائے جاتا تھا کہ سعید بھائی، حسن کی طرح اماں کے سامنے آن بیٹھے۔

”دوسرے ماں باپ نہیں ہیں۔ مگر نہ اس رشتے کی بات وہ کرتے۔ اگر آپ کو مناسب لگے تو میرا ایک چھوٹا بھائی ہے۔ یو کے میں رہتا ہے۔ صوم و صلوة کا پابند ہے۔ اس کے لیے سسلی کا رشتہ قبول کر لیں تو۔۔۔“

میری خوشی سے چیخ نکل گئی۔ شفاعت بھیا کا مرجھایا چہرہ کھل اٹھا۔ یوں سسلی آپا عدت کے فوراً بعد شیراز کی دکن بن کر یو کے چلی گئیں۔ اماں اب شفاعت بھیا کی شادی کے درپے تھیں۔ لڑکیاں دیکھ رہی تھیں کہ ایک دم سے دھچکا لگا۔

ایک روز شفاعت بھیا گھر آئے تو ان کا چہرہ دیکھ کر اماں کی چیخیں نکل گئیں۔

”بتاؤ بھی شفو! سب خیریت تو ہے؟“

”اماں۔۔۔ اماں! اپنا اجمل شہید ہو گیا۔ کنٹرول لائن کے اس طرف سے بلا اشتعال فائرنگ کا جواب دیتے ہوئے وہاں کے لوگوں کو محفوظ جگہ تک پہنچاتے پہنچاتے ایک انجیلی گولی کا شکار ہو گیا ہمارا اجمل۔“

اماں کھڑے سے بیٹھ گئیں۔ مجھے لگا اماں مر گئیں، مگر شفاعت بھیا نے اماں کو پھر سے نبھال لیا۔

نورالعین بھابھی عدت میں بیٹھ گئیں اور اماں کی ایک ہی ضد تھی۔

”میں نورالعین کو واپس گھر نہیں جانے دوں گی۔ میرے بچے کی نشانیاں ہیں اس کے پاس۔“

”ہمارا نہیں جانے کو نہیں کہہ رہے مگر وہ کتنی ہیں“ وہ یہاں کس رشتے سے کہیں؟“

”میں عنایت سے کہوں گی، وہ نورالعین سے عقد ٹائی کر لے۔“

انہوں نے فون کیا اور پھر جو صفیہ بھابھی کی لن ترانی شروع ہوئی ہے۔



بیوٹی بکس کا تیار کردہ

# سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرہے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- سے بال کاگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت = 100 روپے

**سوہنی ہیر آئل** 12 بڑی بوتلوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تجویز مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ یہ بازار میں بائیس دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دینی خریدنا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف = 100 روپے ہے، دوسرے شہروں والے مٹی آڈر بھی کر رہے ہیں یا رسل سے منگوائیں، ہر جڑی سے منگوانے والے مٹی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے = 250 روپے
- 3 بوتلوں کے لئے = 350 روپے

**نوٹ:** اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

**منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:**

بیوٹی بکس، 53- اورنگزب مارکیٹ، سیکٹر فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی  
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان چیکبو

سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگزب مارکیٹ، سیکٹر فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

”اور اور“ مٹی گردان لگائیں۔  
یہاں تک کہ ایک صبح ماں کی طبیعت خراب ہو گئی۔ وہ فجر کا وقت تھا۔ شفاعت بھانماز کے لیے وضو کر رہے تھے کہ ماں کے ”شفو“ کہنے پر بھاگے گئے تھے اور پھر ذرا کی ذرا دیر میں وہ ماں کو اسپتال لے کر بھاگے تھے۔ وہ آئی سی یو میں تھیں۔ ڈاکٹر وجاہت میرا کہہ - تمام کے بولے۔

شفاعت بہت باہمت اور جینوں سے ہے۔ میں نے اس سے پندرہ سال پہلے کہہ دیا تھا کہ اس کی ماں کے پاس چھ سات ماہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس لڑکے نے مجھے بھلا دیا۔ کہتا تھا ”میری ماں بہت جیے گی میرا دل کہتا ہے اور میرا دل بہت کم غلط کہتا ہے۔“ اس نے رپورٹس ٹیکل پر پھینک دی تھیں اور کہا تھا ”میں مانتا ہوں ان رپورٹس کو۔۔۔ میرا اللہ سب سے بڑا معالج ہے۔ آپ دوا میں لکھ دیں پر میرا بتا دیں۔ پھر دیکھیے گا کہ مٹی آپ کی مسیحائی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ نور العین بھابھی صوفے پر بیٹھی روئے جارہی تھیں۔ ”ان کو تو زندگی کی خبر نہیں۔ ماں کی آنکھوں سے دیکھتے ماں کے کانوں سے سنتے ہیں۔ میں سمجھتی تھی ان کے کہنے اور سننے اور دیگر معمولات اپنے ہاتھ میں لے لوں گی تو وہ بھی میرے ہاتھ میں آجائیں گے، مگر مجھے تو پرسوں بتا چلا، میرے استری کرنے سے پہلے وہ ماں سے پسند کروا کے آتے تھے۔ میں چوز کیے ہوئے کپڑے استری کرنے بیٹھتی تو وہ میری چوائس میں کوئی نہ کوئی خامی نکال دیتے۔ کبھی کسی شرٹ کا بٹن توڑ کر، کبھی کوئی دھبہ لگا کر اور خود ماں کی منتخب ہوئی شرٹ اور پینٹ پیش کر دیتے اور میں سر جھکا کر بے وقوف بن جاتی۔ راحت! انہیں تو اپنے جوتے کے تے بھی باندھنے نہیں آتے۔ اگر ماں کو کچھ ہو گیا تو ان کا کیا ہو گا۔ میرے شفاعت کا کیا ہو گا۔“

میں حیران نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ تین سال میں اہل بھائی ان کی زندگی سے غائب ہو گئے تھے۔ ماں پر ایسٹ روم میں شفٹ کر دی گئی تھیں۔ وہ ساری زمینوں کا حساب کتاب کرنے بیٹھ گئیں۔ اس

جس طرح سنبھالا ہے، سہارا دیا ہے، میری دعا ہے، میرا اللہ تجھے نہ دنیا میں ناکام کرے نہ آخرت میں۔۔۔“ شفاعت بھانما آکھوں سے مسکرا دیے۔  
”دنیا کے لیے کون بیٹتا ہے۔ رہی آخرت تو آپ کی ممتا نے خود بخود سنواری ہے۔“  
میں پیچھے رہ گیا۔ شفاعت بھابھی پھر پیشہ کی طرح آگے نکل گئے۔



نور العین اگلی بیٹی تھیں، مگر گھر میں بھابیوں کا اتنا ٹیکا تھا کہ اپنے گھر میں تیرے درجے کا شہری بننے سے بہتر انہیں شفاعت بھابھی کی بیوی بننا ٹھیک لگا۔  
ایک جمعہ کو ان کا نکاح سادی سے ہو گیا۔ وہ اٹھ کر شفاعت بھابھی کے کمرے میں آ گئیں۔ بچوں کو ماں نے سنبھال لیا۔ اجمل بھابھی کے تھوڑے تھے اس لیے نور العین بھابھی کبھی اختلاف کر سکیں نہ اپنی من مانی، مگر شفاعت بھابھی نرم دل اور ٹھنڈے مزاج کے تھے، اس لیے وہ روز کسی نہ کسی بات پر ہنگامہ اٹھائے رکھتیں۔ ماں صدمے میں رہیں۔  
”میں نے شفاعت کی زندگی تباہ کر دی۔“ ایک یہ غم تھا اور ایک یہ غم کہ ”میرا اجمل کتنی اذیت بھری زندگی جی کر گیا۔ کچھ بھی تو اچھا اور من مرضی کا نہیں دیکھا۔“  
انہیں یہ غم لگا اور پھر یہ غم بڑھتا گیا، کیونکہ نور العین بھابھی شفو بھابھی سے اس بات پر لڑتی تھیں کہ وہ ”مازا بوائے“ ہیں۔

انہیں ان کی تیاری سے لے کر سوچ بیکت اپنی اجارہ داری چاہیے تھی، مگر یہ ایک واحد بات تھی جس پر شفاعت بھابھی کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔  
”ماں نے وہ بیوی ہے تیری حق بنتا ہے اس کا۔“  
ماں نے سمجھا۔ پھر وہ ڈرنگ ان کی مرضی سے کرنے لگے، مگر جوتوں کے تے اب بھی ماں سے بندھوا تے، ناشتا، کھانا ماں کے ساتھ کھاتے، نور العین بھابھی چڑچڑی ہو گئیں۔ جتنا وہ مانتے، اتنا

”شفاعت اور راحت ہیں ناں! کسی سے بھی کر دیں ان کی شادی۔۔۔ لیکن اگر کسی نے پھر عنایت کا نام لیا تو جان سے مار دوں گی۔“  
ماں بے یار و مددگار سی بیٹھی تھیں۔ ان کے آنسو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں گھٹتے تھے۔ میں گھر کے ماں کے پاس سے اٹھتا بھی نہیں تھا۔ مجھے لگتا تھا، جہاں میں اٹھا وہیں ماں مرا جائی گی۔ تب ہی ماں نے میرے ہاتھ تمام کیے۔

”راحت! تو کر لے ناں، نور العین سے شادی۔ آج تک میں نے کبھی تجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ ماں جا ناں۔۔۔“  
میں کرٹ لگنے کی رفتار سے اٹھا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ مجھے صبحی یاد آنے لگی جس نے شفاعت بھابھی کی طرح ہر اچھے، برے میں مجھ پرے کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔

”میں اسے کیا تاکر چھوڑوں۔۔۔؟“  
”میں ماں کے آگے ہار گیا۔“  
”مجھ میں بہت نہیں کہ میں ماں سے تمہاری بات کروں۔“

”سنو! مجھے تم سے محبت نہیں۔“  
رات بھر میں سگریٹ پھونکتا رہا۔ چلے سوچتا رہا پھر زندگی میں پہلی بار فجر کی نماز پڑھ کر میں اپنے ڈھتھ سر شفیقت ”بر دستخط کرنے کے خیال سے ماں کے کمرے میں داخل ہونے والا تھا کہ میں نے شفاعت بھابھی کا دم آواز سنی۔

”راحت کو کچھ مت کہیں۔ وہ کسی کو پسند کرتا ہے۔ اس کے راتے میں ہمیں اپنی خواہش کا اتنا بڑا پھر نہیں رکھ دینا چاہیے کہ نہ وہ آگے جا سکے نہ پیچھے نہ اپنے ساتھ انصاف کر سکے نہ نور العین کے ساتھ۔“  
میرا دل صاف ہے۔ یہاں کوئی آباد نہیں۔ مجھے اجمل کی عزت کو عزت سے رکھنے کا ہنر آتا ہے۔  
ماں شفاعت بھابھی کے دل کے ساتھ اور بے آباد ہونے پر دھاڑیں مار مار کر روئی تھیں۔  
”شفاعت جب بھی پھر وقت پڑا ہے تو نے مجھے



دن مجھے پتا چلا شفاعت بھیا نے اپنے نام کبھی کچھ لکھا نہیں تھا۔ سب ہم بہن بھائیوں میں برابر برابر تقسیم تھا۔ اماں نے خیف آواز میں کہا۔

”یہ اس کی خواہش تھی۔ کتنا تھا اماں! مجھے آپ کی محبت مل گئی۔ سمجھوں گا، دنیا اور آخرت دونوں مٹھیوں میں قید ہو گئے۔“ میں رونے لگا اور اماں نے میرا ہاتھ تھام کے کہا۔

”تم ساری زندگی سمجھتے رہے، مجھے حکمرانی اور شفاعت کو دولت کی طلب ہے تو تم نا سمجھ تھے۔ تمہارے اماں کے دن رات کے شاہانہ فیصلوں کی وجہ سے میں نے تم سب راتنی تختی رو رکھی۔ اگر میں بھی نرم اور بے عمل ہو جاتی تو تم میں سے کوئی بھی آگے نہ پڑھ سکتا۔ باقی خاندان کے بچوں کی طرح ڈنڈے بجاتے، بوتیاں چٹکاتے پھرتے۔ شفاعت میرا بیٹا تھا مگر اس نے ایک دوست، ایک بٹی کی طرح میرا خیال رکھا۔ وہ یہی کتنا تھا! اگر کسی مرض کے لیے کڑوی دوا دینی پڑے تو اماں! دینی چاہیے۔ میں آپ کی پشت پر ہوں۔ آپ جو چاہو کرو، میں دیکھ لوں گا، میں سنہال لوں گا۔“ اور جب وہ یہ کتا میں دیکھ لوں گا، میں سنہال لوں گا تو مجھے لگتا، میں کسی گھرے سائبان کے نیچے کھڑی ہوں۔ نیک اور فرماں بردار اولاد سائبان کی طرح ہی تو ہوتی ہے۔“

میں رونے لگا پھر جب میں کمرے سے باہر نکلا تو ریحہ خالہ اماں کی واحد سگی بہن باہر بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی رونے انداز میں مدھم بولیں۔

”تمہاری ماں ایک بہادر عورت ہے۔ اس نے دنیا سے لڑ کر، رسم و رواج سے بغاوت کر کے، تمہارے لیے بہتر مستقبل کی امید باندھی۔ لوگوں نے کہا عشاقی کرلو۔ معاشرے میں چلنے کے لیے مرد کا آسرا بہت ضروری ہے تو وہ ہر ایک سے لڑ پڑی تھی۔ اس نے کہا، مجھے میرے اللہ کا آسرا اور میرے بچوں کی محبت کافی ہے۔“

”بچوں کی محبت؟“ میرے آنسو اور روانی سے گرنے لگے۔ عنایت بھیا اور میں کہاں کھڑے تھے؟

میرے سینے سے چیخیں نکلنے کو بے قرار تھیں۔ وہ منہ بولیں۔

”حسن اکبر بڑے من موجی اور پیسے خرچ کرنے میں ہر فن مولا تھے۔ جتنا کھاتے تھے اس کو لٹانے کے لیے بھی راستے ڈھونڈ لیتے تھے۔ پورے خاندان میں ان کی عاشق مزاجی مشہور تھی، مگر یہ تھا، وہ کسی پر جتنی جلدی پاگل ہوتے، اتنی ہی جلدی ان کا بھوت اٹھاتا۔ اور لوٹ کر مجھ کے پاس ہی آتے۔ مجھ نے بھی کبھی انہیں نہیں دھکارا۔ ہوش اپنے سینے سے لگایا۔ کبھی کبھی میں اس کے صبر پر جی پڑتی اور وہ یہ ہی کہتی ”معاف نہ کروں تو اور کیا کروں۔ واسطہ اٹھا پڑا دیتے ہیں، ایسے روتے ہیں، گھر گڑاتے ہیں کہ میرا دل پیچ جاتا ہے۔“ جب وہ بستر مرگ پر پڑے تو دو تین عورتوں نے ان کی بیوی ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ وہ بول سکتے تھے۔ نہ سن سکتے تھے، یہی وجہ تھی میں نے مجھ کو مشورہ دیا سب کچھ اپنے نام لکھوا لو، مگر بعد میں مشکل نہ ہو۔“ ”وہ عورتیں؟“ مجھے اپنے لفظوں کی نفی الٹی کی طرح اپنے کلیجے میں جھپتی محسوس ہوئی۔ وہ نفرت سے بولیں۔

”جھوٹی تھیں بے غیرتیں۔ تمہارے اماں کی رنگین طبیعت کا فائدہ اٹھانا چاہتی تھیں، مگر تمہاری اماں کے چند سوالوں کے آگے ہی نہ ٹک سکیں۔ بھانڈا پھوٹ گیا ان کا تو چلتی بنیں۔“ میں اماں کے پاس پھر سے جانا چاہتا تھا مگر نہیں جا سکا۔

اور شفاعت بھیا نے سسلی آپا اور عائشہ کو بلا بھیجا۔ میرا دل ٹھنک۔ میں سمجھ گیا کہ اب شفو بھائی کا دل کیا کتا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور رونے لگا۔

اور واقعی تیسرے دن اماں کو ایک اور انیک ہوا۔ وہ ہم سے جدا ہو گئیں۔ شفاعت بھیا خاموش بہت بن گئے۔ اماں کے سرہانے سے ایک بار بھی نہیں اٹھے۔ سعید بھائی، شیراز بھائی نے رلانے کی کوشش کی، مگر نہ روتے تھے نہ سوتے تھے۔

اماں کا چالیسواں ہو گیا۔ چالیسویں کے بعد اماں سے

کمرے کو چھڑا گیا تو ایک کس پر سب کی آنکھیں ٹپ کر رہ گئیں۔ عنایت بھائی نے صنفی بھائی کے کتے پر بکے کا تالا ڈالا اور صنفی بھائی کا منہ بن گیا۔

”یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ اتنا بڑا دھوکا۔“ میں نے چیز نظروں سے اٹھیں گھورا اور نورالعین بھائی، شفاعت بھائی کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئیں۔ شفاعت بھائی جیسے نکلے جاتے اور رونے جاتے۔

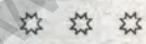
میرے کھلونے، عنایت بھائی کا پرپ کا بہترین نمبروں سے پاس ہونے کا زلزلہ کارڈ، آجمل بھیا کے اسکول میں ایوارڈ لینے کی تصویر، سسلی آپا کی کبھی سی فرائڈ، عائشہ بادی کی چھوٹی سی جوتی، جسے بہن کو وہ پہلا قدم اٹھانے کے قابل ہو میں اور سب سے آخر میں سسلی آپا کا ناز دکھ ان کی بیوی کا سفید دوپٹا۔

بکس خالی ہو گیا اور شفاعت بھیا کے مجتے میں پہلی بار تحریک ہوئی۔ وہ کچھ نہیں بولے۔ بس رونے جا رہے تھے۔

”میرے لیے کچھ نہیں، میرا کچھ بھی نہیں۔“ مجھے وہ سانیکو لگنے لگے تھے۔ تب ہی میں نے انہیں سینے سے لگایا۔

”نشانی ان کی رکھتے ہیں، جو آپ سے دور ہوں۔ جو دل کے قریب ہوں، سانس کی طرح ہر وقت دھڑکن میں شامل ہوں، ان کی نشانی رکھنے کا فائدہ۔“

یوں لگا اس جملے نے ان کے اس لمحے کے احساس محرومی کو چھو لیا تھا۔ وہ چپ ہو گئے۔



اور رات گئے نورالعین بھائی میرے سامنے بیٹھ کر رونے جاری تھیں۔

”اماں نے اتنی علوتیں خراب کر دی ہیں ان کی کیا کریں گے وہ؟ کیسے جھن گے ان کے بغیر؟ انہیں تو اپنے جوتوں کے تھے تک باندھنے نہیں آتے۔“

میں صبح اٹھا۔ آج چالیسویں کے بعد وہ پہلی بار آنکس جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ بھائی ناشتا بنا

رہی تھیں۔ تب ہی انہوں نے سسلی آپا کو کہا۔ ”درا چالے دیکھنا۔ میں ان کے جوتوں کے تھے باندھ آؤں۔“ سسلی آپا چولے کے پاس گئیں۔ نورالعین بھائی دروازے سے باہر بھی نہیں نکلی تھیں کہ وہ ڈانگ ٹیبل پر آکر بیٹھ گئے۔ ان کے کتے بندھے ہوئے تھے۔

”وہ بہت ماہر سائیکلرٹس ہے۔ اس نے اپنی ماں کو ہر کام میں، گھر کے چھوٹے سے چھوٹے کام میں اتنا انوالور کھا کہ وہ اپنی بیماری کی طرف توجہ دے سکیں نہ اس غم کو دل سے لگایا کہ وہ بچوں کے جوان ہونے پر عضو معطل ہو گئی ہیں۔ بہت کم بچے اس طرف توجہ دیتے ہیں۔ خاص طور پر بیٹے تو اور کم۔“ میرے دماغ میں ڈانڈا نکل کے جملے گونج رہے تھے۔ میں بھاگ کر اٹھا اور ان کے سینے سے لگ گیا۔

”آج میری ہر نفرت آپ کی محبت کے آگے باطل ہے۔ اگر آج کوئی کتا ہے کہ اماں صرف شفو کی تھیں تو میں کسوں کا، یہ ان کا حق ہے، کیونکہ شفو بھی تو صرف اماں کا تھا۔ وہ جتنا اماں کا تھا شاید خود اپنا بھی اتنا نہیں تھا۔“

شفو بھیا کی آنکھیں بھگ گئیں۔ نورالعین بھائی نے ان کے کانڈھے پر ہاتھ رکھ کر محبت سے کہا۔ ”اماں نہیں ہیں تو کیا، میں اماں کی چوائس کے مطابق آپ کی ڈریسنگ کا خیال رکھوں گی۔ شاید وہ مجھ سے خوش ہو جائیں۔“ شفاعت بھیا نے محبت سے انہیں دیکھا اور نرمی سے بولے۔

”وہ تم سے ناراض نہیں تھیں۔ کبھی ماں اپنی بیٹیوں سے ناراض ہوتی ہیں، اگر ہوں بھی تو ان کا غصہ یوں رفع ہوتا ہے۔ یوں۔“ انہوں نے اٹکیوں سے چٹکی بھائی۔ نورالعین بھائی مسکرانے لگیں اور میں نے دعا کی تھی کہ یہ مسکراہٹ سد اماں کی دعا بن کر شفو بھیا کی زندگی کو سنوارتی رہے۔







سونے جانے کی کیفیت میں بہت دیر تک تو عمیمہ ہی سوچتی رہی کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے؟ بالآخر آنکھیں کھلیں تو ہن جاگا تو سرانے پر سیل فون گنگنا رہا تھا۔

”نمو کا ٹنگ“ نمو اس کی جیٹھانی تھی۔ عمیمہ سے اچھی خاصی گپ شپ بھی۔ کال اینڈ کرنے بھی نہ پائی تھی کہ یا ہر دروازہ پر گھنٹی بجی۔ لگتا تھا کوئی ہاتھ رکھ کے بھول گیا ہے۔

”نمو! ایک منٹ میں دروازہ کھول آؤں۔“ سیک سے ہے تا تمہارا۔“ کہہ کر اس نے موبائل بیڈ پر بھینکا اور تیزی سے دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھی۔ گیٹ پر صفائی والی ماسی تھی۔

”سلام بی بی جی۔“ عمیمہ کو دیکھتے ہی اس نے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام“ عمیمہ واپس پٹی۔ ”دروازہ بند کر دو بلکہ چچی لگا دو۔“ بغیر دیکھے اس نے کام والی ماسی کو مخاطب کیا۔ دوسرا قدم اٹھایا بھی نہ تھا کہ لینڈ لائن پورے زور شور سے بج اٹھا۔ عمیمہ کے بڑھتے قدم رگ گئے۔ لاؤنج والا سیٹ خراب تھا۔ اس نے کارڈیس اٹھایا اور سامنے بیڈ روم میں داخل ہوئی۔

”ہیلو السلام علیکم! کون؟“

عمیمہ سیل فون، اور اس پر ہولڈ کروائی گئی نمو کی کال کو بھول گئی۔ اس نے ٹائٹس پسائیں اور کارڈیس کلاں پہنا۔

”وعلیکم السلام! حبیبت بات کر رہی ہوں۔ سو تو نہیں رہی تھیں۔ گھنٹہ بھر تیل ہوتی رہی ہے۔“ حبیبتہ نے حنفی سے کہا۔

حبیبہ کی آواز سنتے ہی اس کے اندر سکون کی لہر دو گئی۔ اس کی فرسٹ کزن کلاس فیلو دوست، بڑی کون سا رشتہ اور کون سی یاد اس سے وابستہ نہیں تھی اب حبیبتہ کا نمو کے بھائی سے دو ماہ پہلے ہوا ہو چکا تھا۔

”جی جناب! کیا حال ہے۔ پورے سولہ دن کے بعد فون کیا ہے۔“ عمیمہ نے خوش دلی سے کہا۔

”کیا پوچھتی ہو۔ مصروفیت ہی مصروفیت۔ کام کام اور بس کام شادیوں خانہ آبادیاں اور ہمارے لیے نری برادیاں۔“

”کیا ہوا؟ کس کی خانہ آبادی اور کس کی خانہ برادیاں ہو گئی؟“ عمیمہ نے پوچھا۔

”کچھ ہماری سرال میں اور کچھ تمہاری سرال میں۔“ حبیبتہ نے دل جلے انداز میں کہا۔ عمیمہ نے اختیار نہس پڑی۔ پچھلے دنوں واقعی ریکارڈ توڑ شادی ہوئی تھیں۔

”رہی بات خانہ برادیاں کی تو۔ خاتون محترم ”مر“ تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے۔“ اتنا دل لگا کہ اپنے آپ کو ہنسنا سوار کے بار بار سے تیار ہو گئے جب اس امید پر شادی ہال میں پہنچے کہ صاحب ہمار بھی آئے ہیں ملاقات کے چانسز سو فیصد ہوں گے تو پتا چلا ان کے ہاں بھی ایک عدد ”حکومت آبا“ پائی جالی ہیں ہستے ہوؤں کو رلانے والی نمو ٹیکم۔ ایسے تھے اپنے بچو گنروں میں مصروف رکھا کہ کچھ پتا نہ چلا کہ دلہن آئی اور کب گئی۔ بس یہی رٹے رٹائے فقرے حبیبتہ جانی! ذرا سید کو تو پکڑنا۔ گود میں کر فیڈر پلانا۔ فیڈر زیادہ اوپر نہ کرنا۔ ایک دم اچھوٹا جائے گا۔

حبیبہ جی! یہ آفت کی پڑیا سلونی کی فراک تو چچی کرو۔ خراب ہو گئی ہے۔ ذرا دھیان سے اس کو

خیال تھا کہ اوھر سے لنگا ہو جائے گا۔ ابھی آرڈر آئے ہیں کہ لنگا تو بعد میں استعمال کے قابل نہیں رہتا۔ حق حلال! کی کمائی کا پیسہ ایک ہی فنکشن میں برباد کر دینا کہاں کی عقل مندی ہے! لہذا اولیہ میں بھی اوھر کا فراک ہی ہو گا۔ بس کمر اور ڈیزائن میں فرق ہو گا۔“ حبیبتہ نے دھکے سے کہا۔ یہ تو عمیمہ جانتی تھی کہ اسے ہر فن فیرو دلہن بننے اور لنگا مینے کا کس قدر شوق تھا۔ وہ اس کے دل کی کیفیت، خوبی جانتی تھی۔ پھر بھی اس کا غم ہلکا کرنے کو پوچھا۔

”کس نے منع کیا لنگا مینے سے؟“

”آپ کی جیٹھانی، نمو ٹیکم نے۔“ حبیبتہ نے جل کر کہا۔

”نمو نے؟ وہ ایسے کیوں کہے گی؟“ عمیمہ نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ بھی آپ اپنی زہرہ آپا سے پوچھیں۔ شاید انہوں نے اسے اپنی شادی پر اس کی پسند کے لباس سے روکا ہو گا۔ اس لیے یہ مجھ سے بدلہ لے رہی ہے۔“

عمیمہ نے اپنے بیڈ روم سے باہر نظر دوڑائی۔

”بہت چھٹی ہے۔“ حبیبتہ ساری داستان سناتے سناتے رونے لگی۔ آواز دھکی ہو گئی۔ عمیمہ نے پڑی۔ کوئی بات نہیں۔ اکلوتی بھابھی ہو۔ اتنا تو حق ہے۔

”خاک حق ہے۔ ابھی تو ان کے گھر نہیں گئی۔ پھر تو شاید ابھی کی شکل بھی نہ دیکھنے دیں۔ تمہیں کیا پتا، کتنی آرزو میں انگلیں اور شادی ہال سے سیدھے کسی پارک میں جانے کا خواب لے کر گئی تھی۔ تم بتاؤ! نمو تمہارے ساتھ بھی ایسی ہی ہے۔ تمہاری بھی تو سرسالی رشتہ دار ہے۔ تمہاری جیٹھانی صاحبہ۔“

حبیبہ نے ”جیٹھانی“ لفظ خوب چبا کر ادا کیا۔ ”اونچ نیچ تو سرسالی رشتوں میں چلتی ہے۔ اصل میں نمو خود بہت اچھی ہے۔ ہمارے یہاں بھی ”حکومت آبا“ پائی جاتی ہیں۔ زہرہ آپا۔“ عمیمہ نے اپنی بڑی بیوہ مند کا نام لیا۔ ”وہ میرا تو پھوپھی بھابھی ہونے کے ناطے کچھ لحاظ کر لیں کہ کتنی ہے، لیکن نمو کے ساتھ خوب تو تکرار ہوئی ہے۔ نمو کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے میاں یعنی اظہر بھائی دینی ہوتے ہیں سارے مسائل اسی کو سامنا کرنا پڑتا ہے لہذا یہاں بھی اکثر معاملہ خراب ہو جاتا ہے۔“ عمیمہ نے وضاحت کی۔

”لیکن زہرہ آپا تو بڑی خوش اخلاق اور باوقار لگ رہی تھیں۔ شادی میں کتنا اچھا استقبال کر رہی تھیں سب کا۔“ حبیبتہ شاید اس کی وضاحت سے مطمئن نہ ہو سکی تھی۔

”ظاہر ہے! باوقار تو وہ ہیں۔ جو عورت جوانی میں بیوہ ہو جائے اور وہ اپنی عزت و عصمت کو بچا بچا کر رکھے اس میں ایک غیر محسوس رعب و دبہ تو خود بخود آ جاتا ہے خیر! چھوڑو تم بتاؤ ہم نے اپنی شادی والا ڈریس بننے کے لیے دے دیا۔“ عمیمہ نے گفتگو کا موضوع بدلا۔

”میری طرف کا تو میرا نے فراک ہی بنوایا ہے۔ میرا





شاید کام والی ماسی سے کوئی چیز لوٹی تھی۔ اس کی کسی سے بات کرنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے حبیہ سے پوچھا۔

”حبیہ! یہ کب ہے نافون پر؟ ایک منٹ۔ یا ہر کوئی آیا ہے شاید۔ میں دیکھوں۔“ اور یہ کہتے ہی عمیمہ کے چوہہ طبق روشن ہو گئے۔ دروازے میں زہرہ آیا کھڑی تھیں۔ بے اختیار اس نے ہاتھ بڑھا کے کارڈ کیس کاٹن آف کرنا چاہا۔

”فس۔“ فوراً یاد آیا کہ وہ نمرو کو ہولڈ کرنا دروازہ کھولنے گئی تھی۔ اس نے بے تابی سے سیل فون اٹھایا۔

”ہیلو۔ وہ نمرو میں۔“ عمیمہ ہچکائی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا، نمرو نے کال آف نہیں کی تھی۔ ابھی تو وہ آسمان سے بھی نہیں گری تھی۔ سمجھو میں اگلنے کا مرحلہ تو بہت دور تھا۔ اس کی ہیلو کی آواز سن کر نمرو نے کال منقطع کر دی۔ کارڈ کیس بھی دوسری طرف سے آف ہو چکا تھا یا شاید بجلی چلی گئی تھی۔

”زہرہ آیا! آپ کب آئیں؟“ اس نے اگلنے اگلے پوچھا۔

”تم نے شاید دیکھا نہیں۔ میں کام والی ماسی کے پیچھے ہی اندر داخل ہوئی تھی اور لاؤنج میں تھی اس وقت سے۔“ عمیمہ بری طرح سے گڑبگڑائی۔ کیا کہے اور کیانہ کہیں نمرو بات سن نہ لی ہو۔

عمیمہ کا دل چاہ رہا تھا، چیخ کر روئے۔ آج حبیہ لی لی نے نمرو کو اور اس نے زہرہ آیا کو گڑا دیا۔ دونوں کے کانوں میں اس کے فقرے پہنچ گئے۔

وہ نظرس جھکائے بیٹھ گئی۔ کام والی ماسی چائے کی ٹرائل رکھ گئی تھی۔

”زہرہ آیا! چینی کتنی لیس گی؟“ اس نے چائے کے کپ کی طرف اشارہ کیا۔

”ایک منٹ۔ عمیمہ! ابھی نہیں۔“ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔

”آج تمہاری حبیہ سے پچیس منٹ کی گفتگو ہوئی

ہے۔ جو نہ چاہتے ہوئے بھی تمہاری غلطی سے مجھے سننا پڑی۔ تم نے سوچا اس گفتگو سے کتنے دل خراب ہوں گے؟ اس گفتگو میں سے کتنے الفاظ اوپر والے کی بارگاہ میں مقبول اور کتنے مردود ہوئے ہوں گے؟ یا فرض نمرو نے تمہاری پوری گفتگو نہ بھی سنی ہو مگر تمہاری گفتگو میں اس کے نام کی تکرار نے اسے کتنے بدگمانیوں کا شکار کیا ہو گا؟“

عمیمہ کا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ زہرہ آیا نے اسے پاس بٹھایا اور نرمی سے بولیں۔

”جس طرح تمہارے پاس پانچ ہزار یا ایک ہزار روپے کا نوٹ ہو۔ اس کا پیسج نہیں سے بھی مل سکتا ہے۔ ایک ایک روپے کا سکہ الگ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح میری تمہاری بلکہ سب کی زندگی خدا کے ہاں ایک نوٹ ہی کی طرح ہے۔ روز حشر میرا سچا منصف مسند پر بیٹھا اس زندگی کا ایک ایک سانس، چیخ کی شکل میں الگ کرتا جائے گا۔ سانسیں کی گنتی کرنا اس قادر مطلق کے لیے کیا مشکل کام ہے؟ یہ غیبتوں کے سانس ہیں۔ یہ چغلیوں کے۔ یہ ذکر الہی کے۔ یہ۔ یہ۔“ زہرہ آیا کی آنکھوں میں پانی جھلمل کرنے لگا۔

”اس نوٹ میں سے آج کے سانس الگ کر لو۔ کیا اس فون پر کوئی سانس کا آمد ثابت ہوا؟ خلق خدا کو کتنا نفع پہنچا؟ اگر اس ایک کال میں ایک سانس رب کی رضا کا نہیں تو زندگی بھر کے سانسیں کا حساب لگاؤ۔ میری بیٹی۔ میری بچی! زندگی کے اس نوٹ کی قدر کرو۔ اللہ کے لیے اسے ضائع مت کرو۔ ابھی بھی کچھ نہیں ہوا۔ نمرو سے کھلے دل سے معافی مانگو۔ وہ دل کی بہت اچھی ہے۔ دلوں میں بال آجائے تو محبت میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ بلند بوس عمارتیں شکستہ ہو جاتی ہیں اور آئندہ کے لیے پیسج کا نہیں۔ دل کا سوچنا۔ وہ تو خراب نہیں ہوا۔“

عمیمہ بس آنسو پونچھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ زندگی بھی ایک پیسج ہے۔!!!



# صحیح ذوق

چھن چھن چھناک

پچن سے ٹوٹے برتنوں کی فریاد نے لاؤنج میں بیٹھے  
مہمانوں اور میزبانوں کو چونکا دیا۔ کسی نے کانوں پر ہاتھ  
رکھ کر اوجھ۔ آئے ہائے کے لرے لگائے مگر مائی نے  
اٹھک بیٹھک کے ذریعے ناگواری کا اظہار کیا۔ گھبرا کر  
کھڑی ہو گئی تھیں۔ پھر بیٹھ گئیں۔ کھڑی ہوئیں۔ پھر  
معذرتی مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھیں۔ دل میں غبار  
اٹھ رہا تھا۔ پھر کچھ برسرِ پاکی باہر آئیں مگر پچن میں  
جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ نہ جانے کون سا دل شکن منظر  
سامنے آجائے۔

سب سے پہلے شہری ہی پچن میں داخل ہوا تھا۔  
”کیا توڑا؟“ حسب معمول طنز کا پیرایہ۔

مکمل ناول

”تمہارا سر نہیں، کم از کم۔“ اوہر ڈھٹائی انتہائی  
تھی۔

”اوہ۔ اچھا۔ اچھا۔ گلاس۔“ وہ سنک میں  
جھکا ہوا تھا۔ ”چار گلاس یعنی یک شد نہ دوشد، اکٹھے  
چار شد، خس کم جہاں پاک۔“

حساب کا ماہر تھا۔ کرسیاں تک گن کر تعداد معلوم  
کر لی۔ پیچھے سے ”اوہ“ کی آواز کے ساتھ اسمانے اپنی  
آند کا اعلان فرمایا۔

”می نے پوچھا ہے، کیا پورا سیٹ شہید ہو گیا؟  
انہیں غصہ آ رہا ہے۔“

”نہیں اس کے سوا اور آتا بھی کیا ہے؟“ سنک  
سے گلاسوں کی کرسیاں چنٹی ہوئی صاعقہ نے تنک کر





جواب دیا۔  
”اور تمہیں۔۔۔ برتن توڑنے کے علاوہ اور بھی کچھ آتا ہے؟“ شہری سوچتے ہوئے اندازہ لگانے لگا۔ ”چار گلاس۔۔۔ بھلا کتنے کا نقصان ہوا؟“  
ہونٹوں پر انگلی مارنا، پلکیں پٹپٹانا ہوا زہر لگ رہا تھا۔ دل میں ایک پھڑپھڑ سید کرنے کی انتہائی کوشش کو دل میں دبائی ہوئی وہ پیشے کے ٹکڑے اور کچیاں بڑی مہارت سے چن کر ڈسٹ بن میں ڈال رہی تھی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہی تھی۔

اسا ہونٹوں کو دائرہ کی شکل بنائے کتنی دیر تک یوں ہی کھڑی رہی۔ سکتے کے عالم میں۔۔۔ ایکٹنگ سراسر۔۔۔ اس گھر کا ہر فرد اچھا خاصا اداکار تھا۔  
نغمہ بھلا پیچھے کیوں رہتی۔۔۔ سیپیلوں کا منڈپ چھوڑ کر صاعقہ کی بے عزتی کا منظر دیکھنے آئی۔  
شہیار اور اساد دونوں کسی کی بھی عزت اچھال کر ہتھیلی پر رکھ دینے کے ماہر تھے۔ خصوصاً ”صاعقہ پر تو یہ وقت روز بلکہ دونوں وقت آتا تھا۔ وہ روٹی جلا دے۔ سالن میں نمک کم زیادہ ہو۔ چاول کچے رہ جائیں یا زیادہ گل جائیں۔ صاعقہ کی شامت آئی ہی رہتی۔“ غصے بن کی فہرست بن کر صاعقہ سر پر ہاتھ رکھ کر بچاؤ کے لیے سمٹ جاتی۔ گوکہ ابھی تک تو کسی نے بھی اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ ہاں! زبان کے تیروں کے جوہر خوب دکھائے گئے۔

جواب میں صاعقہ کا چہرہ دیکھنے کے لائق ہوتا۔ نغمہ کو یہ منظر پسند تھا مگر اس وقت۔۔۔ مہمانوں کی مروت، لحاظ میں اساتو صرف حیرت اور دکھ کا اظہار ہی کر سکی۔ شہری نے بھی شرافت دکھائی۔ نغمہ مایوس ہو کر لوٹ آئی۔

گھر میں کافی افراد تھے۔ ماموں، مائی، ان کی تین بیٹیاں اور لاڈ لایا بیٹا شہیار۔ سب تعلیم یافتہ تھے مگر کتنے نہ تھے۔ جابلانہ طور طریقے، بدنہائی، بے رخی، خود غرضی، انتہا کو۔ صاعقہ نے بھلا یہ انداز کب دیکھے تھے۔ اسے افسوس تھا۔ ماموں کے گھر کے چلن اس

قدر اذیت ناک ہوں گے معلوم ہوتا تو کیوں ضد کر کے آتی۔  
اس سے پہلے وہ خالہ کے گھر گئی تھی۔ واہ! خالہ تو واقعی خالہ تھیں۔ ماں سی۔ وہاں کے عیش و آرام خالہ کے گھر کا رکھ رکھاؤ، محبت، ان کے وجود میں ای جیسی خوشبو تھی۔ ان کی اولاد بھی انہی جیسی تھی۔ محبت اور خیال کرنے والی۔ مگر خالو جان بہت اکھر، مغشور اور ہٹ دھرم تھے۔ وہ کسی جاگیردار جیسے شان و شوکت والے نظر آتے تھے۔ ان کا سامنا کرنا شامت کو آواز دینا تھا۔

”اے لڑکی! ادھر کیا کر رہی ہو۔ بہت نازک اور قیمتی چیزیں ہیں۔ یہ چھوٹے کے لیے نہیں ہیں۔ ٹوٹ سکتی ہیں، ہٹ جاؤ۔“ وہ توان قیمتی اشیاء کی صفائی کر رہی تھی خالہ جان سے اجازت لے کر۔  
”اے لڑکی! ادھر آؤ۔ لان میں تمہارا کیا کام ہے۔ دوڑیں لگا رہی تھیں۔ گھاس کاٹنا س کر دیا۔ پیرس سے منگائی ہے یہ گھاس۔ تمہارے باپ دادا نے بھی نہیں دیکھی ہوگی، اتنی قیمتی ہے۔“  
اگر صرف رعوت کا لہجہ ہوتا تو برداشت کر لیتی مگر انہوں نے تو اس کا کان اس زور سے سمجھا کہ اس کی سسکی نکل گئی۔ غصہ غالب آگیا۔ کان چھڑا کر دور ہوئی اور چیخ کر بولی۔  
”کھانے کے لیے لگائی ہے، پھر کھاتے کیوں نہیں؟“

انہیں لال پیلا ہوتا دیکھا تو اندر بھاگی اور نہ نہ پھلانگی اور پہنچ گئی۔ یہ جگہ پر امن تھی۔ خالو جان گھٹنوں کے دردی وجہ سے اوپر نہیں آسکتے تھے مگر جانتی نہ تھی۔ ان کی یادداشت گھٹنوں کی طرح کمزور نہ تھی۔

خالہ جان کے بلانے پر جوں ہی کھانے کی میز کے قریب آئی۔ خالو جان ایک پیٹھکے سے کرسی سے کھڑے ہو گئے اور چلائے۔  
”یہ لڑکی یہاں کیوں آئی ہے۔ بدن زبان، بد تمیز!“

خالہ جان ہکا بکا ہو گئیں۔ وہ خود بھی ہونٹیں بنی کھڑی تھی۔  
”صاحبہ! وہ پھر۔۔۔“ ”اے کچن میں کھانا دیا کرو۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔“  
خالہ جان نے سہولت سے کہا۔ ”اچھا! چھاپہ کچن میں ہی کھائے گی۔ آپ تو بیٹھیں۔“ وہ خالو جان کو اسی طرح بھائی تھیں۔ جیسے وہ بچہ ہوں۔ اسے پھر غصہ آگیا۔  
”کچن میں ہی کھا لو گی۔ وہاں بھی یہی کھانا ہو گا۔ گھاس نہیں۔“

اور بھاگی۔ وہ جانتی تھی خالو جان کا اشارہ حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ آئندہ وہ روز کچن میں ہی کھائے گی کی ملازمہ نصرت کے ساتھ۔ کچن کافی کشادہ تھا اور بہت سجا سنا، میز، کرسیاں بھی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ اسے میز پر کھانا ملے گا یا نیچے فرش پر۔ پلاسٹک کی ٹولے کناروں والی پلیٹ میں خانا ملا کھانا لے کر کوارٹر جا چکا تھا۔ نصرت صاحب لوگوں کے کھانا ختم ہونے کے انتظار میں کبیری میں کھڑی تھی۔ اب اسے نصرت کے ساتھ کھانا ملے گا۔ اف اتنی ذلت! خالو جان کہیں کے بادشاہ ہیں یا راجہ مہاراجہ۔

خالہ جان کچن میں داخل ہو رہی تھیں۔ باہ! بے چاری خالہ جان کو میری وجہ سے نکال دیا گیا تھا۔ خالہ جان چولے کی طرف متوجہ تھیں۔ پھر پیالوں میں سالن، دال وغیرہ نکال کر میز پر رکھا۔ روٹی اور جاول۔  
”اے صاعقہ! پلیٹیں اٹھاؤ، کھاتے ہیں۔“ وہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”خالہ جان۔۔۔ آئے آپ۔“  
”بھئی۔۔۔ بھوک برداشت نہیں ہوتی مجھے۔ آؤ بیٹو! ہاں! اووں سے کباب بھی نکال لو۔“  
”آپ سب کے ساتھ کھا لیتیں۔“  
”کیوں بھئی، تمہیں میرے ساتھ کھانا اچھا نہیں لگتا۔ آؤ!“ اصرار کیا۔  
کھانے میں اس قدر لطف آیا کہ حد نہیں۔ خالہ

جان نے کچھ لطیف بھی سنائے۔ وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ ”خالہ جان! خالو جان کو پتا ہے کہ آپ یہاں۔۔۔“  
”ہاں بھی کہہ کر آئی ہوں کہ میں اپنی بھانجی کے ساتھ کھانا کھانے جا رہی ہوں۔“  
”خالہ جان! آپ بہت بہادر ہیں کیا؟“  
”تم سے کہہ۔ جو مرزا رعوت بیک کو منہ توڑ جواب دے۔ بہادر تو وہ ہے۔“  
”لیکن۔۔۔ وہ ناراض ہوں گے۔ آپ کیوں کچن میں کھائیں۔“ اسے خالہ جان کا انہیں دیا ہوا نام مزے کا لگا۔

”میں کہہ دوں گی چہاں میری بھانجی کھانا کھا سکتی ہے، میں وہیں کھاؤں گی اور یہ کوئی ذلت کی بات

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے  
بہنوں کے لیے 2 خوبصورت ناول

## دل کے موسم

مریم عزیز

قیمت 250 روپے

## گھگھے پاؤں

نگہت سیما

قیمت 250 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37، اردو بازار، کراچی



خواتین ڈائجسٹ فروری 2013 106



”دیکھو جی! نہ جانے کیا ہوا ہے کہ افتخار نے تو لپٹ کر کچھ پوچھا تک نہیں۔ ہم تو اس کی بہتری کا سوچ رہے ہیں۔ آخر یہ ہماری ہی بیٹی ہے۔“

ماموں پر ان الفاظ کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ خود صاعقہ کے پاس گئے۔ مامی ساتھ تھیں۔ انہوں نے سب کی دلی خواہش اور اپنی بھی تمنا کا اظہار کیا کہ وہ ان کی مرحومہ بہن کی بیٹی ہے۔ وہ اسے بہت چاہتے ہیں۔

”تم اچھی طرح سوچ لو۔“

”سوچنے کی کیا بات ہے۔“ مامی کا لہجہ شہد آگئیں تھا۔ اس سے لپٹ گئیں۔ ”میرے لیے تو یہ سب سے پیاری بیٹی ہے۔ میری اپنی بیٹیاں تو بدترام ہیں۔ یہی قربان پروار ہے۔ یعنی باپ کے گھر سے نکل کر خالہ کے گھر گئی۔ وہاں بھی چار دن نہ رہ سکی سکون سے۔ میں تو اسے کلجے سے لگا کر رکھوں گی۔ ہمارے سوا اس کا اور ہے بھی کون بس فیصلہ ہو گیا۔“

ماموں نے اسے گونگوش دیکھا تو کہنے لگے۔ ”ہاں“

ہاں مگر صبیحہ سے مشورہ کرنا ہو گا۔ افتخار کی اجازت بھی لازمی ہے۔“

”کوئی صلاح مشورہ نہیں ہو گا۔“ مامی چمک کر بولیں۔ ”یہ ہماری ہے تو ہماری ہے۔ منگنی ابھی کر لیتے ہیں۔ افتخار کے آنے پر نکاح اور شہریار کی جاب مل جانے پر رخصتی رہنا تو اسے اب یہیں ہے۔ ورنہ افتخار کبھی تو حال احوال پوچھتے۔“

وہ چپ بیٹھی بیچھتا لی رہی۔ ابا کی طرف سے یہ لاپرواہی بے نیازی نئی نہ تھی مگر اب۔۔۔ یہ نیا شوشہ جو چھوڑا گیا ہے۔ اب ابا کے گھر کی وہ چیں ہیں۔ بچوں کی ضدیں، شور شرابا، پچھو کی نصیحتیں۔

”بہیں کیا ضرورت ہے کچھ کرنے کی۔ تم کیوں ذمہ داری لوگی۔ کرنے دو فخر کو۔ اپنے بچے خود پالے۔“

فخرہ کا اصرار۔ ”صاعقہ! بھائی کو بہلا لو ذرا۔ میں سکون سے کھانا تو بنا دوں۔ ارے احمر کر جائے گا سنبھالو اسے۔ اوہو ذرا چھوٹی کے بال ہی بتادیا کرو۔ افسوس تم ذرا سی صفائی نہیں کر سکتیں۔ کتا بھی بیٹھتا ہے تو دم

ہلا کر جگہ صاف کر لیتا ہے اور تم کچرے کے ڈھیر پر کس بے تکلفی سے بیٹھی ہو۔ جھاڑو لگا دو گی تو۔۔۔“

”نہیں لگا سکتی جھاڑو، نوکر نہیں ہوں آپ کی۔“ وہ چلائی۔

پچھو کی ہدایت تھی اسے کسی سے دہنے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بھلا کیوں ڈرے۔ واہ جی یہ تو میری سگی ماں بن گئی ہیں۔ میں لاوارث نہیں ہوں۔ چلی جاؤں گی یہاں سے اور ابا۔۔۔ ان کو بھلا میری کیا پروا چھوٹے بچوں کے لاڈ اٹھایا کرتے ہیں۔ میری اہمیت ہی نہیں۔

”ابا۔۔۔ میں پچھو کے گھر جا رہی ہوں۔ وہیں رہوں گی اب آرام سے۔“

ابا پریشان ہو گئے۔ سمجھاتے رہے مگر وہ جو ارادہ کر لے اسی پر قائم رہتی تھی۔

”انتاد مزا کھانا بناتی ہیں آپ کی بیگم۔ شام چائے میں نہیں کھا سکتی۔“

”بیٹا! آج کل حالات ذرا۔۔۔ نوکری چلی گئی ہے۔ تلاش کر رہا ہوں۔ بس تکلیف کے دن تھوڑے ہیں۔ تم ذرا صبر سے کام لو پھر۔“

”ابا! پچھو کو فون کریں۔ وہ اگر مجھے لے جائیں گی۔“

ابا اس کی ضد کے سامنے مجبور تھے۔ فون اٹھایا۔ نمبر ملایا۔ وہ ان کے پاس کھس کر بیٹھ گئی۔ ابا نے بتایا۔

صاعقہ آپ کے پاس آنا چاہتی ہے۔ ادھر سے پچھو کی گھبراہٹ ہوئی آواز آئی۔

”ہاں! لڑکی کا دلغ خراب ہے کیا۔ یہاں کون سے بتائے بٹ رہے ہیں۔ جو وہ لوٹے آئے گی۔ لو اور سنو۔ میری مند کا تم کو پتا ہے۔ انہیں تمہاری بیٹی کے طور طریقے ذرا پسند نہیں۔ وہ تو مجھے کچا چبا جائیں گی۔ رو کو اسے۔“

”تپا! کیسے روکوں۔ وہ بالکل تیار بیٹھی ہے۔“

”کیوں تیار بیٹھی ہے۔ ایک لڑکی تم سے نہیں سنبھالی جاتی۔ مردہو افتخار! نہ مانے تو اس کی بٹائی کرو۔ یہ کیا سینہ زوری ہے۔ جب جی چاہا گھر سے نکل پڑی۔“

ابا تو باپ کی چھت، باپ کا گھر لڑکی کی مضبوط پناہ گاہ ہوتی ہے۔ اس گھر سے نکل کر کہیں بھی سکون نہیں ملے گا۔ کون حفاظت کرے گا۔ بولو، آپے سے باہر نہ ہوا تو اس کے لیے بہتر ہے۔“

ابا کے کندھے سے لگی وہ پچھو کی ایک ایک بات سن رہی تھی اور ہکا بکافون کو تنک رہی تھی۔

پچھو ہیں اس کی ہمدرد جو سوتیلی ماں کے ہتھ کنڈول سے بچانے کے لیے کیا کیا تدبیریں بتاتی تھیں۔ کیسے کیسے مشورے دیا کرتی تھیں۔ ابا نے فون رکھ دیا۔ شرمندہ تھے وہ کھڑی ہو گئی۔

”ارے ہاں، بھول گئی، خالہ جان کا فون آیا تھا۔ انہوں نے مجھے بلایا ہے۔ بس ٹھیک ہے۔ صبح مجھے بس میں بٹھاؤں۔ چار گھنٹے کا راستہ ہے۔ خالہ جان بس اسٹاپ پر آکر مجھے لے جائیں گی۔“

اس کے فوری فیصلوں سے افتخار بہت پریشان رہتے تھے۔ کسی کی سنتی نہ تھی۔ اگر زیادہ روک ٹوک کی جائے تو تو نے لگتی تھی۔ اپنی قسمت کو برا بھلا کرتی۔ افتخار اس کی ہر خواہش پوری کر دیتے تھے۔ اس کی خواہش پر صبح اسے بس میں بٹھا کر انہوں نے صبیحہ بیگم کو فون کر دیا۔ انہوں نے تو عجب کا اظہار کیا۔ نہ ہی کوئی اعتراض۔ بعد میں افتخار کی بات نے اس کے خالہ کے گھر جانے کی خبر سن کر تو خوب ابا کی خبر لی۔ جو اس فتنی کو قابو نہ کر سکے۔

”نہ جانے اپنی خالہ کے گھر جا کر کیا گل کھلائے۔ تمہیں بدنام کر دے گی افتخار! میں تو اس کے پیروں میں زنجیریں ڈال دیتی۔ اس کی مجال تھی گھر سے نکلے گی۔“

زنجیریں تو ماموں نے اس کے پیروں میں ڈالی تھیں۔ ابا کے گھر سے نکل کر پچھو کا نکاسا جواب سن کر خالہ کے گھر سے آکر اب ماموں کے گھر کے سوا اس کا اور ٹھکانا ہی نہ تھا۔ اسے واپس ابا کے گھر جانے سے اس کی انکا کو تھیں لگتی۔ اپنی ذلت وہ کیسے برداشت کرتی۔ ابا سے ماموں نے کیا بات کی۔ انہوں نے کیا جواب دیا۔ اسے خبر نہ ہوئی مگر گھر میں خوشیاں منانے کی تیاری نے جواب ظاہر کر دیا۔

ہائے اللہ۔ یہ کیا ہو گیا۔ ابا ماں گئے۔ پتا نہیں ماموں نے ان سے کیا کیا مگر منگنی کے دن سب بہنوں نے ڈانس کیا۔ شہریار کو خوب تنگ کیا اور ماموں نے اس کی انگلی میں پتلی سی سستی سی انگوٹھی پہنا دی۔

شہریار کا منہ پھولا ہوا تھا۔ اسے یہ رشتہ منظور نہ تھا مگر آئندہ جو فائدے وہ حاصل کر سکتا تھا۔ منگنی میں مہمانوں کی خاصی کم تعداد تھی۔ چند بیوی اور مامی کے تین چار رشتے دار۔ تصویریں بنائی گئیں اور چائے کے ساتھ نمکو، نمک پارے، سموسے اور تھوڑی سی گلاب جامن سے فنکشن منپا دیا۔ بعد میں وہ سبز و کاسنی چہرے کا خوب صورت سوٹ جو منگنی کے دن اسے پہننے کو دیا گیا تھا۔ نغمہ لے کر چلی گئی۔

”نہ میرا سوٹ تھا۔ اس میں تصویر اچھی آتی ہے۔ اس لیے تم کو پہنایا گیا۔ امی نے مانگا تو میں نے دے دیا۔ نئے سوٹ پر خرچا بھی بہت تھا۔“

”تم۔۔۔ اب میری اترن نہ ہوگی۔“ وہ حیران تھی۔

”تم نے میری اترن پہنی تھی۔ نیا تھوڑی ہے۔ میں ذرا احتیاط سے استعمال کرتی ہوں۔“

وہ چلی گئی اور صاعقہ کتنی دیر تک افسوس کرتی رہی۔ سوٹ کے جانے کا نہیں، نغمہ کی اترن پہننے کا۔ اس دن کے بعد سے اس کے ہاتھوں سے برتن تو اتر سے ٹوٹتے بکھرتے رہے۔ مامی پریشان تھیں۔ اختلاج قلب کا علاج کرانے کلینک چلی جائیں۔ روز صبح اسے مامی کا محبت بھرا لپکچر سننا پتا۔ برتنوں کی احتیاط، ٹوٹنے کی صورت میں صاعقہ کے زخمی ہونے کا احتیاج۔ ہاتھوں پر پٹیاں لگی ہوں تو کھانا بنانے میں وقت، کپڑے دھونے میں زخم بڑھنے کا خطرہ۔ وہ چپ چاپ سستی برتن توڑتی رہتی۔

منگنی کے بعد اسے سوچنے کی عادت پڑ گئی۔ ابا کا نہ آنا۔ خالہ جان کی طرف سے بھی کوئی اشارہ نہ ملا۔ ان کی غیر موجودگی نے اسے بہت دکھ دیا تھا۔ شہریار ذرا بد مزاج تھا مگر شکل صورت کا بہت اچھا تھا۔

چلو۔ منگنی کا کیا ہے۔ جب دل بے زار ہوا، انگوٹھی شہریار کے منہ پر مار کر۔ وہ نکمی سڑل



انگوٹھی، برائی فرسودہ اور مٹتی کے نام پر جو لٹو اس کے منہ میں ٹھونسا گیا تھا۔ پانی سخت اور کٹھا بھی تھا۔ مٹی ہونے لگی تھی۔ مگر ٹھونکنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ مجبوراً سانس روک کر حلق سے اتار دیا۔ جیسے بچپن میں اسے دوا پلاتے ہوئے اباتے تھے۔ سانس روک کر غٹ سے پی جاؤ۔ کڑوی نہیں لگے گی۔ اس نے غٹ سے وہ بے مزہ کھٹا لٹو حلق سے اتار لیا۔



آج نغمہ کی سہیلیاں تو آئی ہی تھیں۔ اس کے رشتے کے لیے بھی مہمان آئے ہوئے تھے۔ سب کے لیے چائے بنا کر سرو کرنا، پکڑے، سموسے، کباب، گاجر کا حلوہ، سب کچھ اس نے بنایا اور اب برتن دھونے کا سلسلہ کسی نے ذرا بھی ہاتھ نہیں بٹایا۔ سب کی سب مہمان بنی بیٹھی تھیں اور راحمہ وہ تو میک اپ میں تھری ایسی ہی لگیں، جیسے فی وی پر لڑکیاں لپی پٹی بناؤں شکل لیے بیٹھی رہتی ہیں۔

راحمہ کو امید تھی کہ آج آنے والیاں اس کے بجائے انہیں پسند کر لیں گی۔ اسی لیے وہ میک اپ کی حفاظت کی خاطر سرو اونچا کیے منہ اٹھائے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی تھیں۔ ہائے بے چاری، اسے غصہ آ رہا تھا۔ تھکن اور بے زاری اور سب کی بے حسی، پھر برتن توڑنا اس کا حق تھا، غصہ کہاں نکالے۔

”تمہارا دل نہیں دکھاتا تے پیارے برتن توڑتے ہوئے“ شہریار ابھی ڈٹا بیٹھا تھا۔ اس کا نغمہ جاچکی تھیں۔

”نہیں دکھتا۔ انسان ہوں۔ مشین نہیں۔ تھک جاتی ہوں تو برتن ہاتھوں سے پھسل جاتے ہیں۔“

”نفسہ اتنی مولی تازی ہو۔ اتنا کھاتی ہو۔ تھکتا کیا؟“

”چھالے۔ اپنی بہنوں سے کہو۔ وہ صرف ایک گھنٹہ کچن میں کھڑی رہیں۔ صرف کھڑی رہیں۔ پھر ان کے بیان سننا اور مین بھی۔“

”توبہ میرے باپ کی توبہ، میری اتنی مجال کہاں؟“

کان پکڑ لیے تھے۔

”تو تھک ہے، پھر برتن ٹوٹے دو۔“

”تم ابھی سے اتنا نقصان کر رہی ہو۔ مستقل یہیں آ جاؤ گی تو کیا کیا توڑو گی؟“

”تمہارا سر تو لازمی۔“ اس نے بے فکری اور نڈر پن کا مظاہرہ کیا۔

اس دن شہریار نے اپنی امی سے کہہ دیا۔ ”میرے لیے یہ مولی رہ گئی تھی۔ ابھی تو برتن توڑتی ہے شادی کے بعد۔“

”شادی کے بعد بھی برتن ٹوٹیں گے۔ اس لیے کہ ہمارے پاس اور کچھ ہے ہی نہیں توڑنے کے لیے۔“

نغمہ نے کہا اور مونگ پھلی کے پھلے اچھال دیے۔

اگر شہریار بتا دیتا کہ ٹوٹنے کے لیے اس کا سر تو ہے پھر جو اس کا مذاق بنے گا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا۔ امی اتنا نقصان برواشت کیسے کر لیتی ہیں؟“

”تم نہیں سمجھو گے۔“

”آپ کوئی ماسی رکھ لیں۔“ مشورہ۔

”برتن ماسی بھی توڑے گی اور چھپا کر پھینک دے گی۔ اس کی تنخواہ اس کا کھانا پینا اور جو ریاں۔ چینی، چاول تو عام بات ہے۔ پی ہوئی روٹیاں بھی چرا کر لے جاتی ہیں۔ فریج کا سالن آدھا اس کے پیٹ میں جاتا تھا اور تینا نہیں کس گندگی سے کھانا پکتا ہو گا۔ میں کہاں تک نگرانی کروں۔ مجھے اور بھی کام ہوتے ہیں۔“ مامی بے زار تھیں۔

”تو بیٹیوں کو ذمہ داری سونپ دیں۔ آخر گھر ہی میں رہتی ہیں بیٹوں۔“

”ارے۔ یہ کسی کام کی ہوتی تو مجھے دوسروں کی مدد لینے کی کیا ضرورت۔“

”چھا خیر امی! میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس سے۔“

”پاکل ہو۔ ابھی اتنی کار آمد ہے۔ بعد میں تو اور بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں ہم۔“ امی نے اسے سمجھانا چاہا۔

وہ تن فن کرتا نکل گیا۔







برٹوں پر چاٹ مسالا اچھا میں نے ہمیں دھویں کی جو ترکیب بتائی تھی وہی برٹوں پر سیسہ یہ والا پتیر رکھو انگارہ اس پر ڈالو ذرا سائیل ٹیکاؤ ڈھکن بند کرو۔ ہاں بس اب ٹرائی میں رکھو! افو! انگارہ تو نکال لو۔ دھویں کامزا آگیا ہو گا۔ میں چلتی ہوں ٹرائی لے آؤ۔ وہ چکن سے ڈرائنگ روم لاؤنج کے چکر لگاتی رہی۔ کسی نے یہ نہ کہا۔

”ایک سوسہ تم بھی تم کھالو ہمارے ساتھ چائے پی لو۔“ ساسمانوں کے درمیان شرمائی بیٹھی رہی۔ راحہ میک اپ میں غرق ایک رخ سے منہ اٹھائے ڈٹی رہیں۔ لاؤنج میں نغمہ سہیلوں کے جھرمٹ میں قہقہے لگاتی رہی۔ سب کے سامنے سے برتن اٹھا کر لانا بھی اسی کی ذمہ داری تھی۔ ٹرائی میں یہاں وہاں سے برتن اٹھا کر رکھنا بھی۔

اور ابھی وہ چکن سمیٹ رہی تھی۔ کچھ برتن دھل گئے تھے۔ کچھ باقی تھے۔ آج تو برتنوں کا اتنا بار دھونا تھا۔ وہ بھوک اور تھکن سے بے نیاز آج کا کام آج ہی مکمل کرنے کا ارادہ کیے برتن دھو رہی تھی۔ چار گلاس ٹوٹ چکے تھے مگر ابھی بہت کچھ باقی تھا۔ رات کا کھانا۔ برتن چھوڑ کر وہ اپنی آسانی کے لیے کچھڑی پکانے لگی۔ کباب تھے ہی۔ دہی بڑے ختم ہو چکے تھے مگر دہی باقی بچا ہوا تھا۔ وہی وہی بطور راستہ کام آگیا۔

کچھڑی دم پر رکھ کر وہ زینہ چڑھ کر اوپر گئی۔ اوپر کمرے میں اس نے فوم کے کچھ پیس دیکھے تھے غالباً یہاں صوفوں کی مرمت ہوئی تھی۔ بچی کچھی چیزیں بڑی تھیں۔ ماما نے کہا تھا۔ کسی دن اوپر کے کمرے کی صفائی بھی کر دیتا۔ مگر اس وقت وہ فوم کے پیس لینے آئی تھی۔ باتوں کی آواز پر اس نے دروازے سے باہر جھانکا۔ ٹیسر پر دیوار سے کنبڈاں ٹکائے شہیار کھڑا کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ ذرا آگے اگر دیکھا۔ شہیار کا مخاطب۔ بڑوں کی سوکھی سڑی پیلے رنگت والی نورین تھی۔ لگتا تھا کافی دیر سے گفتگو ہو رہی ہے۔ رات کے اندھیرے کی انہیں پروانہ تھی۔ شہیار نے اسے دیکھ لیا تھا مگر اسے جلدی تھی۔

وہ فوم لے کر نیچے آگئی۔

کھانا تیار تھا۔ میز پر رکھ کر وہ پھر اپنے ذاتی محل یعنی کچن میں پہنچ گئی۔ ابھی چند منٹ ہوئے تھے کہ شہیار دھڑ دھڑ کر اندر آیا۔ وہ سنک کے سامنے کھڑی برتن دھونے لگی تھی۔ شہیار نے آتے ہی اس کا بازو اس قدر زور سے پکڑا، بلکہ دو چاکہ اس کی پیچ نکل گئی۔ اس کو بازو سے پکڑ کر اپنے سامنے لا کر غرا کر بولا۔

”سنو۔ تم موٹی فضول لڑکی! سمجھتی کیا ہو خود کو۔ میں سمجھتا ہوں سے شادی کروں گا؟ تم سے؟ تم ہو کیا؟ زبردستی۔ قبضہ گروپ ارے ممکن تو ایک ڈراما ہے۔ بہت جلد دی اینڈ ہوئے والا ہے سمجھیں اگر تمہارے منہ سے میرے اور نورین کے بارے میں ایک لفظ بھی نکلا تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

اور جس آندھی کے ساتھ آیا تھا۔ طوفان کے ساتھ واپس چلا گیا۔ چور کی داڑھی میں ٹکا۔ صاعقہ کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ کسی سے بھی کچھ کہنے کا فکر نہ جانے اس پر کسی نقاہت طاری ہوئی۔ گو کہ تھکن، فکر، خستہ پیراڑے ہوئے پھر بھی کام ختم کرنے کے لیے اپنی طاقت استعمال کر رہی تھی۔

شہیار نے نہ جانے کیا جادو کیا۔ طاقت نقاہت میں بدل گئی۔ دیوار کا سہارا لے کر وہ کہیں بھی ٹک کر سانس بحال کرنے آگے بڑھی کہ ماموں آگئے۔ دن میں کئی بار اگر جائزہ لے کر گئے تھے کہ کام درست طریقے پر ہو رہا ہے کہ نہیں۔ (اس کا اپنا خیال تھا) ماموں نے اس کو کانپتے دیکھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔

”تمہیں بخار ہو رہا ہے۔ بتایا نہیں اور لگی ہوئی ہو کام سے۔ چلو اندر چلو اور یہ کیا۔ انگلی میں زخم ہے۔ اندر چلو کمرے میں۔“

”وہ میں برتن۔“ وہ بمشکل بولی۔ اس کا بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ خاموشی، بس خاموشی چاہیے تھی۔

ماموں نے اس کے ہاتھ سے فوم لے کر سنک میں پھینکا۔ ہاتھ دھلانے سنک تک لائے۔ پھر اسے سہارا

دے کر کمرے میں پہنچایا۔ ماموں کے کس نے طاقت دی اور ان کے محبت بھرے الفاظ نے توانائی۔

”بیٹا! طاقت سے زیادہ کام کرنے سے یہی ہوتا ہے۔ تم کسی کو تو بتاتیں۔ طبیعت خراب ہے تو اتنی تھکن نہ ہوئی۔ کوئی تودہ کر دیتا۔“ اسے پٹنگ پر بٹھا دیا۔

”لجارت سے بولی۔“ ماموں! ابا سے میری بات کرادیں۔“

ماموں سیٹنا کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ پھر بولے۔ ”وہ میرے پاس ان کا نیا نمبر نہیں ہے۔“

”نیا نمبر؟“

”ہاں! وہ تو سعودی عرب چلے گئے ہیں۔ انہوں نے فون کیا ہو گا مگر ہمارا فون خراب تھا۔“

”سعودی عرب؟“ اس پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

”ہاں۔ دو مہینے ہو گئے۔ اچھی جاب ملی تو چلے گئے۔ حالانکہ بیوی بچوں کو اکیلا چھوڑنا۔ نیچے ابھی چھوٹے ہیں نا اور بیوی بھی سنا ہے کہ کچھ بیمار ہے۔ مگر حالات ایسے تھے کہ اس نوکری کو ٹھکانہ نہ سکے۔ ماری زندگی اپنے بہن، بھائیوں، ماں باپ پر خرچ کیا۔ بچت کی نہیں۔ اب۔“

”نہیں۔“ ماموں کیا کہہ رہے تھے۔ اس پر تو غمزدگی کا حملہ ہوا تھا۔ سعودی عرب چلے گئے اور مجھ سے بات بھی نہیں کی۔ میں اتنی بڑی ہوں۔ ان کی نظر سے گر چکی ہوں۔ ان کے ذہن سے نکل گئی ہوں۔ ماموں سے ان کی کب بات ہوئی۔ ہوئی تو تھی۔ مجھ سے بات کرنے کی ان کو ضرورت نہ محسوس ہوئی۔ کیوں۔ اتنا بڑا جرم تھا میرا؟“

سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں تلے اندھیرا تھا۔ بخار تیز ہو رہا تھا۔ ماموں بولے آئے تھے۔

”کچھ کھایا بھی ہے تم نے یا سارا دن مشقت ہی کرتی رہیں۔“

دن بھر میں یہ سلا فقرہ تھا۔ جو ماموں سے ہی سنا۔ بھوک سے مجبور ہو کر اس نے پیتلی سے چھڑی نکال کر چند لقمے کھالیے تھے۔ ماموں نے جیب سے بسکٹ کا

پیکٹ نکال کر زبردستی کھلایا اور دوا بھی پلائی۔ کچھ بار بھری نصیبیہ تھیں کر کے وہ چلے گئے اور اسے سوچنے کا موقع مل گیا۔

دن بھر کام کا بوجھ۔ وقت پر چیزیں تیار کرنے کی فکر۔ پھر بکھرے ہوئے پٹن کو سمیٹنا۔ کبھی کبھی ماما کو ماموں پر احسان کرنے کا خیال آتا تو آکر چائے بنا کر لے جاتیں۔ صاعقہ کی کلاس لینا بھی لازمی۔

”یہ چیز ادھر کیوں ہے اور یہ ڈیبا یہاں کیا کر رہا ہے۔ ہر چیز کی جگہ بتی ہوئی ہے۔ اسے اپنی جگہ پر رکھنا سیکھو۔ نہیں آسانی ہوگی۔ جہاں سے اٹھاؤ۔ وہیں رکھو۔“

مامی کے ارشادات جاری رہتے۔ ایک دن اس نے کہہ بھی دیا۔

”میں خود جگہ پر نہیں ہوں۔ جب میں ہی بے جگہ ہو چکی ہوں تو چیزوں کو جگہ پر کیسے رکھوں گی۔“

”میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تم کو تلاش کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔“ ماما کو اس کی بدزبانی پر غصہ آتا تھا مگر برداشت۔

”جب سب کچھ مجھے کرنا ہے۔ میں تلاش بھی کر لوں گی۔“ وہ تنک کر بولی۔

جگہ بے جگہ، ٹھکانا بے ٹھکانا، آخر اس کا ٹھکانا کون سا ہے؟ یہ تو طے ہے کہ یہ گھر اس کا ٹھکانا نہیں۔ یہ جگہ اس کے لیے مناسب نہیں۔ پھر وہ فالتو شے کی طرح یہاں کیوں ہے؟

ماموں منع کر گئے تھے کہ صبح وہ نہ اٹھے آرام کرے۔ ناشتائیں جانے گا۔

ماموں کی محبت نے اس پر رقت طاری کر دی۔

”ہائے ابا! نے مجھے فالتو شے سمجھ کر پھینک دیا۔ خبر تک نہ لی۔ جب اس کی بات نہ ہوا۔ منگنی ہوئی۔ ابا جا چکے تھے۔ کسی نے بتایا تک نہیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی مرضی معلوم کرنے کی بھی کو شش نہیں کی۔ بات کرنا گوارا نہ کیا۔ یہ کیسی محبت ہے ابا! کیا مال کے مرنے کے بعد اس کی اولاد کو یوں نظر انداز کر دیتا جائز ہے۔ بغیر بتائے، بغیر ملے چلے گئے۔ ابا کو شاید اس کی



ضرورت نہ رہی ہو۔ محبت بھی نہ ہو مگر بیٹی کو باپ کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔ بیٹی بھی باپ کی محبت کو دل سے نہیں نکالتی۔ میں ابائے کے لیے فالتو تھی۔ اسے خواہ کہیں بھی بھیج دیا جائے۔

ابنی بے قدری پر زور کا رونا آ رہا تھا۔ خوب روئی۔ مرنے کو دل چاہا۔ مگر افسوس اسے مرنا نہیں آیا۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی۔ باپ جیسی ہستی جو سر کا ساتیان ہے۔ منگتیر جیسا شخص۔ کسی کو اس کی ضرورت نہ لگاؤ نہ محبت۔ پھر تو مرنے جانا چاہیے۔ وہ روتی رہی بے بسی سے۔ نہ کوئی چپ کرانے آیا نہ تسلی دینے اس کا ہمدرد تھا ہی کون۔ ایک ماموں جو اپنا فرض ادا کر کے چار لفظ محبت بھرے کہہ کر جا چکے تھے۔ اس دنیا میں میرا دل ایک ماسی جتنا ہو گا۔ کام کرو اور پیٹ بھرو۔ ایسا کون سا کتاہ کیا ہے۔ جس کی سزا اتنی سخت مل رہی ہے۔

شاید ابابا کا دل دکھایا ہو۔ ہاں انہیں میرا یہاں آکر رہنا اچھا نہیں لگا ہو گا۔ خالہ جان سے تو وہ خوش تھے۔ مگر ان کو بتاتے بغیر یہاں آجانا۔ اپنی ضد میں انا کی خاطر ابابا کا دل دکھایا اور ناراض کر دیا اور وہ بھی محض فخر اور ان کے بچوں کے کام سے بچنے کے لیے ہیں تو وہ بھی ابابا کی اولاد میری طرح ہی۔ ابابا کو مجھ سے کچھ توقعات ہوں گی۔ محبت بھی ہوگی۔ جسے میں ٹھوکر مار کر چلی آئی۔ ہائے اپنی غلطی کا ازالہ کیسے کروں؟ رو کر رو کر نیند غائب ہو چکی تھی اور وہ اب اپنا محاسبہ کر رہی تھی۔

گھر کے کاموں سے بچ کر پھو پھو کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے فخرہ سے نفرت بدگمانی کو دعوت دی۔ پھر خالہ جان کے گھیر نہائی۔ سب محبت کرنے والے لوگ ملے۔ خالہ تو تھیں ہی اپنی۔ بلکہ اپنی سے بڑھ کر صرف خالو جان ہی خود پسند خمرے باز تھے۔ کئی دفعہ اس کی بری طرح ڈنک کی۔ مگر خالہ جان سب کچھ سنبھال لیتی تھیں۔ چھ ماہ وہ ان کے گھر رہی۔ خالو جان کی بد فطرتی سے تو وہ واقف ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے بعد کے واقعات۔

جب رات کو اس کا حلق سوکھ گیا تھا۔ نیند سے بیدار ہو کر اس نے دیکھا۔ آج نصرت گھر سے رکھنا بھول گئی تھی۔ یہ اس زیادہ تھی۔ گیلری میں ایک کونے میں پانی کا کولر رکھا رہتا تھا۔ وہ اٹھ کر گیلری میں آئی۔ سامنے دیوار گیر کلاک میں ڈھائی بجے تھے۔ برآمدے کی لائٹ گیلری میں بھی آ رہی تھی۔ کولر کے پاس گلاس موجود نہ تھا۔ وہ ریک پر پٹائی پر نظریں دوڑا رہی تھی۔ آخر گلاس نظر آیا۔ جو قدرے نیم تاریک گوشے میں ایک پٹائی پر رکھا تھا اور ہلکی۔

تب ہی خالو جان کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اندر سے نصرت کو نکلے دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔ ڈھائی بجے رات کے نصرت یہاں کیا کر رہی تھی۔ شاید خالہ جان نے اسے بلایا ہو۔ ان کی طبیعت خراب ہوئی ہوگی ورنہ نصرت چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھتی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ صاعقہ بھی بیانی بی کر اندر آکر لیٹ گئی۔ خالو جان کے ڈر سے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا نہیں۔ صبح ہی خیریت معلوم ہوگی۔ سوچ کر سو گئی۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ اقرا، قصی جا چکی تھیں۔ خالو جان ناشتا تناول فرما کر تشریف لے جا چکے تھے۔ حسن بھائی کرپی پر اخبار میں گم تھے۔ خالہ جان بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ مٹکی مٹکی لگ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر کہنے لگیں۔

”او بیٹا! تم بھی ناشتا کرو۔“

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے خالہ جان!“ اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

”ہاں۔ بس تھکن ہے۔ ارے ابھی کتنا بھی آرام وہ کمرہ اسپتال کا نام ہی تھکانے والا ہے۔“

”اسپتال مطلب آپ کی طبیعت۔“ وہ گھبرائی۔

”نہیں بھئی۔ رات کو ساتھ والی حمیرا آئی تھی بلانے۔ رضیہ آپا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ ان کا بیٹا کہیں دورے پر گیا ہوا تھا۔ ہو کا تنہا سا بیٹا ہے تو میں اور حمیرا رضیہ آپا کو اسپتال لے گئے۔ ان کا بلڈ پریشر بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ اب بہتر ہیں۔ صبح ان کی بو ناشتا لے کر اسپتال آئی تو میں اس کے ساتھ آئی۔

رضیہ آپا بھی شام تک آجائیں گی۔“

”اچھا۔ میں سمجھی آپ کی طبیعت خراب ہے۔ نصرت کو اسی لیے بلایا ہے۔ اصل میں رات سخت ٹھس لگی، گیلری کے کولر سے پانی پینے آئی تو آپ کے کمرے سے نصرت کو نکلے دیکھا۔ وہ فوراً ہی باہر چلی گئی۔ میں پوچھ بھی نہیں کی کہ کیا بات ہے۔“

اس نے علی حسن کو اخبار میز پر بیٹھنے کے انداز میں رکھتے اور خالہ جان کو ٹھوکر دیکھتے عکس کو ٹھوکر مار کر جاتے دیکھا تو ڈر گئی۔

”ان کو کیا ہوا ہے؟“ وہ سوالیہ نظروں سے خالہ جان کو دیکھنے لگی۔

وہ بھی پیالی میز پر رکھ کر۔ ”اب نیند پوری کر لوں۔ مجھے جگانا نہیں۔“ کہہ کر چلی گئیں اور آگے دن نئی ملازمہ آگئی۔ نصرت کو نکال دیا گیا تھا۔ کوارٹر خالی ہو کے وہ جا چکی تھی اور علی حسن جو گھر کے معاملات سے یکسر بے نیاز تھے۔ ملازموں کے معاملے میں خاصے حساس نظر آئے۔ انہوں نے خود انٹرویو لیا تھی۔ کوارٹر کا مطالبہ بھی رد کر دیا۔ حالانکہ نصرت کا کمرہ خالی تھا۔

نئی ملازمہ نصرت کے مقابلے میں زیادہ عمر کی تھی۔ اس کا شوہر بوڑھا تھا۔ اولاد بہت نہیں تھی کہ نہیں مگر بے چاری خاصی مجبور لگی۔ صبح اگر گھر کے سارے کام کر کے شام تک واپس چلی جاتی تھی مختصراً۔ اس لیے کسی کو اس سے شکایت نہ ہوئی۔

اور پھر اقرا کی ایک کولیگ کی شادی کا بلایا تھا۔ ”اقرا“ قصی اس قدر برجوش تھیں۔ جیسے ان ہی کے گھر کی شادی ہے۔ دونوں مایوں کی رسم کے بعد آئیں تو صاعقہ کو منہدی میں ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔ خالہ جان بھی جانے پر تیار تھیں۔ وہ بھی راضی ہو گئی۔

منہدی کے دن دوپہر میں دونوں نے منہدی لگائی اور بیوی پارلر چلی گئیں۔ صاعقہ نے انکار کر دیا۔ وہ بڑی محنت سے اپنے ہاتھوں میں منہدی لگانے لگی۔

”ابا!“ واقعی کمال کے گل بوٹے بنائے تھے۔ کسی کو دکھا کر تعریف وصول کرنے کی خواہش تھی مگر کسی کوئی تھا ہی نہیں۔ خود ہی تعریف کرتی اور داد دیتی

رہی۔ پھر ہتھیلیاں سکھانے کے لیے گیلری میں نکل آئی۔ یہ سوکھ جائے تو ہاتھ دھو کر کپڑے استری کرے۔ ایک ہاتھ کی ہتھیلی اور دوسرے کی پشت پر کس وقت سے پیلنس سجائی تھیں۔

قصی اقرا کو ایک دوسرے کے لگا کر مزے سے چلی گئیں۔ وہ پھونکس مارتی ادھر سے ادھر گھومتی رہی۔ دیکھا ہی نہیں۔ کب خالو جان کمرے سے برآمد ہوئے اور گریہ پا چلے ہوئے اس کی پشت پر آگئے۔ مڑی تو ان کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی۔ اب آپا شامت مگر حیرت کا جھکا سا لگا۔ وہ اس کے ہاتھوں کی منہدی کو بڑے شوق سے دیکھ رہے تھے۔

”ابا۔ بہت خوب منہدی۔ کتنی حسین لگائی ہے۔“

انہوں نے اس کے دونوں ہاتھوں کی کلاہیاں قسام لی تھیں۔ وہ ایک تخت چونک گئی۔ یہ کیسا رویہ ہے۔ وہ ابھی تک منہدی کو سراہتے ہوئے کچھ بول رہے تھے۔ پھر ان کے ہاتھ اس کی کلاہیوں سے اوپر آئے۔ اس کے احساسات عجیب سے ہونگے۔ وہ چونکا ہو گئی۔ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی تو پتا چلا۔ وہ کتنی کمزور ہے۔ خالو جان کا ہاتھ کچھ اور کمالی سا رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس کا الٹا ہاتھ جڑے ہوئے دوسرے سیدھے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے آستین اوپٹی کر رہے تھے۔

ان کی وہ بر شوق نظریں اب منہدی سے بچے ہاتھ سے ہٹ کر کلاہی سے اوپر پٹچی ہوئی تھیں۔

”واہ۔“ ان کے لبوں سے تعریفی لفظ ادا ہوا۔ اسے اب اندازہ ہوا۔ یہ کسی بزرگ کا شفقت آمیز لمس نہیں۔ ایک حریف مرد کا لمس ہے۔ وہ سٹپٹا کر زور سے بول پڑی۔

”چھوڑو! خالو جان! منہدی خراب ہو جائے گی۔“ حلق میں کچھ انگ گیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

”بہت خوب صورت ہاتھ ہیں تمہارے اور یہ منہدی واہ۔ واہ۔ چلو کمرے میں چل کر تمہاری اس محنت کی داد دوں۔“

نا قابل برواشت اذیت نے اس کا چہرہ بھی نیلا کر دیا۔



چچ پڑی۔ ”خالو جان!“

”کچھ نہیں ہوتا میری گڑیا! آؤ ذرا۔“

اب وہ اسے اپنے کمرے کی طرف کھینچ رہے تھے۔ طاقت سے۔ وہ زور سے چبھی۔

”اللہ!“ اب وہ بد طینت انسان شیطان کا روپ دھار چکا تھا۔ اس کی طاقت زیادہ تھی مگر صاعقہ خطرے کے سامنے چٹان بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہاتھ بہ زور کھینچے۔ اس نے انہیں زور کا دھکا دیا مگر بس اتنا ہوا کہ ہتھیلی کی ساری مہندی خالو جان کی قمیص پر لگ گئی۔ زور آزمائی کے دوران اچانک ان کی گرفت کمزور ہوئی۔

”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“ علی حسن تیوری چڑھائے نہ جانے کدھر سے پر آمد ہوئے تھے۔

وہ زور لگا رہی تھی۔ جھٹکے سے زمین پر جا گری۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے پردے چھا گئے۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ گھر میں اکیلی ہے اور یہی گمان اس شیطان کو بھی تھا۔ تب ہی علی حسن کی آواز پر وہ گھبرا گئے۔ زمین نے مہمان ماں کی طرح اسے سمیٹ لیا تھا۔ اس کی سماعت میں خالو جان کی آواز پہنچی۔

”یہ لڑکی پاگل ہے۔ مجھے مہندی دکھانے کے لیے بلایا میں تو۔“

صاعقہ کی آنکھیں کھلیں۔ علی حسن انتہائی طنز سے بولے۔

”مجھ سے مہندی دکھانے یا آپ کے مہندی تھوہنے کے لیے۔“ ان کی نظروں کا مرکز خالو جان کی قمیص تھی۔ پھر صاعقہ سے کہا۔

”اٹھئے محترمہ! مہندی تو آپ نے بہت خوب لگائی ہے لیا جان کو۔“ وہ اٹھی اور کانٹے ہوئے بولی۔

”مہندی پاکیزہ ہوتی ہے اور گندے لوگوں کے لیے دلغ۔“

اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کیا کر ڈالے۔ اگر آج علی حسن نہ ہوتے۔ کون مددگار تھا۔ مگر یہ وہ سمجھ چکی تھی کہ اللہ کی مدد کے سوا کوئی مددگار نہیں۔

اقرار اقصی کے ساتھ خالہ جان آئیں تو وہ اپنا سامان

سمیٹ کر کہیں بھی جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوچ چکی تھیں۔

”خالہ جان! مجھے آج ہی جانا ہے ماموں کے گھر۔“ خالہ جان شاید علی حسن سے مل کر ہی آئی تھیں۔

جو لاؤنج میں اخبار پڑھتے ہوئے اس کی تہسلبانی بھی کر رہے تھے۔

”بیٹا! میں صبح ہی تمہیں لے کر چلوں گی خود۔“

”نہیں۔ ابھی۔ کسی بھی بس میں۔ میں نہیں رک سکتی۔“

”میں خود تمہارے پاس سوؤں گی۔“ ان کو شاید اطمینان تھا۔ صاعقہ کو نہیں۔

”خالہ جان! اسی وقت کی کسی بھی بس سے چلی جاؤں گی۔ رات تک بیچ جاؤں گی۔ ماموں کو فون کر کے بتا دیں۔“ آنسو اتر رہے تھے۔ انہوں نے

افسردگی سے اسے دیکھا۔ ہار کیا۔

”چھابینا! پھر۔ تم علی حسن کے ساتھ چلی جاؤ گاڑی پر۔“

مگر اب کسی مرد کا اعتبار۔ نہیں۔ وہ گردن انکار میں ہلاتی رہی۔

”آج مہندی کا فنکشن ہے۔ پوری رات وہیں گزر جائے گی۔“

”وہاں کیا سب فرشتے ہیں؟“ اس نے انہیں لاجواب کر دیا تھا۔

وہ اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی۔ علی حسن فوراً کھڑے ہو گئے۔ وہ گاڑی اشارت کر رہے تھے۔ خالہ

جان اسے لے کر آئیں۔ علی حسن طیش کے عالم میں تھے مگر بغیر کسی حادثے کے وہ بس اسٹاپ پہنچ گئے۔

خالہ جان خود جانا چاہ رہی تھیں۔ صاعقہ نے منع کیا۔ علی حسن نے بھی کہا۔

”میں یہ بہادر لڑکی ہے۔ حالات کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ جانے دیں۔“

رات گیارہ بجے بس رکی۔ ماموں اور شہسوار اسے لینے آچکے تھے۔ ماما دیکھتے ہی لپکیں۔

”ارے واسہ۔ آئی میری شہزادی۔ اب یہاں تو

بک کر رہنا کچھ۔ اچھا۔“

وہ ماما سے لپٹ گئی۔ ”بس ماما! میں گھر آگئی تھی۔ آج تو اقرا کی دوست کی مہندی تھی۔ مجھے جانا تھا مگر بس

گھبراہٹ ہوئی۔ سب روک رہے تھے۔ خالہ جان ساتھ آنا چاہتی تھیں۔ میں نے کہا۔ میں کوئی بچہ ہوں

جو کچھ جاؤں گی۔ زبردستی کر کے آئی۔ میرا کمر اکھڑا ہے۔ مری ٹینڈ آ رہی ہے۔ کچی۔ کچھ کھانے کو ہے تو

دے ماما سے اس طرح چٹھی ہوئی تھی جیسے کوئی پردین بیٹی میکے اگر ماں سے لپٹتی ہے مگر چند روز میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ ماما کا گھر ہے۔ خالہ کا نہیں۔

سب کے چہروں سے منع اتر چکا تھا۔ اصلیت ظاہر ہو گئی تھی۔ اخلاق! بھی کوئی پوچھنے کا روادار نہ تھا کہ تم

کیسی ہو۔ تم نے کھانا کھلایا ہے یا نہیں یا یہ کہ کبھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھالیا کرو۔ مگر کوئی کیوں

پوچھتا۔ بن بلائے مہمان کی قدر اسی طرح ہوتی ہے۔ خالہ جان کے گھر میں۔ اس نے بھی تنہا کھانا

نہیں کھلایا۔ اقرا! اقصیٰ یا خالہ جان شریک رہتی تھیں۔ بہت آرام سے رہی۔ اس آخری واقعے کے

سوا کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس کی محنت سے لگائی مہندی خالو جان کے کپڑوں کو داغ دار کر چکی تھی۔ وہ

خود داغ سے بچ گئی۔ یہ کچھ تھا کیا؟

بہت دن تک اسے ہاتھوں سے کلامیوں سے گھن آتی رہی۔ کیڑے سے بازوؤں پر رینگتے۔ جنہیں وہ

الٹیوں سے ملتی۔ ہاتھوں پر مہندی کے گل بوٹے تو بک کے رگڑ کر کھار کھار کھو بیٹھے تھے مگر رنگ

عرصے تک قائم رہا۔ کس کی مہندی! کبھی شادی سب کچھ چھوڑ کر ایک مضبوط پناہ گاہ میں آگئی تھی۔ ضد

نے سب کام کرائے تھے۔ اب یہ یہ طے تھا کہ وہ لبا کے بلائے بغیر ان کے گھر

نہیں جائے گی۔ پچھلے واقعات ذہن میں دہراتے دہراتے آخر نیند آگئی۔ بخار کم ہو گیا۔



حسب معمول صبح سویرے آنکھ کھلی۔ سر بھاری تھا۔ جسم میں درد بھی۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے ماما کو سامنے کھڑا دیکھا۔

”میں بھی تنگ آنکھیں نہیں تھ۔ رات نیند نہیں آئی کیا؟“ تھک گئی ہوگی۔ کل مہمان بھی زیادہ آگئے تھے۔

سب تھکی پڑی سو رہی ہیں۔ تمہارے ماموں کو چائے دے آئی ہوں۔ تمہارے ہاتھ کے ناشتے کی ایسی عادت

ہو گئی ہے کہ میری بنائی چائے میں سو کیڑے نکالے۔ ناشتہ بناؤں گی تو شاید پھینک دیں۔“

وہ دھشائی کی چادر اوڑھے پڑی رہی۔ ماموں خود کہہ گئے تھے، تم آرام کرنا۔ ویسے بھی بخار کم تھا مگر بخار نے

جوڑ جوڑ میں درد چھوڑ دیا تھا۔ پتا نہیں وہ سب کیوں تھک گئی تھیں۔ صرف بیٹھ کر باتیں کرنے اور ہنسنے کے سوا کون سا کام کیا تھا۔

”چھابینا! پھر میں چلتی ہوں۔ تم آجانا ماموں کے لیے ناشتہ۔“

وہ بڑبڑاتی چلی گئیں۔ وہ سوچنے لگیں، میں ہی کیوں۔ اسما! نعمہ کیوں نہیں۔ گھر کی خواتین مہمان بنی رہتی

ہیں۔ میں فالتو ہوں! یا ہر سے ایک بار پھر آہٹ سنائی دی۔ اس نے دم شاہہ لیا۔ منہ تیلے میں گھس لیا۔

ہولے ہولے کر اٹھنے لگی۔ آہٹ اندر آگئی۔ ”کیا بات ہے صاعقہ! ابھی تک لیٹی ہو۔“

انہیں شاید اس کی کرپاں سنائی نہیں دی تھیں یا انہوں نے پروانہ کی۔ راحمہ تھی۔ فل میک اپ کے

ساتھ کہیں جانے کو تیار۔ ”بڑا درد ہے۔ بخار ہو گیا تھا۔ سردی بھی لگ رہی ہے۔ اٹھا نہیں جا رہا۔“ وہ ناہمت زدہ آواز میں اپنی

تکلیف کا احساس دلانے لگی۔ ”واسہ! ہاں۔ بخار تو ابھی ہے۔“ انہوں نے اس

کے بازو چھو کر اقرار کیا۔ ”مگر پینے بھی آنے والا ہے۔ اتر جائے گا بخار۔ ہاں! وہ کل جو مہمان اسما کے لیے

آئے تھے۔ انہوں نے اسما کو رجحیکٹ کر دیا۔ وہ غم میں بے سدھ ہے۔ اصل میں ان لوگوں نے تم کو پسند

کیا ہے۔ رشتہ بھی دے دیا۔ اب۔ بخار اتر جائے تو



”یہ کن میں آجانا۔“

”حکم دے کر وہ ٹھک ٹھک کرتی یا ہر نکل گئیں۔ صاعقہ کا بخار تواب اتر گیا تھا۔ بھوک بھی لگی تھی۔ وہ جانتی تھی اپنے لیے اسے خود ہی چائے بنانی ہوگی۔ اس کے لیے کوئی زحمت نہیں کرے گا۔ یہ خالہ جان کا گھر نہ تھا۔ جہاں نوکر ناشتا کھانا تیار کر کے بلائے آتا۔“

نوکر کوں کا خیال آیا تو نصرت یاد آئی۔ پتا نہیں اس کی کیا مجبوری تھی۔ تنخواہ تو جہاں بھی کام ملے مل جاتی ہے لیکن کوارٹر کا حصول آسان نہیں۔ کوارٹر کے عوض۔ عورت کا سودا۔ یہ نسوانیت کی توہین نہیں تو اور کیا ہے۔ آہستہ مجبوریاں۔ خالہ جان نے ساری عمر خالو جان کو کیسے برداشت کیا سب کر دار اور بد نیت انسان۔ خالہ جان کی مجبوری۔ عیش آرام کے عوض۔ ”پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوہیں کلن“ پھپھو مثال دیتی تھیں۔

وہ یکن میں چائے بنا رہی تھی۔ نغمہ نے ناشتے کی فرمائش کر دی بلکہ مائی نے بھی۔ حتیٰ کہ ماموں نے بھی اچھی سی چائے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ نہ جانے کیسی چائے ملی تھی انہیں۔ وہ بہت زیادہ چائے کے عادی نہ تھے سب کی چائے ناشتے لے کر ٹرے میں رکھ کر وہ لے جا رہی تھی تو اوپر میز پر کھڑے شہزاد نے پکارا۔

”سنو۔ مجھے بھی چائے اور ناشتا یہیں اوپر دے دجانا۔“

بہت فرصت کے عالم میں کھڑا تھا نورین کے انتظار میں۔ وہ ٹرے اندر دے آئی۔ شہزاد اسی جگہ کھڑا تھا۔ اس نے ماموں کی آواز سنی۔

”کل سے بخار تھا اسے۔ آج آرام کرنے دیتیں۔ کبھی اپنی لادلیوں کو بھی حرکت کرنے کا کہہ دیا کرو۔“

”سنو۔ ڈبل پر اٹھا بنانا۔ دو اینڈل کا آلیٹ۔ اور دودھ پی کی مزے دار چائے۔“

”نوکر نہیں ہوں تمہاری۔ نیچے آکر ٹھونس لو۔“ وہ بھنا کر بولی۔

”اوہو۔۔۔ میں نے کب کہا کہ نوکر ہو۔ مگتیر تو ہو۔“

ایسا لہجہ مگتیر کے ساتھ کون لڑکی اختیار کرتی ہے بھلا۔ ”ڈھیٹ۔۔۔ رات کی فضولیات بھول چکا تھا۔ مطلب پرست۔“

”میں۔۔۔ کون سی لڑکی کے جواب میں اس نے کہا اور چھپاک سے یکن میں تھی۔“

”بھوک لگی ہے یا آپ کچھ خیال کرو۔ اوپر ہی لے آنا اچھا۔“ اور سے ہی حکم نامہ جاری تھا۔

”نہ تم نواب زادے ہو۔ نہ میں تمہاری کینیز۔ منتقلی کا ڈراما ختم ہونے والا ہے۔“

وہ دروازے پر سے چلائی اور اپنے لیے ناشتا بنا کر کھانے بیٹھ گئی۔ ابلا ہوا اینڈل اور آلیٹ، دودھ پی چائے پھر خیال آیا تو ٹرے میں سب چیزیں رکھ کر گھرے میں آئی، معلوم تھا کہ آئے گا بھنایا ہوا اور خالی میز بند چوما دیکھ کر جھنجھٹائے گا۔ ماں کو پکارے گا۔ مجھے کیا۔ مزے سے لذیذ ناشتا کرنے لگی۔ آلیٹ

بھی کس قدر مزے دار تھا۔ مکھن میں فرانی کیا تھا۔ ابھی آوہا پر اٹھا کھایا تھا کہ فون غل کرنا مگتیر آ گیا۔

”میرے لیے کیوں نہیں بنایا؟“ شدید غصہ تھا۔ غالباً ”نورین ملنے نہیں آئی۔“

”مجھے بخار ہے، کمزوری ہو رہی ہے، نغمہ سے بنالو۔“ اس نے مکھی اڑائی۔

”بتا رہا ہوں، بعد میں تو تم کو میرے سارے کام کرنے ہی ہوں گے تو ابھی کیوں نہیں۔“

”بعد میں تو ڈراما دی اینڈ ہو جائے گا۔“ معصومیت سے بولی۔

ادھر ادھر دیکھتے ہوئے نظر نہ آنے والی شے کو ٹھوکر مارتا، جھلاتا ہوا ناکام مگتیر چلا گیا۔ ماں سے شکایت کرنے۔

وہ مسکراتی رہی۔ اب سب کے ساتھ ایسا ہی رویہ رکھنا ہو گا۔ خواہ سب کی ملازمہ بنی رہی۔

پھپھو کہتی تھیں ”بے والے کو سب دباتے ہیں۔ زور آور سے کوئی جیت نہیں سکتا۔ گو کہ یہ نصیحت وہ

فاخرہ سے مقابلے کے لیے کرتی تھیں۔ مگر اب وہ سہل بھی زور آور بن کر کھادے گی۔ یوں بھی بقول اس کے



مگتیر کے منگنی کا ڈراما تو ختم ہونے والا ہے۔

اجنی ٹرے خالی برتن پکن میں لائی تو دیکھا خاصی افرا تفری اس نے تیزی سے ناشتا بنانے کے چکر میں پھیلا دی تھی۔ بس آج صرف پکن ہی سیمٹوں کی بانی سارا کام شہزادیاں کریں گی۔ کمرے سے خالی برتن اٹھانے وہ وہاں پہنچی۔ دروازہ بند تھا۔ دلیز پر ہی تھی کہ انا نام سن کر رک گئی۔ اندر کی آواز بخوبی سنی جا رہی تھی۔

”تم صاعقہ کو غصہ کیوں دلاتے ہو آخر؟“ مای شہزاد کو ڈانٹ رہی تھیں۔ ”کتنی دفعہ کہا ہے محل سے کام لو، مفت کی کام دلی کی ہوئی ہے۔ اسے بدل نہ کرو کہ بعد میں وہ ضد پکڑے۔ اس کا باپ سعودی عرب میں ہے۔ کھڑا چیز منہ مانگا ملے گا۔ بہت فائدے اٹھانے ہیں بابا۔ تم جیسے کو ایسا رشتہ ملنا خوش نصیبی ہے۔“

”ہاں جی۔۔۔ بڑھے نہ لکھے۔ کام کے نہ کاج کے۔ پڑوسن کہہ رہی تھیں۔ کون پاگل باپ ہے جس نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ ہیرا جیسی بیٹی حوالے کر دی۔“ نعمتہ نہ جانے کس کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ”اور بابا۔۔۔ کس مشکل سے راضی ہوئے کہ ان کی پیاری بھانجی اور نکلبد تیز بیٹا۔“

”مگر۔۔۔ مجھے وہ پسند نہیں ہے۔“ شہزاد پیر پٹ کر بولا تھا۔ ”کتنی دفعہ کہوں۔۔۔ مجھے نورین پسند ہے۔ اس کے ماں باپ راضی ہیں۔“

”ہاں تو نہیں کب انکار ہے۔ اس سے بھی کر لیتا۔ دونوں مل کر گھر سنبھال لیں گی۔“

”ماں بیٹی کے مشترکہ فیصلے نے اسے لرزادیا۔ اندر مای بتا رہی تھیں۔

”اب کل دیکھو۔ کہے اس نے سارے مہمانوں کو نپٹایا۔ بھلا ہم چار مل کر کبھی کر سکتی تھیں۔ اس کی شادی تک تو اسے ہمسلا کھڑا کرنا روکنا ہی ہے۔“

”میں پیار تھاؤں؟ ہرگز نہیں۔“

”آئے فائدے کے لیے تو انسان کچھ بھی کر لیتا ہے اور اب بھی افتخار بھائی نے چھ لاکھ کی گاڑی دلانے کا

وعدہ کیا ہے۔ ہم جو بھی مطالبہ کریں گے۔ انہیں دینا ہوگا۔“

”آئی رقا نکلیں کہ ہم تینوں کے جیمز بن جائیں۔“ تینوں بہنوں کے فیصلے بلند ہوئے۔ ”اور بھائی! کل اس کو دیکھنے جو آئی تھیں۔ صاعقہ کو پسند کر کے رشتہ بھی دے گئیں۔“

”اچھا۔۔۔ پھر میں اسے طلاق دے دوں گا۔ ان۔۔۔ کہنا۔۔۔ سیٹ خالی ہوئی ہے۔“

شہزاد کا قبضہ خاصا بلند تھا۔ اب برواٹ مشکل ہو گئی۔ لات مار کر سلطان راہی کے انداز میں دروازہ کھولا۔ طوفان کی طرح اندر گھسی۔ انگلی سے وہ نازک تلی چڑا انگلی اٹھا کر شہزاد کے منہ پر ماری۔ وہ بوکھلا کر گھڑا ہو گیا۔

”کیا بد تیزی ہے!“ بے ہودہ لڑکی! وہ غرا کر بولا۔ ”بد تیزی نہیں۔ عقل مندی بے ہودگی کا خاتمہ۔“ وہ بھی غیظ و غضب کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ”بہت مشکور ہوں آپ سب کی کہ سارا منصوبہ میرے علم میں آگیا مگر اس منصوبے کو اب ختم سمجھو تم نے خود کہا تھا منگنی کا ڈراما ہے۔ جلد ختم ہو جائے گا۔ تو ہو گیا ختم اب تیر نورین کے لیے آزاد ہو۔“

وہ بول رہی تھی تو مای برابر ”میرا بچہ میری بیٹی ہوا کیا ہے۔“ قسم کے لفظ بول رہی تھیں معاملہ رفت گذشت کرنے کے لیے مگر وہ طوفان میل بنی آپے سے باہر تھی۔

”کیا بکواس ہے؟“ وہ چلایا۔ خالی برتنوں کی ٹرے صاعقہ نے اٹھائی تھی۔ شہزاد کی چٹکھا پڑ اس نے ٹرے پوری طاقت سے زمین پر پٹی۔ مک اور پتیلیں اوھر اوھر لڑھکتی ہوئی ٹکڑوں میں بٹ گئی تھیں اور اسے خبر نہ ہوئی کب شہزاد اٹھ کر یک لخت جھپٹ پڑا۔

”جھپٹ کر کیا ہے تو خود کو۔ حور پری ہے۔ ملکہ عالم ہے اور ہم تیرے غلام۔ پتا نہیں کہاں سے آکر اور نہ جانے کیا گل کھلا کر آئی ہے۔ ہیں؟ پھو پھو بھی ایک بار کے کہنے سے بخوشی راضی۔ بول کیا کیا تھا تو نے؟“

اوھر ماری پھر رہی ہے۔ شہزاد کے یک دم چولا بدل کر چٹکھا ڈالنے اور تھپوں کی بارش نے صاعقہ کو حواس باختہ کر دیا تھا مگر اس کے الفاظ نے اس کے جسم میں شعلے بکھڑ کا دیے۔

”بونچا بھولا نہ گیا کہ پھٹنے جڑا سچا بولا۔ منہ خون سے بھر گیا اور خون کی کلی اس نے شہزاد کے سینے پر کر دی۔ وہ اپنا غصہ بھلا کر اپنے سینے کو دیکھ رہا تھا بھو بھوکا سا۔ خاصی جتنی قیص تھی سفید براق آن واحد میں سرخ رنگ سے رنگ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر صاعقہ کی چوٹی مٹھی میں جکڑ لی اور اس نے شہزاد کا گلا۔ مای تیزی سے آگے بڑھیں۔ بیٹے کو اس بھری ہوئی جھنٹی سے بچانے مگر اس میں کسی جن کی طاقت حلول کر چکی تھی۔ وہ اسے بری طرح نوح کھسٹ رہی تھی۔ بالوں کے بچھاؤ کی تکلیف کے باعث۔ شہزاد اس کے حملوں سے گھبرا گیا تھا مگر یہاں اس نے چھوڑے نہیں۔ اسی وقت باہر سے آواز آئی۔

”آرے سب کہاں ہیں بھئی؟“ ابھی کوئی بھی اپنی جگہ سے جھپٹ نہ کر سکا تھا کہ خالہ جان اور ماموں نے اندر قدم رکھے۔

خالہ جان کے لیے یہ خوف ناک سین تھا۔ ماموں کے لیے ناقابل برداشت۔ مای ہکلا رہی تھیں اور شہزاد نے ابھی اس کے بال نہیں چھوڑے تھے۔ نہ صاعقہ نے اس کا گلا۔ مای نے بیٹے کو دھکا دیا۔ اس نے حالات کا اندازہ کرتے ہی پیچھے ہٹا ہنسنے لگا۔ خالہ جان آگے بڑھ کر صاعقہ کو لپٹا کر جوڑ رہی تھیں اور ماموں نے اپنا جوتا ہاتھ میں لے کر اکھڑتے بیٹے کی دھناتی شروع کر دی۔ بہنیں وہاں سے رو پھر ہو چکی تھیں۔

ماموں نے ایسی تواضع کی۔ جوتے نے منہ دیکھا نہ آنکھ۔ وہ پچھنے ہوئے ہونٹوں، ہلنے دانٹوں سے خون پڑکا رہا تھا۔ ماموں کے غیظ و غضب میں کمی نہیں ہو رہی تھی۔ مای بیٹے کو بچانے آگے آئیں۔ ان کے بازو پر بھی ایک جوتا ہاتھ لے کر کے کرسی پر جا کر بنیں۔ کسی فانی ہوئی کی طرح جو ایسے موقع پر صوفے پر ہی گر گئی

ہے۔ خالہ جان صاعقہ کو پانہوں میں لیے شاکی نظروں سے مای کو دیکھ رہی تھیں اور اسی حالت میں جھپٹنے کو پٹنا چھوڑ کر صاعقہ کو پکڑ کر باہر آ گئیں۔ دروازے پر علی حسن دم بخود کھڑے اندر کا نظارہ کر رہے تھے۔ خالہ جان کے اشارے پر وہ ان کے پیچھے چل پڑے۔ خالہ جان کاں خا ہر کے دروازے کی جانب تھا۔

”یہ حال بنایا ہے آپ لوگوں نے بچی کا منگنی کا بہانہ کر کے۔ ارے میں تو مبارک باد دینے آئی تھی۔“ خالہ جان مای کی التجاؤں کے جواب میں بے نقط سنا رہی تھیں۔ مای لپکتی آ رہی تھیں پیچھے پیچھے پکارتی ہوئی۔

”آرے! ماں مری ہے اس کی باپ اور خالہ زندہ ہیں۔ کیا سمجھ رہی تھیں آپ اسے لوٹ دی بنا کر رکھیں گی۔ منگنی کرتے ہوئے مجھ سے رائے لینا دو کنار۔ خبر تک نہ کی۔ یہ سلوک یہ ظلم، انہی ہاتھ کیوں نہ ٹوٹ گئے اس بچی کے ساتھ ایسا کرتے ہوئے۔“

اسے خود میں سموئے فریاد نکلیں تھیں جھپٹنے کی درگت کا خیال کیے بغیر جو بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ بازو جھل گئے تھے۔ گردن سوج چکی تھی۔ جبرائیل شہزاد ایک دانست غائب ہوٹ اور منہ سے خون ہاتھ پر خراش، کسی نے اس ہارے ہوئے بہادر کو تسلی نہ دی۔ کچھ پوچھا تک نہیں۔ بہنیں غائب تھیں۔ خالہ جان باہر آکر گاڑی میں صاعقہ کے ساتھ بیٹھ چکی تھیں۔ مای حق دق کیٹ پر کھڑی رہ گئیں۔ علی حسن نے گاڑی آگے بڑھادی۔ صاعقہ روٹو کی طرح خالہ جان کا ساتھ دیتی رہی۔ گاڑی میں خالہ جان اس کا سوجا ہوا سرخ منہ ہاتھوں میں لے کر چوم رہی تھیں۔ ان کے آنسو توا تر سے بہہ رہے تھے۔ صاعقہ نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔ آنکھوں سے لگائے۔

”خالہ جان! آپ روکیں تو نہیں۔ یقین کریں میں نے بھی کسر نہیں چھوڑی خوب پٹائی کی ہے۔ چند روزہ مگتیر کی۔“ خالہ جان کچھ ٹھنڈی پڑیں۔

”میں تو صبح سویرے اسی لیے چل پڑی کہ گھنٹہ دو گھنٹہ گھر کھائی، بھابھی کو مبارک باد دے کر نہیں







ساتھ جاتے ہیں۔ پھر وہ پر میں انہیں لے بھی آتا ہے صبح ناشتا بتاتا ہے۔ وہ پر کو اگر جیسا تیسرا کھانا بھی تیار کر لیتا ہے۔ بہت بوجھ ہے اس پر۔  
 ”میں رات کے لیے کچھ بنا لوں؟“ وہ کچھ لاپرواہی لگی۔  
 ”آپ کے لیے پرہیزی چاول، پھوپھی؟“  
 ”تمہیں بناؤں؟“ وہ خوف زدہ سی ہو گئیں۔ ظلم کر رہی ہیں۔ اپنی پھوپھی کو ایک کی دس لگا دے۔  
 ”ہاں۔ میں سب کچھ بناتی ہوں۔ مائی سے سیکھ لیا ہے۔ بہت اچھا نہ سہی ٹھکے۔“  
 ”آج تھکی ہوئی آئی ہو۔ کل کر لینا آج انور آکر بنالے گا کچھ۔“

”نہیں۔ ٹھیک ہے۔ میں کچھ بنا لوں گی۔ لیکن میں کچھ نہ کچھ مل جائے گا گوشت، مہزی۔“  
 وہ جانے لگی پھر رک کر پوچھا۔ ”آپ پرہیزی کھانا کھائیں گی کیا۔“  
 ”جو تم بناؤ گی وہی کھاؤں گی۔ پرہیز بہت کر لیا۔“ وہ کچھ شوق نہوئیں۔ صاعقہ بھی مسکرائی۔  
 ”تو پھر دال چاول بنا لوں پھر کل سے باقاعدہ۔“  
 کہتی ہوئی پکن میں جا گھسی۔  
 حیرت۔ صاعقہ کو یقین کیسے آتا ہے وہی تو ہے۔ ان کی ہر بات رد کرنے والی۔ ذرا ذرا سی بات پر بسورنے والی۔ یہ ڈرانا کر رہی ہے یا واقعی بدل گئی ہے۔  
 صاعقہ نے کمال کر دکھایا۔ دال، چاول بھی اچھے بنائے اور ساتھ ہی نمائز پناز، ہر اسن، ہر ادھیا ڈال کر لذیذ چٹنی بھی بنادی۔ ہری مرچ ملی نہیں کھلی مرچ پیسی ہوئی اوپر سے چھڑک کر نیو نہو ڈیا۔



رات کو ابافون آگیا۔ بیٹی کی آمد نے انہیں بے حد خوش کر دیا۔  
 صاعقہ نے بہت تمیز سے اور بے حد لگاؤ سے باپ سے بات کی۔ کوئی شکوہ نہ شکایت۔ اپنی خوشی کا اظہار کیا اور بیشہ میں اس گھر میں رہنے اور کہیں نہ جانے کا وعدہ بھی کر لیا۔ پھر فاخرہ کو کھانا لاکر دیا۔

”آپ بیمار ہیں۔ آپ کو وقت پر کھانا چاہیے۔ پھر وہ ابھی تو کھائی ہوگی۔“  
 کتنی سمجھ داس۔ کس قدر ذمے دار ہو گئی تھی یہ۔  
 فاخرہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیسے اپنی حیرت اور خوشی کا اظہار کریں۔ اس نے انہیں دوا بھی کھلائی۔ پھر ان ہی کے پاس آکر لیٹ گئی۔  
 فاخرہ کو اس پر بیمار آگیا۔  
 ”تھک گئیں؟“ انہوں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پرو کر کچھ جھک کر پوچھا۔ صاعقہ کے اوپر ان دو لفظوں نے جاوا اثر کیفیت طاری کر دی۔ وہ اس کیفیت سے نا آشنا تھی۔

مائی کے گھر یہ لفظ کسی سے نہ تھے۔ چاہے سارا دن وہ کولو کے پتل کی طرح کام میں جتی رہے۔ سب کو اپنی خواہش، اپنی فرمائشوں کی فہرست اس کی سماعت میں انڈیل کر بے فکر ہو جانے کا راز معلوم تھا۔ بعد میں شکر یہ یا ہمدردی کے یہ دو لفظ بھی کسی کی زبان سے نہ نکلتے۔ صاعقہ کی سسکی سن کر فاخرہ ڈر گئیں۔

”کھیا ہوا صاعقہ! درد تو نہیں ہے؟“  
 وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”ملاں! میں بہت بُری ہوں کیا؟“  
 تعجب سے فاخرہ کا منہ کھل گیا۔ ”سب کو پریشان کر دیا۔ یہاں سے چلی گئی۔ اب کا دل دکھایا۔ لیکن فہرست تھی۔“  
 فاخرہ مسکرائیں۔ ”نہیں وہ فحاشیاں نہیں ہیں۔ نہ ہی انہیں تم سے شکوہ ہے۔ تم ان کی سب سے پیاری بیٹی ہو۔ بس ایک بات کی فکر تھی انہیں۔ جب فون کرتے تم سے بات نہ ہوتی۔ سعودی عرب جا کر بھی تم سے بات نہ کر سکتے۔“

”اب میں کبھی کہیں نہیں جاؤں گی۔“ وہ لاڈ سے منمننا کر بولی۔ فاخرہ کو ہنسی آئی۔  
 ”مسراں تو جانا پڑے گا۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ لہجے میں کہا۔  
 ”کبھی نہیں۔ مجھے کہیں جانا ہی نہیں ہے۔ مگر ہاں کل پھوپھی کے پاس ضرور جانا ہے۔ ان کا شکریہ ادا

کرنے۔“

صاعقہ تو حیرتوں کے ریکارڈ قائم کر رہی تھی۔ خالہ کے گھر جاتے ہوئے اس کا اعلان انہوں نے سنا تھا کہ وہ اب کبھی پھوپھی کے گھر نہیں جائے گی۔ بہت ناراض ہو کر گئی تھی اور اب۔۔۔  
 ”اچھا۔ چلی جانا۔ انور صبح بچوں کو اسکول لے جاتا ہے۔ آپا کا گھر اسکول کے راستے میں تو ہے۔ وہ تمہیں اتار کر پھر اسکول چلا جائے گا۔ لو۔ ماشاء اللہ بڑی عمر ہے۔“

باہر بچوں کے شور نے اعلان کر دیا تھا۔ ماموں آگئے اور پھر بھانجے بھانجی کو بازوؤں میں لٹکائے اندر آگئے۔ اسے دیکھ کر ٹھٹھکے۔

فاخرہ نے تعارف کر لیا۔ ”میری بیٹی آگئی ہے۔“  
 ”سوری آیا! دیر ہو گئی۔ میں سوچ رہا تھا بنے اور آپ بھوکے بیٹھے ہوں گے۔ مگر یہاں تو خوشبو میں کھانا بک جانے کا اعلان کر رہی ہیں۔“  
 ”خوش مزاج لگ رہے ہیں محترم۔“ وہ تنقیدی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”بھئی۔ بھوکے کیوں ہوتے۔ ان کی آیا نے چائے تو بنائی ہی، چپس بھی بنا دیے۔ مزے ہوئے ان کے۔ چلو تم نماز پھر کھانا سب ساتھ کھائیں گے۔“  
 فاخرہ نے صاعقہ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ کیوں اچانک آگئی۔ مقفی کیسے آتا ”فانا“ ہوئی اور اس کے مزاج کی تبدیلی کیسے ممکن ہوئی۔ اسے فاخرہ کی یہ اعیاض اچھی لگی۔

وہ وہیں صوفے پر لیٹ کر سو گئی۔ فاخرہ چاروں بچوں کے ساتھ اپنے بیڈ پر اس طرح سوئی تھیں۔ جیسے مرغ اپنے چوزوں کو پروں میں چھپا کر پاتی ہے۔ صبح سویرے صاعقہ اٹھ گئی۔ اسے پھوپھی کے گھر جانا ہی تھا۔ سب کے لیے ناشتا بنا کر اسے کمرے میں گئی۔ اپنے کپڑے ماموں کے گھر چھوڑ آئی تھی۔ یہاں چند منی جوڑے اچھے رہ گئے تھے۔ جتنی دیر میں ماموں نے بمجال بچوں کو اسکول کے لیے تیار کیا۔ وہ بھی تیار ہو گئی۔ باہر نکلی تو فاخرہ نے پوچھ لیا۔

”اب تم واپس کیسے آؤ گی؟“

اسے فاخرہ کا اپنے لیے فکر مند ہونا اچھا لگا۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ کبھی بھی دل میں جگہ بنانے کے لیے صرف غلوں ہی کافی نہیں۔ ایثار کی بھی اہمیت ہوتی ہے اور اب وہ خود بہت سی حقیقتوں سے آگاہ ہونے کے بعد اصل فطرت کی طرف لوٹ آئی ہے۔ اس کی فطرت، محبت اور ایثار کے رنگوں سے رنگی ہوئی تھی۔ لوگوں نے اس کے ذہن کو پر آگندہ کرنا چاہا تھا۔



ماموں کی گاڑی چھوٹی تھی۔ مگر چلتی خوب تھی۔ وہ پھوپھی کے گھر اتر گئی۔ پھوپھی اسے دلچھ کر دنگ رہ گئیں۔ اتنی صبح اس کا تیار ہو کر آنا اور انہیں اس کے واپس آنے کی ہی خبر نہ تھی۔ بیٹی کے ڈھنگ کچھ بدلے ہوئے تھے۔ لیٹ کر ان کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔  
 ”کون سا شکریہ، کس بات کا شکریہ۔“  
 ”پھوپھی! آپ نے کہا تھا۔ لڑکی کے لیے باپ کی چھت سے زیادہ محفوظ کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ بس اس کا مطلب اب سمجھ میں آیا ہے۔“  
 ”اللہ خیر ہوا کیا؟“

”ہوا کچھ نہیں مگر میرا دل لگا ہی نہیں کہیں۔ یہاں آکر اتنا سکون ملا۔ اب گھر پر نہیں۔ مگر ان کی خوشبو ہر جگہ ہے۔“ وہ سنجیدہ تھی۔  
 پھوپھی نے کہا۔ ”بیٹا! اپنا گھر خواہ جھونپڑی ہو، دوسروں کے محل سے زیادہ آرام دہ اور محفوظ ہوتا ہے۔ اچھا کیا تم آگئیں۔ فاخرہ غوڑی تیار، چھوٹے بچے تم سے کچھ لٹی ہوگی۔“

پھوپھی کے سب گھر والوں سے مل کر اس نے واپسی کی کھائی۔ سب روکنے لگے مگر اس نے کہا۔  
 ”پھوپھی! گھر میں کوئی ہے نہیں۔ وہ تو بیمار ہیں اور ان سے اٹھا بھی نہیں جاتا۔ میں اب جا کر کھانا وغیرہ بنا دوں گی۔“  
 ”کھانا وغیرہ!“ سب نے آنکھیں نکالیں۔  
 جو لڑکی مال کر پانی نہ پیتی ہو۔ وہ کھانا بنائے گی۔ سب







پچھو کو اب اعتراض انور کے قیام پر تھا۔ آخر اب تک وہ خاموش رہی تھیں۔ یہ ان کا احسان تھا۔ صاعقہ کے آنے کے بعد انہوں نے اس سے پوچھنا شروع کیا۔

”دک جائے گا۔ کب تک رہے گا۔ مفت میں رہتا ہے گھانا پیتا ہے۔ جب افتخار یہاں تھا۔ تب تو یہ نہ جانے کدھر تھا۔ وہ سب رشتے داروں سے دور مشقت کی زندگی گزار رہا ہے اور سارے صاحب یہاں عیش کر رہے ہیں۔ صاعقہ! بہانے سے پوچھو تو سہی۔ اے بھی اب جوان بیٹی گھر میں ہے۔ یہ مناسب تو نہیں، شریعت میں بھی اس کی ممانعت ہے۔“

انہوں نے صاعقہ کو بہت سمجھایا۔ صاعقہ نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ ”وہ رات کو اماں کے کمرے میں رہتی ہے۔ انور ماموں صبح ہی اُٹھ جاتے ہیں۔ شام کو آتے ہیں۔ وہ اپنے کمرے میں وقت گزارتے ہیں۔ فاخرہ خود انور کے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ شریف آدمی ہیں۔“

مگر پچھو کو سمجھانا آسان نہ تھا۔ انور گھر میں ہوتے تو کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتے۔ کبھی بچن صاف کر دیا۔ برتن دھو دیے۔ اپنے کپڑوں کا دھونا استری کرنا۔ کبھی بھی بچوں کے کپڑے دھو دیتے۔ صبح ان کے یونیفارم تبدیل کرنا۔ بیگ درست کر کے انہیں لے جانا۔ خاصی ذمہ داری سے کام کرتے تھے۔ صاعقہ نے پچھو کے اکسانے پر ہمت کی۔ فاخرہ سے پوچھ لیا۔

”ماموں عورتوں والے کام کیوں کرتے ہیں۔ مرد تو بچن میں جانا پسند نہیں کرتے۔“

جلد و جلد۔ تعلیم مکمل کی۔ تم لیتی ہو ناول لکھا کرو گے کیا جائے اچھا ہونا ہے۔ انور کا قول ہے کہ محنت کرو۔ جتنی محنت کرو گے۔ صلہ بھی اتنا ہی ملے گا۔ اس نے بہت محنت مشقت سے یہ مقام حاصل کیا ہے۔ اس نے فائدے بھی کئے مگر ہمت نہ ہاری۔“

”آپ انہیں پہلے بلا لیتیں۔“ صاعقہ متاثر ہو گئی تھی۔ ”میری پوزیشن مضبوط نہ تھی۔“ فاخرہ نے کہا۔ ”دوسری بیوی کو لوگ تنقیدی نظر سے دیکھتے ہیں۔ خصوصاً جب پہلی بیوی کی اولاد بھی ہو۔“ وہ چیخ ہو گئیں۔ صاعقہ کو ان کے دکھ کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ اصل بات پوچھ نہ سکی۔ ”وہ تو کچھ اللہ نے ہی سب بتا دیا۔ افتخار کی موجودگی میں ہی اسے یہاں جا بل گئی۔ افتخار نے اسے نہیں رہنے پر مجبور کیا میری اور بچوں کی وجہ سے وہ تو کوئی کمر اُگرائے پر لین چاہتا تھا۔“

”لوگ تو میں نے سنا ہے کہ آپ نے بہانہ کیا ہے انہیں یہاں رکھنے کا۔“ ”تو کیا وہ جا ب نہیں کرتا۔ تم خود دیکھ رہی ہو۔ رات اُٹھ جاتا ہے۔“ اور ایک دن دونوں بہن بھائی میں کوئی بحث جاری تھی۔ وہ اپنی فیصل پر اصرار اندازی کی کتاب سے خاک اتار رہی تھی۔ فاخرہ کی آواز آئی۔ ”ناگل ہو تم۔ اتنا خرچ کر چکے ہو۔ اب بس کرو۔“ ”تو! پہلے بچوں کے لیے کچھ لے آنا تھا۔ تب ہی آپ نفخا ہوتی تھیں کہ بچوں کی عادت خراب ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ افتخار بھائی کی کمائی محفوظ کر لیں۔ میں جمع کر کے کیا کروں گا۔ کیا آدمی ہوں۔ جو کچھ ہے انہی بچوں کا ہے۔ آپ کو تو ان کے بچے ہونے پر تعلیم کے لیے خاصا خرچ کرنا ہو گا۔ پھر صاعقہ کی شادی کرنا ہے۔ وقت پر رقم نکل آئے تو بہت آسانی ہو جاتی ہے۔“

”جانتی ہوں۔ تمہارا وقت بھی آئے گا۔ اس لیے کہاں سے لاؤ گے۔ جب یہاں تمام خرچ کر

ہو گے۔“

”میں مرد ہوں آپا! کمالوں کا افتخار بھائی تین سال کے کنکریٹ پر گئے ہیں۔ وہاں سے اگر پچھو آپ کے لیے مشورہ ہے کوئی پالیسی لے لیں بچوں کے لیے کام آئے گی۔“

”غرض یہ کہ تم۔ اسی طرح یہاں کے اخراجات پورے کرتے رہو گے۔“

”آپا! آپ کے سوا میرا اور ہے کون۔ میں چاہتا ہوں ان بچوں کو مضبوط مستقبل کی ضمانت ملے۔ جب تک یہاں ہوں اس گھر کی ذمہ داری میری۔ آپ چپ رہیں میرا فرض ہے اور مجھ پر بچوں کا فرض۔“ فاخرہ کو گریہ آواز میں کہہ رہی تھیں۔ ”انور! میں بھی چاہتی ہوں اپنا حق اور فرض ادا کروں۔ تم اپنے لیے بھی کچھ سوچو اپنا گھر بناؤ شادی کرو گھر بساؤ۔“

”آپا! بس کچھ ہو جائے گا اللہ کی مدد سے کمالوں کا۔ ذرا میرے بھانجوں کو برساتو ہونے دیں۔ وہ میرا گھر بھی بنادیں گے اور بسا بھی دیں گے۔“ ”لے سنے کیا بڑھالے میں شادی کرو گے؟ ٹاہلیا۔“

”اے دو افتخار کو گھر کی ہوں انتظام۔“ صاعقہ کو یہ الگ قسم کا مردانہ نظر آیا۔ بھانجوں کی فکر میں بیٹلا۔ میری شادی کی بھی فکر ہے۔ کتنا عجیب ہے! چاکھرا بے غرض اٹھا رہا۔ اب ان خونچوں کا ذکر پچھو سے کیا تو وہ اٹھنا ناراض ہوئی گی۔

میں اب وہاں جاؤں گی ہی نہیں۔

✽ ✽ ✽

اب فاخرہ نے انور کا پچھالے لیا۔

”تمہارے بھنونی آنے والے ہیں۔ ان کے سامنے تمہاری شادی کر کے فرصت پاؤں اب تم لڑکی خوب پسند کرو گے۔“

”افسوس میں کہاں جا کر پسند کروں گا۔“ گویا راضی تھے جناب۔

”بھئی۔ مجھے کیا علم۔ تم کیسی بیوی چاہتے ہو۔“

# عمران ڈائجسٹ

Email: id@khawateendigest.com



فروری 2013 کے شمارے کی ایک جگہ

## اطاطولہ کا پاسیان

اس ناول کی نگارہ نے اپنی پہلی کتاب ”اطاطولہ کا پاسیان“ لکھی۔ اس ناول میں ایک عورت کی زندگی کا سفر دکھایا گیا ہے۔

## داسی

داسی ایک ناول ہے جس کی نگارہ نے اپنی پہلی کتاب ”داسی“ لکھی۔ اس ناول میں ایک عورت کی زندگی کا سفر دکھایا گیا ہے۔

## جادوگر

جادوگر ایک ناول ہے جس کی نگارہ نے اپنی پہلی کتاب ”جادوگر“ لکھی۔ اس ناول میں ایک عورت کی زندگی کا سفر دکھایا گیا ہے۔

## کڑیاں

کڑیاں ایک ناول ہے جس کی نگارہ نے اپنی پہلی کتاب ”کڑیاں“ لکھی۔ اس ناول میں ایک عورت کی زندگی کا سفر دکھایا گیا ہے۔

## دیا اور طوفان

دیا اور طوفان ایک ناول ہے جس کی نگارہ نے اپنی پہلی کتاب ”دیا اور طوفان“ لکھی۔ اس ناول میں ایک عورت کی زندگی کا سفر دکھایا گیا ہے۔

## تکاحال

تکاحال ایک ناول ہے جس کی نگارہ نے اپنی پہلی کتاب ”تکاحال“ لکھی۔ اس ناول میں ایک عورت کی زندگی کا سفر دکھایا گیا ہے۔

## خاموش فاتح

خاموش فاتح ایک ناول ہے جس کی نگارہ نے اپنی پہلی کتاب ”خاموش فاتح“ لکھی۔ اس ناول میں ایک عورت کی زندگی کا سفر دکھایا گیا ہے۔

## حصول

حصول ایک ناول ہے جس کی نگارہ نے اپنی پہلی کتاب ”حصول“ لکھی۔ اس ناول میں ایک عورت کی زندگی کا سفر دکھایا گیا ہے۔

## خودکشی

خودکشی ایک ناول ہے جس کی نگارہ نے اپنی پہلی کتاب ”خودکشی“ لکھی۔ اس ناول میں ایک عورت کی زندگی کا سفر دکھایا گیا ہے۔

## جرم و سزا

جرم و سزا ایک ناول ہے جس کی نگارہ نے اپنی پہلی کتاب ”جرم و سزا“ لکھی۔ اس ناول میں ایک عورت کی زندگی کا سفر دکھایا گیا ہے۔

## سبوتی سالگرہ

سبوتی سالگرہ ایک ناول ہے جس کی نگارہ نے اپنی پہلی کتاب ”سبوتی سالگرہ“ لکھی۔ اس ناول میں ایک عورت کی زندگی کا سفر دکھایا گیا ہے۔

## اعتراف جرم

اعتراف جرم ایک ناول ہے جس کی نگارہ نے اپنی پہلی کتاب ”اعتراف جرم“ لکھی۔ اس ناول میں ایک عورت کی زندگی کا سفر دکھایا گیا ہے۔

فروری 2013 کا شمارہ آج ہی خرید لیں



”تپا! جانتی تو ہیں آپ۔ بس صفائی پسند ہو، سلمان سمیٹ سمیٹ کر تھک جاتا ہوں۔“

”یوں کہو کہ سلمان نکھر کر پھر سمیٹ کر تھک جاتا ہوں۔ بیوی کا یہی کام رہ گیا ہے کہ تم بکھراؤ، وہ سیٹھ یہ تو اس پر ظلم ہو گا۔ میرا خیال ہے تمہیں وہ لڑکی سوٹ کرے گی۔ جو خود آکر کے۔ میں انور سے شادی کر لیتی ہوں۔“

”تپا!۔“ احتجاجاً ”زور سے بولے۔“ ”کر لیتی ہوں سے کیا مراد ہے۔ کوئی مجبوری ہے؟“

”ہو سکتا ہے۔ اس کی ہی مجبوری ہو۔“

فاخرہ ہنس دس۔ بچے ہو موم ورک کر رہے تھے۔ وہ بھی ہنس پڑے۔ کچھ سمجھنے لگی۔

وقت رنگ رنگ کر گزر رہا تھا۔ گھر پر بچے ہوتے تو صاعقہ کا ہاتھ بنا دیتے۔ ماموں کو دیکھ کر وہ بھی اپنے کام کرنے لگے تھے۔ پیپھو آجائیں۔ اس سے کہیں۔

”لوکی! تم تھکتی نہیں ہو۔ کوئی کام فاخرہ کو بھی کرنے دیا کرو۔“

فاخرہ پٹپٹا جاتیں۔ ”تپا! میں چاہتی ہوں، مگر یہ روک دیتی ہے۔“

”پیپھو! اماں! کو بہت کام ہیں۔ بچوں کی تربیت، ان کی دیکھ بھال۔“ کہہ کر سامنے سے مل جاتی۔

ماموں ایک بار آئے تھے۔ اس کا سلمان لے کر۔ رکے نہیں، کیونکہ انہیں خالہ جان کے پاس جانا تھا۔

اقرا، انصی کے رشتے آئے ہوئے تھے۔ ان کے مشورے کے لیے۔

\*\*\*

ابا آگئے۔ گھر میں جشن کا سماں ہو گیا۔ خالہ جان بھی آئیں ابا سے ملنے، علی حسن کے ساتھ اقرا، انصی کی شادی کا بلاوا دے کر گئیں اور ساتھ ہی صاعقہ کو بہو بنانے کا عندیہ بھی دیا۔ ابا سوچ میں پڑ گئے۔

پیپھو نے سنا۔ وہ بھی آگئیں۔ خوب خفا ہوئیں۔ یہ سن کر کہ ابا کو علی حسن بطور داماد پسند آگئے تھے۔

”فتح!۔ واہ۔ بھئی۔ تم بھی خوب ہو۔ سالی کا پینا پسند آگیا۔ بھانجا نظر نہیں آیا۔“

ابا حیران۔ ”تپا! آپ نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔“

”وہ تو بیٹھ صاعقہ پر اعتراض ہی کرتی تھیں۔ ان سے شکایتیں کرتی تھیں اور ان کو منع کرتی تھیں کہ صاعقہ کی ہر ضد پوری نہ کیا کرو۔“

”تو اب کہہ رہی ہوں، دیکھو اپنے بھانجے ریوڑی کے بھانجے کو فوجیت نہ دینا۔ جلدی جواب دو، کب آؤں جواب لینے۔“

”میں ذرا۔“ ابا کسمسائے۔ ”صاعقہ سے بھی۔“

”الٹی کو پڑی ہے تمہاری۔ ارے۔ اسے تو وہ خالہ کا پتہ ہی پسند آئے گا۔ مگر میں وہاں ہونے نہیں دوں گی۔ لو اور سنو، صبیحہ کے میاں کو جانتے نہیں ہو۔ دنیا بھر کا بد معاش۔ کیا پتا بیٹے میں بھی اس خون کے اثرات ہوں۔ بلکہ ضرور ہوں گے۔“

”تپا! پلینس۔ ہم کسی کے بارے میں اس طرح تعین سے نہیں کہہ سکتے۔ آپ ذرا انتظار کریں۔“

”مگر کے دیتی ہوں۔ اگر میرے ارشد کو انکار کیا تو وہاں بھی نہیں ہونے دوں گی۔ یاد رکھنا! امارت کے دن سب مہمانوں کے سامنے بڑے میاں کے پول کھول دوں گی۔“

پیپھو چلی گئیں۔ صاعقہ کو بلا کر فاخرہ نے بات کی۔ سوچنے کے لیے وقت بھی دیا۔ وہ اچھل پڑی۔

پیپھو؟ اور ان کا وہ چشمہ! وہ عسلی مزاج! چھوٹے قد کا چھوٹا آدمی۔ جسے صاعقہ میں خرابیاں ہی نظر آتی ہیں۔

علی حسن بہترین انسان، خالہ جان محبت سے گندھی ہوئی، کھسیہ، محل، جیسا، دولت کی ریل چل، نوکروں کی قطار، عیش، آرام اور محبت ہی محبت مگر خالہ جان؟

خالہ جان کو اس نے خود فون کیا۔ اطمینان دلادی تھیں۔

”علی حسن بہت شریف النفس نوجوان ہے۔ باپ

سے اسی لیے ناراض رہتا ہے، تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔“

وہ جانتی تھی۔ اسے ”تکلیف“ ہوگی۔ خالو جان کا سامنا کرنا اذیت کا سبب بن سکتا تھا۔ اب اسے جواب دینا ہے۔ پیپھو کل جواب لینے آئیں گی۔

خالہ جان بھی کل فون پر بات کریں گی۔

شریف النفس انسان کے خون میں کبھی بھی باپ کے خونی اثرات جوش کھا سکتے ہیں۔

پیپھو صرف اس پر اعتراض اُن کا پینا عیب جوئی کا ماہر خود پسند۔

علی حسن بہترین انسان، قدر دان، اب خالو جان کیا کریں گے۔ ان سے کسی نے پوچھا بھی ہے یا نہیں۔ وہ اب کیا سوچتے ہوں گے۔ کیا کرس کے سبب سن کر۔

”اوپ۔ اب جو کرنا ہے مجھے ہی کرنا ہے۔“

ابا فکر مند تھے۔ ایک طرف بسن، دوسری طرف محبت کرنے والی سالی، مقابلہ سخت تھا۔

صاعقہ دھلے ہوئے کیڑوں کی تہ لگا رہی تھی۔ عنیقہ کی چری ابھی گیلی تھی۔ اسے مزید دھوپ کی ضرورت تھی۔ گھر اٹھ میں اسے لیے وہ فاخرہ کے کمرے میں آگئی۔ غور نہیں کیا کہ وہاں اور کوئی بیٹھا ہے۔ دل دھڑ دھڑ کر کے ٹپکنے لگا تھا۔

”ابا سے کہہ دیں اماں!“ گلا اتنے میں ہی سوکھ چکا تھا۔ ”نہ چشمہ! اور شد نہ ہی علی حسن بھائی، میں انور ماموں سے شادی کر لوں گی۔“

فاخرہ کا تقہ اور ساتھ ہی پیٹھ موڑے بیٹھے ہوئے انور نے کھڑے ہو کر سر پر ہاتھ مارا۔ ساتھ ہی ”تپا“ کا احتجاجی نعرہ وہ سٹپٹائی۔

”کیا میں بہت مولی ہوں۔ سارے کام سیکھ لیے ہیں میں نے اب تو۔ باقی اماں سکھا دیں گی۔ ان کے پاس رہوں گی تو۔“ سراسیمگی طاری تھی۔

”تپا! خدا کا واسطہ۔“ انور بھیجی ہوئی آواز میں بولا تھا۔ ”اور کچھ نہیں، انہیں صرف شرم کرنا سکھا دیں۔“

بھئی ہوئی عنیقہ کی جری انور کے منہ پر مار کر وہاں

سے بھاگی تو اندر آتے ہوئے ابا سے ٹکرائی۔ شدید قسم کی مسکراہٹ سے چہرہ مزین تھا۔ یہاں سے وہاں تک باپچیں چری ہوئی۔ بیٹی کے کارنامے پر داد دیتی مسکراہٹ۔

”انور میاں! میری بیٹی کچھ سیکھے یا نہ سیکھے۔ اسے شرم آئے یا نہ آئے۔ صحیح فیصلہ کرنا آگیا ہے۔ پہلے وہ جس سے قطعی ناواقف تھی اور بیٹھ کی طرح اس کے فیصلے پر عمل بھی کر لیتا ہوں، غوری عمل۔“

فاخرہ اور ابا کی کھکھلاہٹ کے ساتھ انور کی شرمندہ ہنسی۔

صاعقہ واقعات میں زبان دبا کر بھاگی تو کمرے میں جا کر منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔



**خواتین ڈائجسٹ**

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

**میرے ندیم**



میرے ندیم

**رضیہ جمیل**

مکمل نیا کاغذ

32735021 فون نمبر





”مجھے یقین ہے یا رب یہ حسب معمول بہت عمدہ اور معیاری تحریر ہوگی مگر تم نے تو پہلے ہی ہولادیا یہ کہہ کر ٹیچڈی ہے۔ ٹیچک اسٹوری پڑھ کر قارئین کے شکوے بھرے فون اور خطوط کا نانا بندھ جانا ہے تمہارے کہنے پر میں اسے دیکھ لوں گی۔ لگا بھی دوں گی مگر تم یہ دیکھو صرف تنقید آئے گی۔ کہانی کی کردار نگاری، بہت منظر نگاری، برجستگی، سب دھری کی دھری رہ جائے گی اور دیکھو نا، پہلے ہی اتنے دکھ ہیں

فک و فطرت

ہماری زندگیوں میں۔ چند بے قلمی کے گزارنے کے لیے ڈائجسٹ کھولیں تو وہاں بھی دیکھ۔ نہیں نہیں۔“ مدیر نے بڑی وضاحت سے قارئین کا مزاج اسے بتایا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر وہ زندگی کا بہت بڑا حصہ ہیں، حقیقت ہیں اس سے انکار کیسے ہو سکتا ہے۔ سمجھ، دکھ ساتھ چلتے ہیں۔ بلکہ غم اور خوشی جڑواں بہن بھائی کی طرح ایک ساتھ جنم لیتے ہیں مگر ساری زندگی اکٹھے نہیں ہوتے، ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے پر وقتی طور پر حاوی ہو جاتے ہیں، مگر حاکمیت برقرار نہیں رکھ پاتے، ہم دکھ سے انکار نہیں کر سکتے۔“ وہ شاید حقیقت سے آگاہ کر رہی تھی۔

”تو کون کر رہا ہے انکار، مگر تم یہ بھی تو دیکھو ہماری اپنی زندگیوں میں اور گردائے دکھ اتنے آنسو ہیں اتنی محنت چائیاں کہ حلق کڑوا ہو جائے۔ قارئین کہتے ہیں۔ خدا را آپ تو ایسی روتی کر لاتی کہانیاں مت چھپا کریں۔ آپ بس ہسایا کریں۔ خوش کیا کریں۔ ایسی کہانی دیا کریں کہ دنوں دل و دماغ خوشی کے احساس سے جھومتے رہیں۔ میرے پاس اتنی عجیب و غریب فرمائشیں آتی ہیں کہ تم بھی فرصت سے آکر پڑھو تو دنگ رہ جاؤ۔ رائٹر پوری تھہم کے ساتھ کہانی بڑھا رہے۔ اوہر قاری کو ذرا سا بھی خدشہ ہو تو رو رو رہے۔ حال ہو جاتی ہیں۔ خدا کے لیے فلاں کے ساتھ کچھ برا نہ کیجئے گا اور فلاں کی شادی فلاں ہی سے کروانی ہے۔ پلیز اس کو اس سے جد امت کرنا۔ سالوں اس کے غم





میں بے حال رہتی ہیں۔“ ایڈیٹر صاحبہ اپنے جملے کے اختتام پر بس دیر۔

رائٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی کرن چمکی۔

”آپ صحیح کہتی ہیں۔ مگر لکھنے والا تو زندگی کے ہر پہلو کو دکھاتا ہے، خوشی، غم، جھوٹ۔ دنیا میں یوں بھی ہوتا ہے، قاری کو معلوم ہونا چاہیے نا۔“ ایڈیٹر کی حقیقت بیانی کے آگے اس کا جذبہ الفاظ کو دکھایا تھا۔

”جس“ یوں“ کا ذکر تم کر رہی ہونا“ اس کا انہیں بخوبی علم ہے۔ انہیں اسی سے تو فرار چاہیے۔

فینٹسی۔۔۔ یوٹوپیا۔۔۔ خوابوں کا شہزادہ، گھوڑے پر سوار مہاراجہ اور اچانک دن بدل جائیں۔ میں نہیں بتاؤں۔۔۔“ ایڈیٹر پھر یاد آنے پر کرسی کے اگلے پیروں پر جھک آئیں کہنیاں میز سے ٹکا کر۔ وہ ہمہ تن گوش ہوئی۔

”فرحت اشتیاق کا ہی ناول دیکھ لو۔ عالی کو مرنا ہی تھا۔ عالی نہ مرنے تو ہنیا کی بے غرض محبت اور خلوص ظاہر ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ کہانی کا تقاضا تھا۔ مجھے بانا دیا اور فرحت کا توپتا نہیں، میرا شر ہو گیا قارئین کے آنسو پونچھ پونچھ کر وضاحتیں دے دے کر۔۔۔ اب تک خط آتے ہیں۔ قارئین باقاعدہ مشورہ دیتی ہیں۔ عالی کو زندہ کر دیں۔ اصل زندگی میں چاہے کتنے ہی ظلم کے پہاڑ کسی بے بس غریب پر توڑ رہے ہوں۔ کہانی میں انصاف ہونا چاہیے۔ ہماری قارئین تو بہت شدید محبت کرتی ہیں ان خیالی پیکروں سے اور پھر ہمیں توپتا ہے لڑکیوں کے دل کیسے نرم ہوتے ہیں۔“ ایڈیٹر اب بول بول کر تھک گئی تھیں۔

”مگر آپ بڑھے بغیر بیچکٹ مت کریں۔ ایک بار پڑھ لیں۔“ وہ مایوس سی ہوئی۔

”مگر شل ازم کا زمانہ ہے یا۔۔۔ ہر چیز بکتی ہے۔ ٹی وی چینلز پر دیکھ رہی ہو، ویسے ساس، ہمو کی چٹپٹاش، دو بہنوں کا حسد، وہی روٹاں۔۔۔ اور قارئین دکھ بھی برداشت کر لیتے ہیں اگر آخر میں سکھ مل جائے، وہ سب اچھی ایڈ جانتی ہیں۔ بے شک سارے زمانے کے دکھ اور مشکلیں دے دیں، انجام اچھا رکھیں اور قاری پر

سارا الزام کیا دھرتا ہم سب بھی توجہ نگواریت /  
 قابلیت کو پسند کرتے ہیں۔“  
 ”آپ پڑھ کر تو بیکھیں۔“  
 ”تم بیل چھوٹانے کرو، میں اسے ضرور دیکھوں گی /  
 تمہارے فلم کے ہنریٹین نکا ہے مگر۔ میری مجبوری /  
 سمجھو۔ اچھا! تم فکر نہ کرو، میں اسے پڑھ لوں /  
 گی۔“  
 اس کے اترے چرے کو دیکھ ایڈیٹر نے تسلی دل /  
 سہلا کر رہ گئی۔

☆☆☆

نہ ساس کو سننے کو زندہ تھیں، نہ ننڈیں ٹوکنے پر /  
 کمر بستہ۔ شوہر اللہ کی رضا میں راضی بہ رضا رہتے /  
 ہوئے خاموش رہے مگر گھول میں اپنی کی طرح گر گیا تھا /  
 اور ہر جنبش پر ایسی ٹیسس اٹھتی تھیں کہ اللہ انہیں /  
 کسی اور نے اگر کیا سوال اٹھانا تھا۔ طعنے دینے تھے /  
 دل جلاتا تھا، ترم جتانے تھا۔ جب وہ خود ہی بن بانی پھولی /  
 کی طرح تڑپتی جا رہی تھی۔ اس کی حالت دگرگوں /  
 تھی۔ اسے گروت بدلنے کے لیے بھی سہارے /  
 ضرورت تھی مگر ایک جینوں جسم میں بجلی بن کر دوڑنا تھا /  
 اور وہ اچھل اچھل جاتی تھی۔

اس نے گل پیٹ پیٹ کر دکھائے تھے، وہ اپنے /  
 پیٹ پر کھونے مارتی تھی اور انوں پر دوڑا تھڑ۔ اس نے /  
 پیٹ کے پاس سے اپنی ٹیسس پھاڑ ڈالی تھی۔ /  
 تمام دعاؤں، ٹوٹوں، ٹوکوں، تعویذوں اور فقریوں /  
 کے باوجود اس نے چھٹی بیٹی کو جنم دیا تھا۔

اس کی چار بیٹیاں سب سے بڑی بیٹی کے ساتھ /  
 باورچی خانے میں چھپی بیٹھی تھیں۔ وہ شور مچانے سن /  
 کر گھر کے دروازے تک آئیں تو ماں نے جو ہاتھ /  
 لگا ان کی جانب پھینک دیا تھا۔ جوتی، گلاس، نوکری /  
 نکلی۔ بڑی سمجھ دار تھی وہ، ہنوں کو پچکاری لے آئی۔ /  
 اور وہ چھٹی نوزائیدہ بچی۔ دوسرے پنگ پر کھل /  
 میں لیٹی بے حس و حرکت پڑی۔

بڑی آجی صبح ہی سے سفر نکلی تھیں کہ وقت /  
 پہنچ جائیں مگر روڑھے گڈنے کی سواری۔ وہ ڈیلوری

کے بعد اس وقت گھر میں داخل ہوئیں جب نفیسہ سیلاب ڈال کر بیٹھی تھی۔  
وہ نصف سے اسے دیکھتی رہیں۔ جس کے بین شدت سے ہونے لگے تھے۔ کچلے پڑوس کی عورتیں اس نفیسہ کو جتنی تھیں۔  
آپاجی نے کبل میں لیٹے وجود کو اٹھا کر سینے سے لگایا۔  
وہ کب کے باوجود قطرے کبل کے ریشوں میں گم ہو گئے۔  
”آئے والی نفی جان کا سیلا کیا تصور؟“  
کبل سرکار بہت اشتیاق سے دیکھا۔ حسب توقع نفی بری خوب صورتی میں پچھل پانچ سے بڑھ کر تھی۔ حتیٰ سے پچی آنکھیں۔ چھوٹی سی ناک تازہ ہنسی روئی کے ریشے جیسی نرم بے وزن پھولی پھولی پھاندی جیسی۔ اس کے لرزے غنای ہوئے۔ انہوں نے اپنے ہونٹوں کی گماش اس کی پیشانی سے چپکا دی۔ وہ گنپ رہی تھی اور ٹھنڈی برف تھی۔ آپاجی نے اسے اپنے سینے میں سمولیا۔  
”کیسے لاوارثوں کی طرح خود سے دور پھینک رکھو۔ تیرے جگر کا ٹکڑا املی۔ اور تو؟“  
”ہائے!“ نفیسہ نے کروں ڈھلکا دی۔ ”اتنی سی میری جان۔ (وہ دلی تکی تھی اور اس وقت ہڈیوں کا بچہ رکھائی دیتی تھی)۔ اندر جگر بھی اتنا سہا ہی ہو گا اور اس کے پورے چھ ٹکڑے۔ اب میرے اندر جگر کمال رہا آپاجی! اہل کے راکھ ہو گیا۔“  
”ایسے نہیں کہتے غمائی۔ نبی کا سلام آیا۔ اللہ کی رحمت اور تو؟“  
”ہائے سارے مجھے ہی حدیثیں سنانے آتے ہیں۔“ وہ سر دائیں بائیں ہنسنے لگی۔ ”مہنہ رحمت ہے تاکا ہی! ہر حد سے زیادہ پڑ جائے تو سیلاب بن جاتا ہے بے (نند) ٹوٹ جاتے ہیں۔ درخت کی جڑیں مٹی چھڑ دیتی ہیں۔ سب تپس نہیں سیلاب ہر شے کو برباد کر جاتا ہے۔ میں تو پھر کمزور ذات۔ چندہ سالوں سے ڈوے کھا رہی ہوں۔ مرنے بھی نہیں ہائے اور با!“  
”لہو بھی مجھے کو تیار ہی نہیں تھی۔ بس شکوے

کرتی تین ڈالسی کو سے جاتی اور خود کو جیتی۔ بچے بند کرنے کا سان و گمان بھی نہیں تھا تو علاج کیسا۔ لہذا بچے ہر سال آتے اور آنے ہی تھے۔ بیس برس کی نفیسہ کی جوانی کے ابھی کئی سال باقی تھے۔

”چل اللہ دے گل آزماتا ہے بندے کو۔ اس کے دل پر ہے اندھیر نہیں بادل بٹا رکھ لے۔ کالی کو گود میں ڈال کر بسم اللہ۔“

نفیسہ: ”آپنی کو انکار نہیں کر سکتی تھی۔“

”بسم اللہ نہ بولیں آجی۔ کسیں الحمد للہ۔ تے بس۔ ہائے۔ اگر اگر فیروز لڑی ہو گئی؟“

”اچھا۔ بس۔ بس۔“ آپاجی بھی دل گئی تھیں۔

”تو پکڑاے۔“

\*\*\*

اور اسی نفیسہ کے گھر وہ ساتویں بیٹی بن کر اترتی اور اس بار نفیسہ کو سکتہ ہو گیا تھا۔ پھر بے حس کی چادر اوڑھ کر وہ سب سے منہ موڑ بیٹھی۔ سب سے بڑی سولہ برس کی سلمیٰ تو بے پروئی ڈالنے کے قابل ہو چکی تھی۔ باقی پانچ بھی اپنی بساط پر برا گھر سمجھائیں مگر بے نام بچی کو صرف مال کی طلب تھی اور اس کی ضروریات مال ہی پوری کر سکتی تھی۔

”سارے گوڈے گئے ان جو کھول کو دودھ پلا پلا رہ گئے۔ میں تو ہل بھی نہیں پاتی، دودھ کہاں سے اترے۔“

نفیسہ: جبلی تقاضوں سے مجبور اسے سینے سے چپکا ہی لیتی، تب بھی بچی کو سیری حاصل نہ ہو پاتی۔ وہ بھوک کے مارے ہلک جاتی۔

بڑی بہنیں چچے سے قطرے نکالتیں۔

تین ماہ تک بے نام رہنے کے بعد آجی ہی نے اسے نام دیا۔ ”رضیہ“ اور ساتھ تخت فنیبیہ کی۔

”میں نے دیکھوں اسے گندے سندے حائل میں۔“

آج تیری ممتانی سے تنگی گندی بڑی ہے۔ منہ پر کھیاں اور بدبودار بو ترے۔ تیری مامتا کے بھروسے رب رب سونے نے انسان بنا کر اتارا اسے، اگر ایسے جانوروں



طرح اہم ہیں۔“

بادشاہ کو یہ مثال بہت ہلکی لگی۔ اسے اپنی بے عزت محسوس ہوئی اور اس نے شہزادی کو تنہا جنگل میں چھوڑ دیا۔

مگر رضیہ نے تو ابھی بولنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ اسے ابھی ریس گلے اور نمک کے فرق اور اہمیت کی بھی خبر نہیں تھی۔ مگر اسے ملک بدر کر دیا گیا۔

نفیسہ اور اسحاق خالہ زاو تھے اور شاہین تیسری خالہ کی بے اولاد بیٹی۔ نفیسہ آٹھویں بار ماں بن رہی تھی۔

شاہین نے منہ سے تو کچھ نہ کہا تھا، مگر اس نے نفیسہ اور اسحاق کو اشارہ کر دیا تھا کہ اگر خدا درخواست بیٹی ہوئی تو اسے دے دی جائے، بظاہر سب کے ساتھ بیٹے کے لیے دعا گو تھی مگر اس کا دل سب پر اس بار نفیسہ کی جیت ہو گئی اس نے بیٹے کو جنم دے دیا تھا۔

”ہائے میں مری۔“ شاہین تورائی۔ وہ تو پوری بچہ نوکری سجا کر لائی تھی۔ اسحاق کے گھر ہر بار زچگی کے روز چین ہی پڑے تھے۔ مگر اس بار شاہین بچھاڑیں مار رہی تھی۔

”میں اپنی بہن بھائی کی خوشی میں خوش ہوں یقین کریں آپ سب لوگ، مگر تو اپنے لیے رہی ہوں۔“ اس نے حاضرین کو مخاطب کیا۔ ”میری قسمت ہی خراب ہے۔ پہلے مقصود نہ مانا۔ پھر شرط لگا دی منڈا ہی لینا اب بتاؤ کوئی منڈے دیتا ہے۔ پھر ساس نے سیلا ڈال دیا۔ سرالوں ہی سے لینا۔ جائیداد جو اسے ملے گی۔ دیوہر مانا تو سچہ مرہ ہوا۔ مندر عین ٹائم پر مگر گئی۔ ہائے یہاں ہائے۔ ہائے“ وہ سر پر زور زور سے ہاتھ مار رہی تھی۔

نفیسہ خوش تھی۔ اسحاق خوش تھا۔ بہنیں خوش۔ محلہ پڑوس سب نہال ایسے میں شاہین دکھے۔

شاہین خوب زمینیں لے کر سرال آئی تھی۔ چھوٹی نہیں جاسکتی تھی۔ شادی کی اجازت اس نے

والا حال ہی دینا ہوتا تھا، بلا بنا کر نہ بھیج دیتے۔ بلی تک چاٹ چاٹ کر صاف کر لیتی ہے تو ان ہلکتوں سے بھی گئی گزری نکلی۔ چل دھو دھا کر لاسے۔“

پھر خود ہی انھیں بچی کی بالمش، صفائی ستھرائی کے بعد خوب پاؤڈر لگا کر جب آنکھوں میں سرے کے ڈورے کھینچے تو مکمل ہو گیا۔ اتنی سوہنی ملائم پری جیسی اس کی جھکی جھپٹیاں خوب صورتی میں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں مگر اس رضیہ نے تو۔

اس کے دماغ میں جو مرضی چلتا اور زبان سے نکلتا، تھی تو وہ ایک ماں ہی۔ لگایا سینے سے نمک جو ناپسندیدگی اس کی آمد سے پہلے تھی، بلکہ اس کے آچانے کے خدشات سے بھی پہلے کی تھی وہ ظاہر ہوئی رہتی۔

”اے رضیہ! اے رچیہ! رجو۔“  
”نی رجو اسی رج گئے آل۔ ساڈا دل رج گیا نی رجو!“

”ہی نکونک رج گئے۔“  
اور بچی ماں کے مخاطب ہونے پر قلقاریاں مارتی، ہاں اسے لاؤ کر رہی تھی، بہلا رہی تھی اور وہ ہل رہی تھی۔

مگر زندگی اتنی آسانی سے بہلائی نہیں جاسکتی۔ زندگی دورو پے والی بچہ کہانی نہیں ہوتی، جس میں مملکت خدا داد کا بادشاہ اپنی سات بیٹیوں کے ہمراہ بڑی رحم دلی اور خوشی سے حکومت کرتا ہے اور راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔

دور دراز میں ایک بادشاہ کی سات بیٹیاں تھیں خود سے اپنی بیٹیوں کا پیار تاپنے کو بادشاہ نے پوچھا۔  
”میں تمہاری زندگی میں کتنا اہم ہوں۔ مثال دو۔“  
ایک نے کہا، ”آپ ہوا جیسے ہیں۔“

دوسری نے کہا، ”آپ پائی کی طرح ضروری۔“  
تیسری نے کہا، ”آپ روشنی ہیں۔“  
چوتھی نے کہا، ”آپ ٹیٹھارس گلا ہیں۔“  
”اور آپ۔ اور آپ۔“

ساتویں نے کہا۔ ”آپ میری زندگی میں نمک کی



دی نہیں تھی۔ نہ دینے کا ارادہ تھا۔

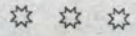
آجی نفیسہ کی خوشی میں خوش تھیں۔ باہر دھول پٹنے کی آوازیں تھیں، کھسروں کی بدھائیاں اور تالی کی آواز۔ شاہین کے رونے پر حاوی ہوئی۔

”اللہ، ہی چاہتا ہے، میں خالی گودی رہوں۔“ وہ چادر سر پر جھاٹ کر اٹھائے شکستہ قدموں سے واپسی کو تیار تھی۔

”آج مرادیں پوری ہونے کا دن ہے مکی!“ نفیسہ کے اندر جیسے کسی عالم دین کی روح حلول کر گئی۔ وہ صبر، شکر، تحمل، برداشت پر غلبہ دینے لگی۔

نفیسہ اور اسحاق نے بس آنکھوں آنکھوں میں ہی فیصلہ کیا تھا اور مال کی رضائی میں کھسی تیرہ ماہ کی رضیہ کا ہاتھ شاہین کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔

نفیسہ نے صرف خطاب نہیں کیا تھا ایثار و قربانی کا عملی مظاہرہ بھی کر ڈالا تھا۔



اس نے اپنے سرال والوں اور دنیا کی چلتی زبانوں کے آگے بندھا دیا تھا۔

اگر شاہین ایسا سوچتی تھی تو یہ یقیناً ”اس کی خام خیالی تھی۔ بچہ اپنا ہی ہوتا ہے۔ پھپھیاں چاہے کیسے نئی بچی کو لاؤ کرتے۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کی طرف دیکھنے کو بھی دل نہیں کرتا تھا۔

یہی حال دادا، دادی کا تھا۔ وہ کیسے اپنے دل میں اس کے لیے پار پیدا کر سکتے تھے۔

رضیہ شاہین کی زندگی میں تبدیلی بن کر آئی۔ وہ اسے سجا بنا کر رکھتی۔ نوالے منہ میں دیتی اور اپنی آنکھوں میں سلاتی۔

رضیہ اتنی چھوٹی تھی کہ اسے رویوں کی جانچ ہی نہیں تھی۔ اس کی تمام ابتدائی ضروریات بہ حسن و خوبی پوری ہو رہی تھیں اور کیا چاہیے۔ لیکن ہوش سنبھالنے پر اس نے محسوس کیا۔

وہ صرف شاہین کی زندگی کا حصہ تھی اور شاہین نے اپنی ممتا کی تسکین کے لیے بچی کو دے لی تھی۔ مگر رفتہ

رفتہ وہ ایک ایسا ہتھیار بن کر اس کے ہاتھوں میں رہ گئی جس کا نشانہ ہمہ وقت اس کے سرال والے ہوتے۔

وہ اسے سجا بنا کر رکھتی، پیروں میں سونے کی وزنی جھانچھ۔ کانوں میں بالے، جن کے وزن کو سارے کے لیے سرخ ڈوری کان کے اوپر چڑھی رہتی۔ موٹے کڑے، گلے میں گائی، ٹانگ نکال کر ماتھے کے عین سامنے دائیں بائیں چاندی کی دو ہنسی۔

وہ اپنی نند کو جلائی، جس نے عین ٹائم پر بیٹی دینے سے منع کر دیا تھا۔

”تیری بیٹی کو بھی ایسے ہی شزار دیوں کی طرح رکھتی۔“

شاہین کے سرال والوں، محلے والوں اور ملازمین کی مہربانی سے رضیہ بہت پہلے واقف ہو گئی کہ وہ شاہین کی لے پالک بیٹی ہے مگر اس انکشاف نے اس کی زندگی کو تیز ملا نہیں کیا۔ وہ اتنی چھوٹی، نا سمجھ تھی کہ کسی گہرائی میں نہ ڈوبی۔ شاہین اس سے بے حد پیار کرتی تھی۔

اپنی ہم جماعتوں میں اس کا درجہ اول تھا۔ گاؤں کی امیر غریب سب عورتیں اس کے زور اور کپڑے چھو چھو حسرت سے دیکھتی تھیں۔ باپ کی کمی کا احساس ہوتا تھا۔ جب کبھی وہ میٹھنگانی سے ارد گرد کا جائزہ لیتی۔ مقصود نے کبھی اس سے منہ دیکھے کا بھی لاڈ نہیں کیا تھا۔ بے اولادی کا طعنہ شاہین کے لیے زندگی موت کا مسئلہ تھا مگر اس نے یہ مصیبت نہیں پالی۔

شاہین مقصود کا بچہ دوست کی انگوٹھی بیٹی تھی اور تمام زمین جائیداد اسی کے نام تھی۔

شاہین کا کھونا اس جانب سے مضبوط تھا۔ جب ہی ساس ننڈیں اپنے ہزاروں جتن کے باوجود بھی دوسری نہیں لاسکیں۔ جبکہ خرابی شاہین میں ہی تھی۔ مگر مقصود کے لیے دوسری کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ دوسری کے لیے دوسرے راستے تھے۔

بلکہ دوسری کیا۔ تیری، چو تھی، پانچویں، چھٹی۔ جائز کریں تو چار کی حد بندی ہے، ناجائز تو پھر۔

وہ تلے والے کھے اور کڑک کپڑے پہن کر موٹھوں کو ٹاؤ دیتا دوستوں کے جلو میں سب سے آگے سینہ

باز کر چلتا اور دوست سب مطلبی، اسے شاہین کی طرف سے فکر نہیں تھی۔ وہ اپنی تل اولاد کے کر چاہوں کا گھنسا سنبھالے بڑی بے فکر تھی۔

پہلے ساس ننڈوں کے طعنوں پر اس سے لڑتی تھی۔ ”میرا کیا قصور، خرابی مجھ میں لگی، تم میں بھی تو نکل سکتی تھی۔ بر میں تو نہ چھوڑ کر جاتی، یا دوسرا تمہارے سر پر بٹھاتی، پھر تم کیسے سو کن لاسکتے ہو؟“ اچھا چلو لے آؤ، مجھے پکا کاغذ دو۔“

اور پکا کاغذ۔ مطلب عرش سے فرش۔

”میں شاہین سے بہت محبت کرتا ہوں اور دوسری لا کر اسے دکھ نہیں دے سکتا، اس لیے آپ سب ہمیں ایسے ہی رہنے دیں، ہم خوش ہیں۔“

ننڈیں اور ساس حق دق۔ مگر باپ، بھائی، بچپان گئے۔ جت بھی میری اور پٹ بھی۔ رضیہ کی آمد نے شاہین کو بے فکری دی تو اس کا عکس مقصود کی زندگی میں بھی جھلک مارنے لگا۔ وہ شاہین سے زیادہ بے فکر ہوا اور کھل کر کھیلنے لگا مگر اسی بے فکری کی کوکھ سے بے احتیاطی کا جنم ہوا۔

اور ہیرا منڈی کی ساحرہ زمرہ جو اس کے گلے کا ماری ہوئی تھی۔ بھاری دیر کے ساتھ گلے کی ہڈی بن گئی۔ اگل دینا تو زمرہ کے ہوتے سوتے اسے کہیں کا نہ چھوڑتے اور نگفنے کی صورت میں۔

لیکن اس نے ننگے کا فیصلہ کیا۔ اس نے بے اولادی کے لیے شاہین جیسی ہڑونگ بھی نہ مچائی تھی۔ مگر جب زمرہ نے پلو مروڑتے ہوئے ہونٹ داب کے لباتے ہوئے کہا۔

”مقصود! آپ باپ بننے والے ہیں۔“ وہ چاروں شائے جت ہوا تھا۔

مشکل تب ہوئی جب اس نے کوٹھی میں عزت شان و مرتبہ کے ساتھ جانے کی خواہش کی۔

”اوتے ربا!“ کوٹھی شاہین کے باپ نے جینز میں دی تھی اور ملکیت بھی۔ مرن کن جیلوں، بہانوں

وعدوں، اشاروں سے اسے شہر میں رہنے پر آمادہ کیا تھا۔ یہ الگ داستان تھی۔

راوی چین لکھ رہا تھا مگر چار بیٹیوں کی آمد۔ اور شہر والے گھر میں زمرہ کے میکے والوں کا اتنا۔

سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا تو کبھی ان سب کے ہمراہ شاہین کے رو برو نہ ہوتا مگر وہ شدید ایال کے عالم میں زمرہ کے ساتھ چار عدد بیٹیاں لیے حاضر تھا۔

”ایک طوائف! اپنے اتنے سال کا دھوکا۔ اولیٰ۔“

صاحب اولاد۔ ”چار چار بیٹیاں۔“

شاہین نے سر پر مٹھیاں بھر بھر خاک ڈالی مگر سارے سرال والے دل کی دل میں چھپائے بیٹیوں کا سر ڈھانچے کو تیار تھے۔ شاہین کے سامنے تو سب نے اس کے احسن اقدام اور صاحب اولاد کو سراہا مگر۔

”ہائے تیرا بڑا عرق ہوئے مقصود! ہائے جب ہم کہتے تھے تب نہ کی۔ ایک سے ایک اعلا خاندان کی بیٹی تھیں۔“

”میری ننڈیں۔“ ہم نے سر پٹا۔

”میری بہنیں! بھانجھ جھال۔“ بھابھی نے کوسا۔

”اور تجھ جتنے مہسنے نے اتنے سال چھپا کر رکھا۔“

”اور اگلی نے بد ابھی کیں کڑیاں۔“

شاہین کو چپ لگ گئی تھی شور مچانے، رونے پٹنے، بد دعاؤں، کوسنوں کے بعد۔ زمرہ اور اس کی بیٹیوں کے لیے دروازے الگ تھے۔ دیواریں اٹھی ہوئی تھیں مگر۔

”یہ پچھل پیری سیدھے رستے سے ویاہ کرنے دیتی تو کیوں میرا پترا دھر ادھر گند میں منہ مارتا۔“

”ہائے ہماری نسل خراب ہو گئی۔“

”چار چار بیٹیاں۔ کون دیا ہے گا ان کو۔ بھلے نام کے آگے چوہدری مقصود لگا ہو گا مگر مال طوائف ہو تو دنیا والے روز حشر ادھر ہی بنا دیتے ہیں۔ ہائے تو مر جائے شاہین۔ تیری قبر سڑے، جل کر مرے۔“



ماں، ہمیں کسی حد تک درست تھیں۔  
اولاد کی خاطر اگر مقصود شادی کر لیتا تو کیا مضائقہ  
ہوتا۔ شاہین کی بڑائی مانی جاتی۔ وہ بی بڑی رہتی۔ مقصود  
دنیا کا مجرم، آخرت کا مجرم۔ بیٹیوں سے بھی نگاہیں  
چراتا۔

”اب ہم کریں گے تیری شادی۔ یہ طوائفیں تو چلے  
کاشی ہیں۔ وظیفہ کرتی ہیں، بیٹی پیدا کرنے کے لیے۔ یہ  
چار بھی اسی طرح کی لکڑیاں ہیں۔“  
مقصود نے جیسے ہی یہ سنا کہ کھڑا ہوا۔

مند کی اپنی نند سے کبھی نہ بنی تھی۔ وہ اس پر ہمیشہ  
حاوی رہی۔ اس کی بیوہ بھی لا کر وہ اس پر احسان رکھ  
سکتی ہے۔ ہاتھ اوپر۔ پیر شہر رگ رہے۔  
دیورانی کے پاس بھا۔ بچوں کی قطار تھی۔ مگر ساس  
کے عزائم کچھ اور تھے۔ شاہین کی دفعہ مقصود کے لیا  
نے دوست کے ساتھ بلا ہی پالا رشتہ طے کر دیا تھا۔ وہ  
صرف بیاتنے لگی تھی۔ زمو کو مقصود نے خود ہی ڈھونڈ  
نکالا تھا۔ وہ اس بار پورے چاؤ سے ہو تلاش کر رہی  
تھی۔

گھر گھر جاتی، منہ بنا کر بیٹھتی۔ شاہین کی برائیاں،  
مقصود کا بھولہ پن۔ زمو جیسی نے چھن لیا، ہائے میرا  
بھولا بچہ!

جائیداد کی تفصیل۔ وارث کی طلب۔ سارا  
الزام شاہین کے سر۔ ساس کا جوش و خروش ایسا تھا۔  
جیسے اپنے اکلوتے کنوارے بیٹے کا رشتہ ڈھونڈنے کے  
لیے ماں پہلی بار نکلتی ہے۔ خاندانی، سکھ اور خوب  
صورت۔

ساس نے سیدھا راستہ نہ دیکھ کر رضیہ کے بارے  
میں فیصلہ کرنے کی غلطی کی تھی۔ ”چل یہ بھی میری  
پوتی، چاہے کے پتر سے بیادوں کی۔“

”رہن دے لیا۔ چاہے کے پتر کے لیے تو اپنی  
نواسیاں پسند کرتی رہتا۔ میں تو اسے اپنی تپا جی کے گھر  
پہنچاؤں گی۔ بلکہ بیادوں کی کیا، جو لائی کو ساتھ رکھوں  
گی۔ تپا جی کا شوہر میرے تائے کا پتر۔ اس کے بیٹے  
پتر جیسے۔ میں کیوں اپنے باپ دادے کی جائیداد پورے

جینٹھ میں ہانڈوں کی۔“

ساس حق دیتی رہ گئی۔

وہ کھلا ہاتھ رکھتی تھی، کوئی تیرا میرا نہیں۔ جو جیسے  
استعمال کرتا رہے اس نے بھی پلٹ کر نہ پوچھا مگر  
اصل میں اتنی کمائی۔

شاہین کے تمام رویے یاد تھے، اب آیا تھا وقت  
سگن گن کر دے لینے کا۔

مگر آگے بھی شاہین تھی۔ جس نے ہار نہیں سیکھی  
تھی۔

وہ ساس، مندوں کی سرگرمیاں، خاموشی سے دیکھتی  
اور انتہائی لاپرواہی سے اپنے روزمرہ معمولات میں مگن  
رہتی۔ اس کی یہ لاعلمی انہیں دانت کچکانے پر مجبور  
کر دیتا تھا۔ مگر وہ شاہین کی ان ضرورتوں کو ساری ضرورتیں  
سمجھ کر نظر انداز کر رہی تھیں۔ ایک لوہار کی کرنے کے  
ان کے پاس، تھوڑا تھا۔

لڑکی پسند کر گئی۔ شرط شرائط سوال و جواب سب  
 واضح کر لیے گئے۔ مقصود کی تابعداری حیران کن تھی۔  
”بے وفا!“ زمو روٹی پائی گئی۔

”نمک حرام۔“ شاہین کا دل بولا۔

”ہائے ماشاء اللہ میرا فرماں بردار پتر۔“ ماں سرشار  
تھی۔

مگر شاہین کی ایک لوہار کی لگی۔ دن میں تارے نظر  
آگئے۔ زبان و انتہا تلے آگئی۔

جس نے سنا انگلیاں چبائیں۔

”ناگل، احمق! اپنے پاؤں پر کھڑی مار رہی ہے۔  
ارے کوئی اسے عقل دے۔“

”کیا کرنے لگی ہے عقل کی اندھی!“

”کوئی ایسے کرتا ہے، ارے شرم لحاظ ہے کوئی۔“

ارے کہاں سولہ برس کی جوانی اور کہاں ڈھلتے سورج

جیسی شاہین۔ ٹھوکروں میں بڑ جائے گی، منہ میں پانی

نپکانے والا کوئی نہ ہو گا۔ اسے کل پر ترس کھانا دان!

سارے عالم کو شاہین کے مستقبل کی فکر ہو چلی  
تھی۔

”اس نے مقصود کو کیسے راضی کیا؟“

پل بھر کو بھونکا دنیا کیا کہے گی۔“ ملا چپنے لگا۔  
شاہین نے پل میں تنکا کر دیا۔

”جب جگہ جگہ منہ مار رہے تھے، گاڑی بھر کے  
اولاد کی کھپ لے کر گاڑی کی گلیوں سے گزرے تب  
دنیا نے کچھ نہ کہا۔ جب اس طوائف کے ٹکڑے  
چاٹ رہے تھے تب کوئی کچھ نہ بولا تو اب۔ تمہاری  
ماں کی ڈھونڈی چلتی سے لاکھ درجے اچھی لا کر دے  
رہی ہوں۔ قابل تو تم اس کے بھی نہیں کہ تمہیں  
کو ڈھکی عورت بھی ملے۔ بے غیرت!“ وہ حلق کے  
بل چلائی۔

”اس عمر میں طلاق لے کر جاؤں تو کون روکے،“  
مکرایا نے کہا تھا سرخ جوڑے میں جا رہی ہے، سفید  
کفن میں نکلتا۔ مجھے داغ دار کفن نہیں چاہیے۔  
میرا دل نہ جلا مقصود۔ میرا تو یہ گھر ہے، میں تو بیٹیں  
رہوں گی، ہمیشہ۔ قبر بھی آگن میں کھود لوں گی، مگر باپ  
کی وصیت کی لاچ رکھوں تو مجھے سفید کفن میں نہ نکال  
دوں۔ دھوکے باز، فراڈے! اس پر دھڑکا۔

یہ تماشا دیکھنے دنیا اکٹھی تھی۔ بظاہر تنجیدہ بیٹھے  
مقصود کا دل بلبلوں اچھل رہا تھا۔ شاہین کی زبان کا زہر  
اپنی جگہ مگر فائدے میں تو پھر بھی وہی رہا۔ تمام جمع  
تفریق کو بد نظر رکھنے والی شاہین سے یہ پہلو کیسے چوک  
سکتا تھا مگر اس نے حسب عادت اپنا ہاتھ اوپر رکھا تھا۔

دنیا عشق کراٹھی تھی، اتنا بڑا دل، اتنا بڑا جگر۔

ایسی کول، سنہری، ملائم گڑیا جیسی سوکن۔ ساری دنیا

مقصود کو قسمت کا دھنی کہہ رہی تھی۔ سب شاہین کی

عظمت کو سراہ رہے تھے۔ اس کے دل، اس کے صبر،

ضبط کی مدح سرائی تھی۔ کسی نے سرخ ٹھکڑی میں دہکی

رضیہ کے بارے میں نہ سوچا۔

شاہین نے کہا ”بھلے تیرے جیسے کی اولاد ہوگی، مگر

میری بھانجی، بیٹی کے بچے عیش کریں گے، اتنی بھی رال

نہ پڑے۔“

\*\*\*

نفیسہ کی کمائی سالوں پہلے ختم ہوئی اور شاہین کی

اس۔ مگر رضیہ کی کمائی کا آغاز تھا۔ بدنہ صبی کا بد بختی وہ  
اپنی بدائش سے پہلے اپنی ماں کے دل و دماغ میں  
خندے کی صورت پختی تھی۔

اور جب یہ خندہ، مجسم سامنے آیا تو اس نے اسے  
خود سے دور کر دیا۔ وہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی مسترد  
تھی۔ آنے کے بعد نظر انداز کر دی گئی۔ وہ کھڑکی تھی،  
ایک ایسی عورت کے ہاتھوں کی جسے وہ اپنی مرضی سے  
سجایا کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا کرتی تھی۔ اس کے  
جسم کی جنبش پر شاہین نامی عورت کا پیرہ تھا اور سوچ کو  
اس نے سینے کب دیا۔

شاہین کی محبت، توجہ ایک ہتھکڑی کی طرح تھی جو  
نرم پھولوں میں چھپی تھی۔ رضیہ کو کبھی خنکی کا احساس  
نہ ہوا تھا۔

وہ جیسے انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی تھی۔

نئی جگہ، نیا آسمان، خوشبو، گوس کی بوندیں۔

اس نے اب تک وہ دیکھا جو شاہین نے دکھایا۔ مگر

یہ نئی دنیا۔

حیرت، شرمندگی، خوف، کیا کیا نہ تھا۔ جلد عروسی

میں بیٹھے وقت تک، وہ اپنی سکھوں کو کیا کہے گی،

کل تک جس کا تعارف ابابہ کر کر دیا تھا، آخ۔

حالانکہ مقصود اور رضیہ کے رشتے میں اول روز

سے نگاہ غلط انداز کا بھی گزر نہیں تھا۔ وہ شاہین کا کھلونا

تھا۔ مقصود نے اپنے دل کو ناکام پایا تھا رضیہ کے

حوالے سے کسی بھی جذبے کو اجاگر کرنے میں اور پھر

اس نے کبھی سچی بھی نہیں کی۔ اسے یاد نہیں پڑا کہ

اس نے کبھی پدرانہ شفقت سے رضیہ کے گال بھی

چھوئے ہوں۔ اس سے زیادہ التفات تو وہ باہر بندھے

جانوروں سے کر دیتا تھا۔

اسے تو اس کا چہرہ بھی یاد نہیں تھا۔ مگر سرخ جوڑے

میں بھی رضیہ یا اللہ۔

عجب سرخوشی کے عالم میں وہ بدست سائڈ کی

طرح اندھا دھند لکھا لپٹا لپٹا گیا۔



وہ نازک تھی، شبنم کی بوند جیسی ہلکی اور شفاف۔  
بھولی معصوم، حیران پریشان اوک میں رکھا شفاف

رضیہ کی زندگی میں کسی مرد کا گزر نہیں تھا۔ باپ،  
بھائی، چاچا، ماما۔۔۔

یہ نکاح کے بول تھے۔ سب سے مضبوط تعلق  
یا زندگی کا پہلا مرد وہ دیوانی ہوئی۔

تیسرے ماہ اس کا پیر بھاری ہوا تو وہ سارے جہان  
سے کئی کئی پھری، لجا کی ماری اور دوسری طرف شاہین  
انتقام کی ماری۔

اس کا کمزور وجود، احتیاطی تدابیر، ڈاکٹری ہدایات۔

اس کی لاکھ تاپندیدگی کے باوجود شاہین اسے دوبارہ  
اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہ اس کے منہ میں نوالے  
دیتی، سر میں تیل ڈالتی، کندھے کو ڈوے دیتی۔ اسے  
خوش رکھنے کی کوشش کرتی، جو مسکرا بھی نہیں پاتی  
تھی۔

اسے اپنے کمرے میں جانا تھا۔ اسے مقصود کے  
ساتھ رہنا تھا۔

وہ اس کا شوہر تھا، جو محبوب بن گیا تھا۔ عمر کے فرق  
سے کیا ہوتا ہے؟ وہ اس کے بچے کا باپ تھا۔

وہ اس کی شکل دیکھنے کو ترس رہی تھی مگر شاہین  
سائے کی طرح اس کے ساتھ۔ شاہین کو اور سب کو

بیٹے کا انتظار تھا۔ سب دن گن رہے تھے اور وہ بل پل  
کہ کب وہ اپنے کمرے میں جائے گی۔ اسے مقصود

سے محبت ہوئی تھی۔ اس جدائی نے عشق پیدا کر دیا  
تھا۔

مگر بیٹے کی پیدائش جشن تھی۔ سب کے چہرے  
پر خوشیوں کے عکس تھے۔ سرخی، ہنسنے، رقص،

ڈھول کی تھاپ، آتش بازی کے رنگ آسمان کی سیاہی  
کھائے۔ اور اس سے کہیں زیادہ تاباں، نکھر اچرہ رضیہ

کا۔ وہ اپنے کمرے میں جائے گی۔ ہاں۔۔۔ لیکن۔۔۔  
”پتر چاہیے تھا نا“ دے دیا مجھے اور تیرے ہوتوں،

سوتوں کو وارث۔ اب بے نام نہیں رہے گا اور اس کی  
جوانی کو تیرا بدھپا گھن لگائے، یہ میں ہونے نہیں دوں

گی۔ میری بھانجی ہے، میری گود میں ڈالا اس نے بچہ۔  
چل جا کے اس زمرہ کے کوڑے لگے پھرنے۔ خبردار جو  
رضیہ کا نام بھی لیا تو۔۔۔

رضیہ حق دق ان دونوں کی شکلیں دیکھتی رہی۔ وہ  
چچ کرکنا چاہتی تھی، اسے جانتا ہے۔ اس نے دن گئے

تھے اسے مقصود کی عمر، کردار، اخلاق سے کیا غرض،  
اس نے دنیا کے لاکھ طعنوں، شرموں کے باوجود غلام

کے کہنے پر سر جھکا لیا تھا۔  
وہ بہت خوف زدہ تھی۔ دنیا سے آنکھ ملانے کے

قابل نہ سمجھتی تھی خود کو۔ مگر ان کا رشتہ اللہ کے  
نزدیک جانتا تھا۔ مکمل تھا، بے عیب۔

اس کے ہونٹ پھر پڑ گئے۔  
”چھلاں ورگی میری دھی اور تو اک واکنڈا۔۔۔ (اک

کا کاٹا) اسے کیا خبر، بھولی نا سمجھ۔ پتر کے لیے سیانڈال  
کر بیٹھی تھی نا تیری ماں، بہن، آگیا پتر اور لینے ہوں

گے تو سوچیں گے۔ اب تو اوھر سے نکل۔ بلکہ جدھر  
مرضی نکل۔

دھیان رہے۔ طوائف کے ناچنے پیروں کو زیادہ دیر  
ساکت رہنے کی عادت نہیں ہوئی۔ مشق و شق تو کرنی

ہوگی۔ ذرا خبر رکھنا۔ چوہدریوں کے گھر خوشی کے موقع پر  
ناچنے لگانے ہمیشہ مراٹھیں ہی آتی ہیں۔ ہمارا نہیں

رواج، گھر کی کڑیاں رونق لگائیں۔ اب جلد۔ میری  
دھی آرام کرے گی۔“

وہ اس کے پریشان بال سنوارتی سارا دیتی کرے  
میں تھی۔ پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ رضیہ کی خوشیوں کا

ہنسی کا۔ ہمیشہ کے لیے۔  
\*\*\*

شاہین کے پھینکے پتے اور چلی گئی چال نے بساط  
پلٹ دی۔ جو کل اس کی دریاوی کے گن گارہے تھے۔

وہ تو یہ کرتے پائے گئے۔  
اتنی شاطر عورت، کیا مزا چکھایا۔ بھی منصوبہ بندی

ہو تو ایسی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر کامیابی کا ہاشا شاہین  
کے سر تھا۔ اس نے مقصود کا حق، دق چہرہ دیکھا تھا نا

رضیہ کی بن چلی والی تڑپن کیسے نظروں سے  
پوشیدہ رہ سکتی تھی۔ مگر وہ اپنی سوچ اور ارادوں میں پکی

تھی۔  
سچا پنا رکھی سچائی سوئے میں لت پت رضیہ کو اپنے

ساتھ تخت پر بٹھائی۔ ملنے آنے والی مہمانوں، کمیوں،  
مراٹھوں کے سامنے شہزادی بن کر رہتی۔ ہلکے رنگ

کے لباس میں اس کا رعب ہی سب سے جدا ہوتا۔  
تھا کا کا پاس ہی ہنگھوڑے میں ہوتا پھر واکر میں

چلنے لگا، پھر سائیکل چلاتے جوان ہو گیا۔  
مگر رضیہ کی یادداشت میں اسنے طویل عرصے کا

چوری جیسے کا بھی کوئی بل نہیں تھا۔ مقصود بھی جیسے ہار  
بان کر زمرہ کے در پر پڑا رہتا پھر ہار دوستوں میں۔

شاید سب کچھ اسی طرح چلتا رہتا۔  
مقصود کو جھٹکا لگا۔ اس کی بڑی بہن نے اپنے

جڑواں بیٹوں کے رشتے باہر طے کرنے کا ارادہ ظاہر  
کیا۔ مقصود نے اتفاقاً ”ان لڑکیوں کو دیکھ رکھا تھا۔ عام

شکل و صورت کی بھدی، بے دھنکی لڑکیاں۔  
اس نے شکوہ بھائی کے کانوں اندھا تو خبر ملی وہ اپنے

لائق فائق خیر و بیٹے کے لیے لڑکی کی تلاش میں ہے مگر  
بیوی کی ناک پر کوئی نہیں چڑھتی۔ کوئی اچھی لڑکی ہو تو

بائے۔  
”سلاش کی کیا ضرورت، اس کی بیٹیاں ہیں نا“

چاندی، شبنم، عین، مرجان۔  
”برانہ ماننا بھائی جی! میرا ہیرے ور کا پتر اور تمہاری

بیٹیاں۔۔۔“  
”وہ میرا خون ہیں مسعود،“ مقصود کر لایا۔

”خون تو آپ کا ہی ہے، مگر اس سے اچھا تھا رگوں  
ہی میں رہتا“ آپ نے پھینکا گندی مٹی پر۔ سوکھ کر

کالے نشان کی طرح جم گیا اور سزا داب تک اٹھتی  
ہے۔ پھر اس پر لوگوں کے قدموں کے نشان۔ سب

کس ہو گیا۔ معذرت ہے بھائی جی!“  
وہ منہ پر تھوک گیا تھا۔ صرف تیزاب سے تھوڑی

”دنیا دکھانے کو سینے سے تو لگالی ہیں۔ تان جینا کر سر پر  
نہیں رکھ سکتے۔“ بہن کے الفاظ۔

زمرہ بیماری کی بوٹ تھی، اسے مقصود پر فخر تھا۔  
کوٹھے پر چڑھنے والوں کی جیب میں نوٹوں سے زیادہ

دعوے ہوتے ہیں۔ نوٹوں سے پیٹ بھرتا ہے اور  
دعووں سے دل۔

مقصود مگر اپنے دعوے میں سچا نکلا تھا۔ وہ اسے  
اپنے گھر لے گیا تھا۔ وہ سو کھائی گئی تھی اور ایک نام،

پہچان مل گئی تھی۔ اسے عام عورتوں کا طرز زندگی بھا گیا  
تھا۔ احساس تشکر سکون دیتا تھا کہ اس کی بیٹیاں بھی

ایسی شان دار زندگی بسر کریں گی۔  
سایں، مند منہ، سر جو مٹی تھیں، سر ڈھانپنے کی بات

کرتی تھیں۔ بعد میں ادراک ہوا تھا کہ یہ سب  
شاہین کو دکھایا جاتا تھا۔ اور جب کرنی کا وقت آیا تو۔

صدمہ، حیرت، افسوس، تکلیف، مقصود کا بلڈ  
ریڈیٹ۔ اسے فاج کا حملہ ہوا اور وہ لاچار ہو کر بستر پر

گر گیا۔  
”شاہین باہی۔۔۔! مایوسی کے گھپ اندھیرے میں

زمرہ کو روکنی کی کرن دکھائی دی۔ ”وہ سب کر سکتی ہے  
جو کرنا چاہے، وہ بڑی ہے۔“

وہ اس کے پیر پڑ گئی۔  
شاہین کا سرو انچا ہوا۔ ہاں وہ سب کر سکتی ہے۔

اسے ایک موقع چاہیے تھا، مگر تمام عقل لڑانے کے  
باوجود سدھ نہیں آئی تھی۔ اس نے زمرہ کے اپنے

پیروں پر جھک کر اسے سب سے سب طے کر لیا۔  
”تو تھک کر رہی ہے زمرہ! میں سب کر سکتی ہوں

اور کروں گی بھی مگر میری ایک شرط ہے۔“  
”میں آپ کی ہر شرط پوری کروں گی۔“ وہ پُر عزم

لہجے میں بولی۔  
”ایسا دعوتہ کر جو پورا نہ کر پائے۔“

”میں اپنی جان سے گزر جاؤں گی۔“  
”دیکھ زمرہ! تو مسعود اور جمیلہ کے پتروں کے پیچھے



کی عمر کو کون سی پچھوندى کھاتی ہے۔  
 ”شاہین کا بڑھاپا تو اللہ اللہ کرتا سکھ سے گزرا  
 گا۔“

”رضیہ تھوڑی دکھائے گی سوتن کا جلاپا۔ ماں سے  
 بڑھ کر بار کیا ہے۔ شاہین نے اسے۔“  
 ”کتے کھی شکرین کر رہی ہیں۔“  
 ”بھلے آج شاہین کا ہاتھ اوپر ہے مگر کب تک  
 رہے گا۔“

”ارے میرے اللہ! اڑتی پڑتی سچی جھوٹی اس  
 کے کانوں پڑتی ہی تھیں۔“ اس جانب تو شاہین تیرا  
 دھیان ہی نہ کیا۔ ”اس نے جو اس باخلی سے خود کو  
 کوسا۔“

مقصود کا رضیہ کو پیاسی نگاہوں سے تکتا اس کے  
 علم میں تھا۔

رضیہ کے بچپن میں رضیہ اس کے لیے سرالوں  
 کے منہ پر مارنے والے تپسٹر کی طرح تھی۔ رضیہ کی  
 جوانی کو اس نے رشتے میں باندھنے کے باوجود مقصود کو  
 لپکانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ اس نے سب کچھ دے  
 کر بھی کیسے تڑپا، ستایا تھا مقصود کو۔ وہ ایک گھر میں  
 رہتے ہوئے رضیہ کی خوشبو بھی نہ پاسکتا تھا۔

اسے اس کھیل میں مہارت حاصل ہوئی تھی اور  
 جیت کا مزا و نشہ واہ! لیکن اس کی زمانہ ساز عیار  
 آنکھوں سے رضیہ کا مقصود کی طرف لپکتا بھی کب  
 پوشیدہ رہا تھا۔ وہ اس کی آواز سننے اس کی فقط موجودگی  
 کو محسوس کرنے کے لیے چک پھیریاں کھایا کرتی  
 تھی۔

پھر شاید خود ہی مایوس ہو کر کا کے وجود میں چھپنے  
 لگی۔  
 مگر کا کا تو شاہین کا تھا نا اور شاہین کے سامنے رضیہ  
 تھی رجم۔

اور شاہین اب رجم سے رنج لگی تھی۔  
 وہ اس کھیل کو اب بھی اپنی مرضی سے کھیل سکتی

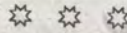
تیری چاندی سونے کو۔ ”وہ تول تول کر لفظ ادا کر رہی  
 تھی۔“

”کون سا جاوڑی منتر؟“ زمرد اچھٹے سے اس کے  
 جملے اور انداز کا تین دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا  
 شاہین سب کر سکتی ہے مگر آخر کیسے؟  
 ”کر کے تو میں خود بھی کر سکتی ہوں۔ مگر خیر!  
 مقصود سے کہہ رضیہ کو طلاق دے دے۔“ اس نے  
 دھماکا کر دیا۔ زمرد کے برچھے اڑ گئے۔

زمین پر بیٹھی زمرد بمشکل کھڑی ہوئی۔ وہ دھیرے  
 دھیرے قدم بڑھاتی شاہین کو یوں دیکھتی تھی جیسے کوئی  
 نیکھل پیری ہے۔

وہ شاہین تھی جس کا لیرا پہاڑوں کی چٹانوں پر ہوتا  
 ہے۔ مقصود جیسے چوہے پستوں ہی میں کھوہ بناتے رہ  
 جاتے ہیں۔ بلندی نگاہ کو وسعت دیتی ہے۔

اور شاہین کی دور رس نگاہیں اسے جو دکھا رہی  
 تھیں وہ اسے بھی قابل قبول نہیں تھا کبھی نہیں۔



اس نے مقصود سے کہا تھا۔ ”بھلے اولاد تیری بھی  
 ہوگی، مگر عیش تو میری بھانجی اور اس کے بچے کریں  
 گے مالک ہوں گے۔“

اس نے اپنی پرکھوں کی جائیداد پر عیش کرنے کے  
 لیے کسی غیر لڑکی کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ رضیہ اپنی تھی  
 بیٹی، بھانجی، بے شک سو کون بھی مگر تھی تو اپنا خون اور  
 اس کا پیدا کیا بیٹا۔ کبھی خواب میں بھی تسلیم نہیں کیا  
 کہ اس نے اسے جنم نہیں دیا۔

وہ رضیہ کو آرام کا مشورہ دیتی اور بچے کے ساتھ  
 راتوں کو خود جاگتی اسے کھلاتی پلائی دھوتی نہلاتی۔  
 شوہر سے دوری کے بعد کا کار رضیہ کا کُل تھا۔

”شاہین اب بوڑھی ہو رہی ہے۔ سب کچھ رضیہ  
 ہی کا تو ہو گا۔ وہی تو خاندانی بیوی ہے۔ جو ان خون سب  
 سنبھال لے گی۔“

”اور وارث کی ماں۔ اللہ اور بھی بچے دے گا۔ مرو



تھی۔ اس کے پاس بڑے مہرے تھے، مگر بعض کھیل وقت پر مکمل کر لینے چاہئیں۔ مبادا بچھتاوا ہو۔  
خالی ہاتھ۔

\*\*\*

دکھ کی داستان جتنی در زیر مطالعہ رہے پیٹ میں گرہیں لگاتی رہتی ہے۔ آنکھ سے آنسو ٹپکنے لپکے۔ دل پتکیوں سے روتا رہتا ہے۔ سوطالت چہ معنی۔ رضیہ ایک بار پھر دلہن کے روپ میں تھی۔ ”ماں نے کہا اس گھر کو ایک عورت کی ضرورت ہے۔ صبح کہا ہو گا مگر مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں۔ میرے لیے راشدہ کی یادیں ہی کافی ہیں۔ تم رہو یہاں۔ گھر میں۔“

وہ اس کاٹھونکھٹ پلٹے بنا پتکیوں کے درمیان رک رک کر بولتا جاتا تھا۔ شاید اس نے پی رکھی تھی زبان بھاری اور لڑکھاہٹ سے بھر پور۔ ”اماں بولیں۔ تم بڑی خوب صورت ہو، ہوگی مگر راشدہ جیسی نہیں بن سیکھو۔“

اس نے اپنے پڑوں کی تمام جیبیں ٹٹولیں، پھر ایک بوڑہ برآمد کیا۔ نچی بنی خوب صورت عورت۔ رضیہ کیا خاک اثر لیتی، اس نے جان لیا تھا۔ شکل کی خوبی سے زیادہ بخت کی خوبی اہم ہے۔

”تمہارا گھر ہے، کھاؤ پیو، بیش کرو، سیاہ سفید کرنا مگر بس مجھے نہ چھیڑنا، صبح ہے نا۔ ہمیں دوسرا بیڑوم دیا ہے، وہ تو راشدہ کا ہے نا، میرا اور راشدہ کا اور راشدہ کس کی میری۔ میری تھی۔ میری ہے۔“ وہ کم ہوتی آواز کے ساتھ کربے سے گرتے پڑتے نکل گیا۔ اور اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اپنے گئے ایک ایک کر کے اتارنے شروع کر دیے۔ اور پھر آنے والے ہر بل میں ٹھوکر تھی۔ تادب چوٹ اسے ہر حوالے سے غیر اہم کر دیا گیا۔ ٹھکرا دیا گیا۔

”مجھے نہیں ضرورت بچوں کی۔ یہ تین ہیں نا، ان میں مامتا کا سکھ ڈھونڈو، میں راشدہ کی روح کو تکلیف

کیسے دے سکتا ہوں۔“

اور بچے؟

”نہیں ہیں آپ ہماری امی وہ چلی گئی ہیں ہم سب کار میں جا رہے تھے، ٹرک نے گھماری، وہ اسی وقت مر گئیں، ان کا سارا خون روڈ پر گر گیا، ہم سب کو کچھ بھی نہیں ہوا۔“

دونوں بڑے بچوں نے اس کی حد بندی دکھائی تھی۔

چھوٹا بہت چھوٹا تھا، چار ماہ کا بچہ۔

جنگ و جدل کے بجائے مصالحت سب سے اچھی راہ ہوتی ہے۔

اور مصالحت برداشت کا دوسرا نام ہے۔ اس نے زندگی سے ہر شے کو نکال کر ایک برداشت کو سامنے رکھ لیا تھا۔ اور اسی برداشت کی طاقت کے سہارے اس نے باقی ماندہ زندگی کے کچھ سال ہی تو گزارنے ہوں گے۔

شروع میں بہت مشکل لگنے والا سفر کچھ آگے بڑھا تو آسانیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں۔ یادوں کے سہارے زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔ وقت سے بڑا مزہم ہوتا ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں مرنے۔

اسے اپنے خوب پڑھے لکھے شوہر کی قوت کے بل مل ہی گئے۔ جب بھی اس پر راشدہ کی یاد کا شدید حملہ ہوتا تو وہ اس کے ساتھ بیٹھ جاتی، اس کی سنتی رہتی، وہ اسے یاد کر کے روتا تو وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں بوچھڑ دیتی۔

”تم تم بھی یاد کر سکتی ہو۔ اپنے شوہر کسے میں کوئی طعنے نہیں دوں گا۔“ اس کے سر پر کھلایا چاڑھ جاتا تو وہ کھلی آفر کرتا۔

وہ ہونٹ دانت سے کاٹتے ہوئے نفی میں سر ہلاتی۔ اسے کوئی یاد نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی یاد بکھرتا چڑھے زخم کی طرح ہوتی تو جو تو روح تک چچا تھی ہے۔ وہ کیا یاد کرتی۔  
زمرہ کی التجا میں۔

شاہین کی شرائط۔  
مقصود کی موقع شناسی، معاملہ فہمی۔

شاہین کا بچہ چھین لینا۔

دنیائیں ایک بار پھر اس کی واہ واہ ہوئی تھی۔ فالج زدہ بڑھے سے چھڑوا کر لاڈلی بھانجی کو جوان جہان پڑھے لکھے آدمی سے بیاہ دیا۔ بھانجی کی عمر کو گلابا نہیں، بھئی واہ۔

اس نے زمرہ اور مقصود کی کھلی ہتھیلیوں پر اپنے پیر رکھ دیے تھے، اس کی چاروں بیٹیوں کو زمین جا بیدا، کوٹھیوں کے دم چلنے کے ساتھ رخصت کر کے۔ پھر کسی کو یاد نہ آیا، ان کی ماں کون تھی۔  
شاہین نے ایک بار پھر اپنے سر راہیوں کے سینے میں المی کا ڈبڈبی تھی۔

”انتا داج تو چوہدری اکو دھی کو بھی نہیں دیتے جتنا۔“

شاہین ایسی کیوں تھی، بے اولادی کا دکھ، لوگوں کے دل چھاتی کرتے طعنے، اس نے دس سال سے وہ ختم لڑج ہوئی۔ دولت اولاد کا نعم البدل نہیں تھی مگر اس نے دولت کا استعمال بہت سلیقے سے وقت پر کیا۔  
اور رضیہ اپنی قسمت کا توجہ کس کس کے آگے پڑتی۔ کس کو مورد الزام ٹھہراتی۔

ماں باپ کو۔

شاہین کو۔

مقصود کو۔

ہر شخص نے اسے مسترد کیا۔ ذلیل کیا۔

اور بیٹا۔ جس کے سہارے اس کو زندگی گزارنی تھی، وہ ماں سے سلام کے بہانے ہر سال ملتا تھا مگر شاہین کے پڑھائے سبق کے زیر اثر۔  
اور جن بیٹیوں کے لیے وہ ماں بنا کر لا لی گئی، ان کی دوست بن گئی۔

سایوں بعد بغیر کسی کے کہنے اسے ایک روز اسے خود قتل کرنے لگے۔ بس۔

زندگی کے لیے بعض اوقات اتنی کامیابی بھی کافی ہوتی ہے، اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے۔

شاید امتحان ختم ہوا۔ آزمائش مکمل ہوئی۔  
شوہر کا انتقال ہوا تو وہ بیٹوں، بہوؤں میں مگن ایک ذمہ دار بزرگ بن کر ابھری۔  
عزت، مرتبہ، ماں، حکم، فیصلہ سب اور محبت بھی۔

لیکن۔

”بس ایسے ہی عرفان کا مران اور عروہ نے سرچھایا ہوا ہے۔“ اس نے بڑی بھوکھی سرگوشی کی۔  
”کون سی ان کی سگی ماں ہیں۔ جو ہم خد متیں کر کے کھلیں۔“ ماں نہیں تو۔ آج کل تو لوگ سگی ماں کی خدمت نہیں کپاتے، یہ تو پھر سوتیلی ساس ہیں۔“  
چھوٹی نے ہنسی اڑائی۔

اس کا دل کٹ گیا، اسے ایک بار پھر مسترد کر دیا گیا تھا۔  
وہ عرفان کے چھوٹے بیٹے کو شانے سے لگائے سلا رہی تھی۔ معصوم بغل میں منہ دیے غافل ہو رہا تھا، وہ اپنی دادی جی سے بہت ہلا ہوا تھا۔  
محبت کے لیے کب یہ شرط ہے کہ ایک ہی جانب سے ملے، یہ توجہ بھی، جہاں سے بھی ملے، ہتھیلیوں میں بھر لینی چاہیے، پچھلے سے گرہ لگا دینی چاہیے۔  
اس نے سٹھے کے بالوں کو محبت سے بوسہ دیا تھا۔  
ہوش آنے پر یقیناً ”وہ بھی سب کی طرح۔ لیکن ابھی تو یہ ہے نا تو بس کافی ہے۔“  
اس کے آنسو ٹپکنے کے بالوں میں مدغم ہو گئے۔

\*\*\*

اور میں کون ہوں رضیہ۔  
مدرہ کی میز پر بڑی مسترد شدہ تحریر۔  
”لوگ اتنا دکھ، اتنا کچھ چیر دینے والا غم برداشت نہیں کر سکتے۔“







”دیکھو نصرت! میں تو تجبات کہتی ہوں۔ چاہے کسی کو اچھی لگے یا بُری منافقت میرے بس کی بات نہیں۔ یہ فائقہ اس قابل نہیں کہ اس کا ہمارے ظفر کے ساتھ کوئی جوڑ بنے۔“

شمسہ آبانے اپنی بھانج نصرت کے کان میں کہا تھا، لیکن آواز اتنی بلند تھی کہ فائقہ کی والدہ جو چائے لینے گئی تھیں سن چکی تھیں۔ اسی لیے اب ان کے انداز میں مایوسی کے ساتھ خوشامد بھی شامل ہو گئی تھی۔

”مے شمسہ آبا! آپ نے تو رول لیے ہی نہیں۔ فائقہ نے بنائے ہیں ذرا چھین تو سی۔“ فائقہ کی والدہ نے پلیٹ شمسہ تپاکے آگے کی۔

”نہیں بہن! رہنے دو۔ جتنا چکھنا تھا میں چکھ چکی۔ اب تو ہم چلیں گے۔ چلو نصرت! اٹھو۔“ شمسہ آبانے رکھائی سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کے اس انداز پر جہاں نصرت شرم سے پانی پانی ہو گئیں وہیں نازش بھی اپنی شرمندگی ٹالنے کے لیے فائقہ کی والدہ سے مخاطب ہوئی۔

”آئی! آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی اور فائقہ کے ہاتھ میں تو بہت ذائقہ ہے۔“

”چلو نازش! کیا میں رہنے کا ارادہ ہے؟“ شمسہ آبا نے باہر نکلتے ہوئے نازش کو ٹوکا۔

”جی پھوپھو! آری ہوں۔“ نازش جلدی سے خدا حافظ کہہ کر ان کے پیچھے لگی۔

راستہ بھر اور رات کے کھانے تک تو نازش نے خود پر ضبط کیے رکھا، مگر رات کے کھانے کے برتن سمیٹنے

کے بعد وہ سیدھی ماں کے کمرے میں جا پہنچی۔

”مے! کیا ضرورت تھی پھوپھو کو ساتھ لے جانے کی؟“

”یعنی تمہارا مطلب ہے کہ میں خود چلی جاتی اور واپس آکر تمہارے آبا اور پھوپھو سے باتیں سنتی؟ تمہارے آبا کا بس چلے تو بانی بھی ان سے پوچھ کر پتیں۔“ نصرت بھی بھری بیٹھی تھیں۔

”مے! فائقہ کتنی اچھی لڑکی ہے پر اب پھوپھو ظفر کا رشتہ وہاں نہیں ہونے دیں گی۔“ نازش بے بسی سے گویا ہوئی۔

”جانتی ہوں میں۔ اتنی اچھی اور سلجھی ہوئی لڑکی کو صرف کم حیثیت ہونے کی وجہ سے رد کرتی ہیں۔ میری تو وی خواہش ہے کہ لڑکی چاہے امیر نہ ہو، ہماری حیثیت کی نہ ہو، مگر اب آداب — والی، شرم لحاظ والی ہو۔“ نصرت کو اس رشتے کے چھوٹ جانے کا بے حد ملال تھا۔

”مے! میں آپ کو بتا رہا ہوں، مجھے آج کے زمانے کی پریئر بولنے والی لڑکیاں سخت زہر لگتی ہیں۔ مجھے سادہ اور گھریلو لڑکی چاہیے۔ رشتوں کو سمجھنے اور نبھانے والی۔“ ظفر نے سنا کہ پھوپھو نے لڑکی کا گھریا دیکھ کر انکار کر دیا ہے تو وہ بھی ہتے سے اکھڑ گیا۔

”میں جانتی ہوں، مگر تم خود بتاؤ۔ میں کیا کر دوں۔“ نازش نے بھی کل تمہارے آبا کو سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ کہتے ہیں، آپا نے منع کیا ہے تو سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ پھر وہ بھی اپنا سامنہ لے کر اپنے کمرے

چلی گئی۔

”میں آبا سے بات کرتا ہوں۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم کچھ کہو گے تو شمسہ آبا خواہ مخواہ یہ ثابت کرنے پر تل جائیں گی کہ تمہاری فائقہ کے ساتھ جذباتی وابستگی ہے۔ مفت میں فائقہ کو بدنام کر کے رکھ دیں گی۔“ نصرت نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

”مے! آپ جانتی ہیں، کیا کچھ نہیں ہے۔ نازش نے بتایا تھا کہ فائقہ بہت سلجھی ہوئی لڑکی ہے اس لیے میں چاہ رہا ہوں۔“

”میں جانتی ہوں بیٹا! مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں تو اپنی طرف سے اقرار کرتے ہوئی تھی۔“ نصرت نے افسردگی سے کہا۔

”چلو آبا! اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔ میں تمہارے ساتھ وہ نہیں ہونے دوں گی جو نازش کے ساتھ ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے نصرت کو اپنی ہی آواز اجنبی لگی اور ظفر جانتا تھا کہ ماں صرف بلا سادے رہی ہے ورنہ ہوگا تو وہی جو شمسہ پھوپھو چاہیں گی۔





نصرت بیٹے کو سمجھا کر باہر لاؤں گے میں آئیں تو شمسہ  
آپا اور مختار سر جوڑے کوئی مسئلہ سمجھا رہے تھے۔  
نصرت کو دیکھ کر دونوں چپ ہو گئے۔  
”نصرت! رات کے کھانے میں والہ گوشت  
بنا لیتا۔“ شمسہ آپا نے حکم جاری کر دیا جو اس بات کا  
اشارہ تھا کہ نصرت وہاں سے چلی جائیں۔ نصرت بچن  
میں آکر رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگیں۔

مختار اور شمسہ کی محبت مثالی تھی۔ پورا خاندان  
دونوں بہن بھائیوں کی محبت کی مثال دیتا تھا۔ وجہ یہ  
تھی کہ مختار اور شمسہ کم عمری میں ہی ماں کے سایہ  
شفقت سے محروم ہو گئے تھے۔ شمسہ آپا نے ہی مختار کو  
ماں بن کر پالا اور جب مختار اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے تو  
ان کے والد منظور صاحب نے دونوں کی انکھی شادیاں  
کر دیں۔ تب مختار تیس برس کے اور شمسہ آپا بیستیس  
برس کی تھیں۔ دو سال تک تو راوی بچپن ہی چین لکھتا  
تھا۔ مگر جب شادی کے اڑھائی برس بعد شمسہ آپا بیوی  
کی چادر اوڑھ کر آئیں تو نصرت کا سکون رخصت  
ہو گیا۔ مختار نے نصرت سے کہہ دیا تھا کہ کبھی میری  
بہن کے سامنے آواز بلند نہ کرنا۔ وہ دن اور آج کا دن  
شمسہ آپا ہی گھر کے سیاہ و سفید کی مالک تھیں۔ شادی  
سے پہلے بھی وہ گھر کی حکمران تھیں اور بعد میں بھی بلا  
شرکت غیرے حاکمیت ان ہی کے حصے میں آئی تھی۔ اور  
اب یہ عالم تھا کہ گھر میں ”کیا کئے گا“ سے لے کر نازش  
اور مظفر کی شادی تک تمام امور میں ان ہی کا حکم چلتا  
تھا۔ نصرت صلح و طبیعت کی مالک تھیں مگر بچے ہمیشہ  
اپنی ماں کے ساتھ زیادتی ہوتے دیکھتے آئے تھے اسی  
لیے شمسہ آپا سے باقی تھے۔

\*\*\*

بالآخر شمسہ آپا کو ان کی پسند کی ہوسل ہی گئی۔ شمسہ  
آپا کے ہم پل خاندان کی خوب صورت اور بڑھی لکھی  
نورہ پہلی نظر میں ہی انہیں بھاگنی۔ گو کہ نصرت اور  
نازش کو نورہ کی باتوں سے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خاصی  
تیز اور ہوسیار لڑکی ہے۔ مگر شمسہ آپا نورہ کی خوب

صورتی اور اس کی ماں کی چرب زبانی سے اچھی خاصی  
مرعوب ہو چکی تھیں۔ نورہ کے والد اور بھائی کی ماں و  
سامی حیثیت بھی نظر انداز کرنے والی نہیں تھی۔ اسی  
لیے مختار بھی پہلے دن سے شمسہ آپا کے ہم نوا ہو گئے  
شمسہ آپا کی بات سے تو مختار پہلے بھی اختلاف نہیں  
کرتے تھے مگر اس معاملے میں انہوں نے خاص  
دلچسپی ظاہر کی۔

چارونا چار نصرت اور نازش بھی ماں گئیں اور ظفر  
بھی راضی ہو ہی گیا۔ وہ الگ بات کہ نورہ کی ایک  
جھلک ہی اپنا کام دکھا چکی تھی۔ نصرت کو اختلاف کا حق  
کبھی ملا ہی نہیں تھا۔ نازش کی بار بھی انہوں نے  
سمجھو تا کر لیا تھا حالانکہ نازش سسرال میں زیادہ خوش  
نہیں تھی۔ نازش کے معاملے میں بھی شمسہ آپا نے  
ظاہری شان و شوکت کو ہی ترجیح دی تھی۔ یہی وجہ تھی  
کہ نازش اور اس کے سسرال والوں کی سوچ اور طور  
طریقہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نازش اپنی ماں کا پر تو  
تھی اسی لیے رشتہ نبھ بھی رہا تھا۔ اب ظفر کی شادی  
میں شرکت کے لیے بھی نازش کے سسرال والوں کو سو  
خڑے دکھانے تھے جنہیں صرف نصرت کو ہی  
برداشت کرنا تھا کیونکہ بقول شمسہ آپا میں اس طرح  
کے ”ناؤک معاملات“ میں نہیں پڑتی نصرت یہ  
تمہارا رشتہ داریاں ہیں تم ہی نبھاؤ۔“

\*\*\*

”ماما پلیز! آپ میرے سسرال والوں سے کہہ دیں  
کہ میں شادی میں ڈیزائنڈ ویئر ہی پہنوں گی، بلکہ بری  
کے جوڑے بھی ڈیزائنڈ ویئر ہونے چاہئیں۔“  
”ہاں میری جان! پریشان کیوں ہوتی ہو۔ میں نے  
نازش کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ میری نورہ  
ڈیزائنڈ ویئر ہی پہنتی ہے۔“ نورہ کی ماں نے بہارت  
بہی کا گال چھوتے ہوئے اس کا مسئلہ حل کر دیا۔  
”ماما! آپ کو کیا لگتا ہے کہ ایک مرتبہ کہنے سے ہی  
وہ لوگ ماں جا میں گے؟“ نورہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

”ہاں! کیوں نہیں جب میں نے نازش سے یہ بات  
کہی تو ساتھ ہی شمسہ آپا بھی بیٹھی تھیں۔ ان کے  
چہرے کے تو زاویے ہی بگڑ گئے۔ لیکن پھر نصرت نے  
بات سنبھال لی۔ کتنے لگن کیوں نہیں، جیسی ہماری  
نورہ ہے اس کی سب چیزیں ہی ویسی ہی ہوں گی۔ بلکہ  
وہ تو یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ نورہ شائنگ ہے بھی ساتھ  
ہے۔ اپنی مرضی کی چیزیں لے لے گیونگہ استعمال  
بھی نورہ کو ہی کرنی ہیں۔“

”اوہ ٹھیک گاڈ! نصرت آنی بہت اچھی ہیں۔“  
نورہ نے کلمہ شکر ادا کیا۔

”ہاں! پہلے تو ساری سائیں ہی اچھی ہوتی ہیں۔ پتا  
تو بعد میں چلتا ہے۔“

”نہیں ماما! نصرت آنی کو ہینڈل کرنا زیادہ مشکل کام  
نہیں ہے۔“ نصرت کی طبیعت کو نورہ نے بہت پہلے  
ہی بھانپ لیا تھا۔

”ہاں! نصرت تو واقعی مسئلہ نہیں لگتیں، لیکن وہ  
شمسہ آپا بہت بڑی مصیبت ہیں۔ ساری عمر نصرت کے  
بیٹے پر مونگ وے ہیں اب تمہاری باری ہے۔“ نورہ  
کی ماں نے اسے حقیقی خطرے سے آگاہ کیا۔  
”تم شمسہ آپا کو زیادہ لفٹ نہ کرنا اور ظفر کو قابو میں  
رکھنا۔“

”وہ تو آپ فکری نہ کریں۔“ نورہ نے بے فکری  
سے ہاتھ جھاڑے۔

”اور تمہاری کوئی کلاسز کیسی چل رہی ہیں؟“  
انہوں نے نورہ سے استفسار کیا۔

”اوہو ماما! ٹھیک چل رہی ہیں مگر اس بکھیرے کی کیا  
ضرورت تھی آخر؟“ نورہ اپنی کلاسز سے بہت اکتا چلی  
تھی۔

”ضرورت تھی۔ بہت ضرورت تھی تم نے دیکھا  
نہیں کہ نصرت خود کھانا پکاتی ہیں۔ کتنی کفایت شعار  
اور سلیقہ مند ہیں تمہاری ساس۔ مروا اپنی بیوی میں بھی  
ماں کو تلاشنا ہے۔ نصرت کی طرح بن کر دیکھنا ظفر کو  
سودہ ہمیشہ تمہارا تابع رہے گا۔ اور ویسے بھی جب تک  
مرا اور بچن عورت کے ہاتھ میں ہو۔ راج عورت کا ہی

ہوتا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تم ہمیشہ راج کرو۔“  
نورہ کی ماں نے اسے گرتائے۔  
”پاکل ویسے جیسے آپ نے کیا ہے۔“ نورہ نے  
ماں کی بات کو پلوٹے باندھتے ہوئے کہا۔  
”ہاں میری جان! پاکل ویسے جیسے میں نے کیا ہے  
اور کر رہی ہوں۔“ اس کی ماں نے تائید کی۔

\*\*\*

نورہ دلہن بن کر بہت خوب صورت لگ رہی  
تھی۔ ظفر اور نورہ کی جوڑی حقیقتاً ”چاند سورج کی  
جوڑی تھی۔ جس نے بھی دیکھا، سراپے پتاندہ رہ سکا۔  
شادی کی تقریب میں نصرت دونوں کی نظر ہی اتارتی  
رہیں۔

شوخی چنچل نورہ کے آنے سے گھر بھر میں رونق  
آئی۔ ظفر نے پہلی رات ہی نورہ کو باور کرا دیا تھا کہ  
نصرت کو نورہ کی وجہ سے کوئی تکلیف نہ پہنچے اگر ایسا  
ہو تو وہ نورہ کو اس گھر میں آخری دن ہو گا۔ اور نورہ  
سمجھ گئی کیونکہ نصرت بہر حال ایک اچھی ساس تھیں  
جبکہ شمسہ آپا اور نورہ کے درمیان محاذ شادی کے ایک  
بہتے بعد ہی کھل گیا۔

\*\*\*

شادی کے ایک ہفتے بعد ہی شمسہ آپا نے نورہ سے  
کھیر میں ہاتھ ڈالنے کی فرمائش کر دی۔

”پچھو! ابھی تو شادی کو صرف ایک ہفتہ ہی ہوا  
ہے۔“ ظفر نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

”ٹھیک ہے پر خردوار! مگر نورہ کو گھر کے کاموں میں  
دلچسپی لینی چاہیے۔ آج نہیں تو کل اسے ہی سب  
سنبھالنا ہے۔ ابھی سے شروع کرے گی تو اسی کے لیے  
بہتر رہے گا۔“ مختار صاحب نے ہمیشہ کی طرح آپا کا  
ساتھ دیا۔ انہیں کب منظور تھا کہ کوئی ان کی بہن کی  
نئی کرے۔

”ٹھیک ہے ماما! جب ہم ہنی مون سے واپس  
آجائیں گے تو نورہ بچن کا کام سنبھال لے گی۔“ ظفر  
نے اپنے تئیں معاملہ ختم کیا۔



”کیا؟“ مٹی مون پہ جارہے ہو اور کسی سے ذکر تک نہیں کیا؟ ایسے بتا رہے ہو جیسے غیروں کو اطلاع دی جاتی ہے۔ یہ خبر سب ہی اہل خانہ کے لیے غیر متوقع تھی بلکہ سب سے پہلا رد عمل شمشہ آبا کی طرف سے آیا تھا۔ نورہ ضبط کیے بیٹھی رہی کیونکہ اسے اس طرح کے لمحے کی عادت نہیں تھی۔ نصرت نے بھی نورہ کے بدلنے موڈ کو محسوس کیا اور ظفر نے بھی۔ ظفر کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ نصرت بول پڑیں۔

”آبا! جانے دیں نا۔ یہ ہی دو چار دن تو ہوتے ہیں بچوں کے مزے کرنے کے۔ اس کے بعد تو روٹین لائف شروع ہو جائے گی۔“

”ہاں ہاں بچو جاؤ۔ کب جارہے ہو؟“ مختار صاحب نے بھی ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کی۔ ”سر سوں۔“ ظفر کاموڈ بھی بھال ہو گیا۔ ”آگیاں جارہے ہو یا؟“ نصرت نے نورہ کو مخاطب کیا۔

”آئی! سبکا پور۔ نورہ نے خوش ہو کر بتایا۔ ”وہ بھی! یہاں تو لٹیا ہی ڈوب گئی۔“ شمشہ آبا نے ہاتھ جھاڑے۔

”کیا مطلب پھوپھو؟“ ظفر نے براہ راست شمشہ کو مخاطب کیا۔

”تم تو رہے دو۔ مختار! اب خود ہی دیکھ لو۔ ابھی تو تمہارے صاحب زادے نے اپنا پرنس شروع کیا ہے اور ساتھ ہی چاؤ چوٹیلے شروع ہو گئے۔ خود حساب لگا لو کہ کتنا وقت لگے گا سب برباد ہونے میں۔“ شمشہ آبا کبھی کسی سے نہیں ڈری تھیں تو ظفر کی چیز تھا۔

”یہ بات تو آپ کی درست ہے۔ ظفر اگر تمہیں اور نورہ بھی کو جانتا ہے تو مری ایٹ آباد چلے جاؤ۔ بیرون ملک جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور ویسے بھی ابھی پرنس سیٹ ہوا ہے۔ منافع آتا تو دور کی بات ہے۔ مشکل ہو جائے گا آپا کے لیے بجٹ سنبھالنا۔“ مختار صاحب نے نرمی سے متوقف بیان کیا۔ شمشہ آپا مزاج کی جتنی تیز تھیں۔ مختار صاحب اتنے ہی نرم۔

شمشہ آبا کی تلخ باتوں کو بھی نرمی کے پیرائے میں بیان کر کے بات منواتے تھے۔ ”ایسا! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر سنگاپور کے ٹکٹ اور ہوٹل ریزرویشن جلد ہی ہائیڈرے کر دی ہے۔“ نورہ نے شمشہ آبا کو دیکھتے ہوئے آرام سے بتایا۔ ”چلو! ٹھیک ہے ہم لوگ جاؤ، لیکن ظفر کوشش کرنا جلدی آجائو۔ ورنہ تمہارے کام کا حرج ہو گا۔“ ”جی بالکل ایسا! آپ فکر ہی نہ کریں۔“ جواب نورہ نے نہایت فرماں برداری سے دیا۔



”تقریباً دو ہفتے بعد نورہ اور ظفر کو واپس ہوئی تھی۔ دونوں سب گھر والوں کے لیے بہت سے تحائف لائے تھے۔ کچھ دن تک تو نورہ سنگاپور کے قصبے سناٹی رہی۔ اس کے بعد نورہ نے گھر کے بیشتر کام سنبھال لیے اور زندگی معمول پر آئی۔

”ایسا! یہ آپ کی چائے اور شمشہ آئی آپ کی چائے یہ رہی۔“ ”شکریہ بیٹا! اس وقت چائے کی بے حد طلب تھی۔“ مختار صاحب نے نورہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

شمشہ آبا نے ناگواری سے نورہ کو دیکھا۔ وہ اس وقت گھر کا بجٹ ترتیب دے رہی تھیں اور کسی کی بھی مداخلت برداشت نہیں کرتی تھیں۔ ”نورہ! ذرا اپن میں دیکھنا۔ کچھ جلنے کی بو آ رہی ہے شاید۔“ نورہ کو پیچھے دیکھ کر شمشہ آبا نے اسے وہاں سے اٹھانا چاہا۔

”نہیں آئی! امی بچن میں ہی ہیں۔“ یہ کہہ کر نورہ صبح کا اخبار لے کر بیٹھ گئی۔

”ایسا! آپ نے یہ کالم پڑھا جس میں پاکستانی حکمرانوں کی خاصی کھچائی کی گئی ہے اور خاصی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے؟“

نورہ کچھ دن سے مختار صاحب سے کسی نہ کسی کالم

بانیوز چیلن کے کسی ٹاک شو پر مباحثہ شروع کر دیتی اور اٹھ اٹھا چاہے وہ آنکھیں۔ مختار صاحب بھی بر جوش ہو جاتے اور گرا گرم بحث شروع ہو جاتی۔ جس کا اختتام نورہ اور مختار صاحب کے اتفاق رائے پر ہوتا۔ سب شمشہ کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا، مگر خاموش رہتیں کیونکہ وہ اس معاملے میں بول بھی کیا سکتی تھیں۔ اب بھی وہ دونوں کی باتیں سن رہی تھیں اور دیکھ رہی تھیں کہ کس طرح نورہ مضبوط دلائل دے کر مٹانے والے کو آسانی سے جت کر دیتی ہے۔

مختار صاحب سے بات کرتے کرتے اچانک ہی نورہ نے شمشہ آبا کو مخاطب کر ڈالا۔

”آئی! آپ بجٹ بنا رہی ہیں؟“ شمشہ آبا یہی جائزہ لے رہی تھیں کہ نورہ کس طرح حکمران پالیسیوں کو نشانہ بناتے ہوئے روئے سخن منگائی کی طرف لے گئی اور منگائی کا رونا روتے ہوئے یکدم انہیں مخاطب کر ڈالا۔

”آہ ہاں۔“ شمشہ آبا گڑبگڑائیں۔ ”آئی منگائی۔“ اوپر سے شاہ خرچیاں۔ مہینہ پورا لڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

”آئی! آپ پر تو بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اتنی منگائی میں بجٹ سنبھالنا آسان کام نہیں ہے۔“ نورہ کے کنبے میں ہمدردی تھی۔

”اسے لی بی! اہم کیا جانو؟ کس طرح پورا کرتے ہیں ہم بڑے۔“ بغض و نفرت تو اتنا ڈپریشن ہوتا ہے کہ بس لیکن خاموش رہتے ہیں کہ ذمہ داری ہماری ہے تو ہمیں ہی گھر کو سنبھالنا ہے۔ شمشہ آبا بڑے دنوں کی بجز اس نکل رہی تھیں۔

”یہ بات تو آپ نے سو فیصد درست کہی آبا!“ مختار صاحب تو اپنی بہن کے سب سے بڑے ہمدرد تھے۔

”واقعی ایسا! میری ماما کہتی ہیں، نورہ! تمہاری شمشہ آئی نے سارا گھر سنبھالا ہوا ہے۔ ہر وقت گھن چکری رہتی ہیں۔ یہ جھکتی نہیں ہیں۔“ آج نورہ کی ساری ہمدردیاں شمشہ آبا کے ساتھ تھیں۔

”اگرے نورہ! کیا بتاؤں؟ اتنا تھک جاتی ہوں لیکن

میں نہیں کروں گی تو اور کون ہے اس قاتل جو اس گھر کو چلا سکے۔“ شمشہ آبا کے چہرے پر یکدم محکم اثر آئی حالانکہ وہ صرف نصرت کو حکم دینے کا کام کرتی تھیں۔ اور مختار صاحب کو بھی یکدم پشیمانی نے آکھیر کر ان کی بہن پر اتنی ذمہ داریاں ہیں۔ کس طرح وہ بے چاری اکیلے ان کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔

”آئی! مجھے آپ کی محکم کا احساس ہے کیونکہ اسی طرح ہی بہت سی ذمہ داریاں میری ماما پر بھی ہیں۔ ہماری بھابھی صاحبہ تو ماشاء اللہ سے اپنے موڈ کی مالک ہیں، لیکن ماما مجھے اکثر کہتی ہیں، نورہ جب سے تم مٹی ہو مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میرا دل انا باندھ چلا گیا۔ تم تھیں تو کتنے کاموں کا پتا بھی نہیں چلتا تھا اور اب سب کچھ میرے کندھوں پر آ گیا ہے۔“

”ارے ہاں! میں نے نوٹ کیا ہے تمہاری بھابھی کچھ آرام طلب ہیں۔“ شمشہ آبا یہی نورہ کے گھر والوں کے نیچے اویسنے کے موڈ میں تھیں جبکہ مختار صاحب کے ذہن میں ایک خیال آیا۔

”نورہ! تم اپنی شمشہ آئی کا ہاتھ کیوں نہیں پٹاتیں؟“

”کیوں نہیں مجھے تو ان سب کاموں کی عادت ہے۔“ نورہ خوش ہو کر بولی۔

”تو چلو! پھر ابھی سے بسم اللہ کرو۔ اپنی آئی کے ساتھ بجٹ بناؤ۔“ نورہ کی تقریر بھی کروی گئی۔

”ارے نہیں مختار! یہ کل کی بچی کیا جانے ان ذمہ داریوں کو۔ اور ویسے بھی یہ تو اس کے آرام کرنے کے دن ہیں۔“ شمشہ آبا کو نورہ سے خطرہ محسوس ہوا۔

”نہیں آئی! ذمہ داری دی جاتی ہے تو اسے نبھانا بھی آتی جاتا ہے۔ میں تو صرف آپ کے خیال سے مان گئی تھی۔ اگر آپ کو اچھا نہیں لگا تو کوئی بات نہیں۔“ نورہ نے مسکین صورت بنا کر کہا۔

”نہیں نہیں نورہ! آپا کو کیوں برا لگے گا۔ میں تو کبھی محسوس ہی نہیں کر پایا کہ آپا تھک بھی جاتی ہوں گی۔“

”نہیں مختار! ایسی بات میں ہے۔“

”نہیں آبا! میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں۔ نورہ



ابن تم انہی آٹھ کی ہمدرد کروادیا کرو۔ ”مختار صاحب نے آپ کی بات کاٹ کر نویرہ کو مخاطب کیا۔  
 ”جی ہاں! جیسا آپ کہیں۔“ نویرہ کا میاں ہو گئی تھی، جبکہ شمسہ آپا بل کھا کر رہ گئیں۔ انہیں نویرہ کا ہمدردی کرنا سمجھ میں آ گیا تھا۔

کو تو تو یہ کابل چاہا کہ کے چکن ”چاری“ ہے چٹ  
تو ہو گا۔ مگر جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں پیار بھری  
”شہمہ آئی! رہنے دیں۔ آپ یہ مت کھاؤ۔  
میں آپ کے لیے آلیٹ بنا دیٹی ہوں۔ خدا نخواستہ  
آپ کی طبیعت نہ خراب ہو جائے۔“

”ظفر! جب میں نے تم سے کہا تھا کہ کاروبار میں  
نفع نقصان تمہارا معاملہ، لیکن گھر تمہارا ایک لگا بندھا  
خرچہ دوگے تو پھر یہ کیا ہے؟“ نوریہ ابھی کمرے میں  
داخل ہوئی تھی۔  
”باباجان! دس ہزار کم ہیں۔ وہ میں نے رکھ لیے  
تھے۔“

شمسہ آپ کو آج سارے بدلے اتارنے کا موقع ملا تھا وہ  
کیسے چپ رہیں۔ اس سے پہلے کہ ظفر کچھ بولتا تو یہ  
نے مختار صاحب کو مخاطب کیا۔



”نہیں مختار! اب ایسی بھی طبیعت خراب نہیں میری کہ میں اپنی ذمہ داریوں سے ہی منہ موڑ لوں۔“ شمسہ آپا نہیں جانتی تھیں کہ پچھلے دنوں سب کی توجہ اپنی طرف کرنے کے لیے بیماری کا بہانہ انہیں اڑانا ہی پڑے گا۔

”نہیں آپا! بس اب بہت ہو گیا۔ اب آپ کے آرام کرنے کے دن ہیں۔ اللہ نے ظفر کا جو ڈاکیٹ سبجہ دار عورت سے بنایا ہے۔ وہ سب سنبھال سکتی ہے۔ ماشاء اللہ بہت سمجھ بوجھ والی بچی ہے۔ بہت صلا صلیں ہیں اس میں۔“

نصرت اپنے سر تاج کو دیکھ رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں کہ ان میں کیا کمی تھی۔ لیکن انہیں اپنی سوجھ بوجھ کو زبان دینا اور اپنی بات منوانا نہیں آتا تھا اور یہی کمی تھی ان میں۔ وہ بے بس بیٹھی شمسہ آپا اور مختار صاحب کو شکوہ کنال نظروں سے دیکھتی ہوئی کچن کی جانب چل دیں۔



”نصرت! اٹھو۔ نصرت! مختار صاحب تکلیف کی شدت سے کرا رہے تھے۔“ مختار کیا ہوا آپ کو؟“ نصرت نے انہیں سینہ پکڑے دیکھا تو بھلا گئیں۔

”آپ یہ پانی پیئیں۔“ نصرت کے اپنے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔

”قن۔ صدمہ۔ صدمہ۔“ نصرت کی شدت سے مختار صاحب جملہ بھی ملل نہیں کر پا رہے تھے۔

”میں ظفر کو اٹھاٹی ہوں۔“ نصرت یہ کہہ کر ظفر کے کمرے کی طرف بھاگیں۔

”ظفر۔ ظفر! دروازہ کھولو۔“ نصرت زور زور سے دروازہ پیٹتے ہوئے ظفر کو آوازیں بھی دیے جاری تھیں۔

”ہی کیا ہوا اخیر ہے؟“ ظفر نے دروازہ کھولا تو بند سے اس کی آنکھیں بند تھیں۔

”ظفر! تمہارے ابا کو پتہ نہیں کیا ہو گیا۔ وہ۔“

کہ ہماری بیٹی اتنی عقل مند ہے۔ کیوں نصرت! دیکھا ہماری نویریہ کو کفایت شعار ہے۔ ورنہ ہم تو سمجھتے تھے کہ نویریہ ناز و نعم میں پلی ہے۔ شاہ خرچ ہوگی۔“ مختار صاحب نے نصرت کو مخاطب کیا جو کہ تب سے خاموش تماشائی بنی کھڑی تھیں۔

”بابا! یہ تو غلط بات ہے۔ آپ مجھے غلط سمجھتے رہے۔“ نویریہ نے لاڈ سے کہا۔ ظفر بھی آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”نہیں! اب بالکل نہیں ہوگی یہ غلطی ہم سے۔ ہمیں تو تم پر پورا یقین ہے کہ تم اس گھر کو بہت اچھے طریقے سے چلا سکتی ہو۔ اسی لیے گھر کا بجٹ اب تمہارے ہاتھ میں۔“ مختار صاحب نے اپنے رویے کا مداوا کرنا چاہا۔

”کیا مطلب بابا؟“ نویریہ سب سمجھتے ہوئے بھی نا سمجھی سے بولی۔

”مطلب تمہاری ترقی ہو گئی ہے بھی۔ اب تم اپنی شمسہ آپا کو آرام دو اور گھر کا بجٹ سنبھالو۔“ مختار صاحب کا بولنا تھا کہ نویریہ اور ظفر خوش ہو گئے۔

”چلو اب تم لوگ ابھی بازار جاؤ اور اپنے بیٹجے کے لیے اچھا سا تحفہ لیانا۔“ نصرت اور شمسہ آپا اب تک حیران تھیں۔ جو کام نصرت تیس سال میں نہیں کر سکی تھیں وہ نویریہ نے اٹھ مہینے میں کر دکھایا۔

”مختار! یہ کیا کیا تم نے۔ وہ کل کی باشت بھر لڑکی اور تم نے سارا گھر اس کے حوالے کر دیا۔“ شمسہ آپا تیز لہجہ میں بولیں۔

”آپا! میں نے ٹھیک کیا۔ آپ اس عمر میں ان سب جھنجھٹوں سے انکی نمٹ تو لیتی ہیں مگر آپ کی طبیعت بھی خراب رہنے لگی ہے۔ آپ کالی پی ہانی رہتا ہے۔ عموماً اس عمر میں خواتین آرام کرتی ہیں یا پوتے پوتیوں سے کھیلتی ہیں، جبکہ ہم نے آپ کے کندھوں پر بوجھ ڈال رکھا ہے۔ سچ آپا! میں کالی دنوں سے بہت فکر مند تھا۔“ مختار صاحب کے لہجہ میں ہنس کے لیے فکر مندی واضح تھی۔



کہتے ہی نصرت سسکیاں بھرنے لگیں۔

ظفر جب کمرے میں پہنچا تو مختار صاحب سینہ پکڑے بائیں جانب کی کمرٹ میں گول ہو کر لیٹے تھے۔

ظفر نے جلدی سے گاڑی نکالی اور مختار صاحب کو لے کر اسپتال چلا گیا۔ نصرت بھی ساتھ گئیں۔ شمسہ آپا بھی جانا چاہتی تھیں مگر ظفر نے انہیں منع کر دیا اور جلدی میں ماں کو لے کر نکل گیا۔ اس وقت نویرہ کو شمسہ آپا پر حقیقتاً "ترس" آ رہا تھا۔ شمسہ آپا روئے چلی جا رہی تھیں۔

"آئی! آپ روئیں مت۔ اللہ سے دعا کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

نویرہ جتنا انہیں دلا ساقی شمسہ آپا کے رونے میں اتنی ہی روانی آجاتی۔ شمسہ آپا وہ رات قیامت کی طرح تھی۔ وقت تو جسے رک گیا تھا۔ نویرہ نے ظفر کو دو تین بار فون بھی کیا لیکن ظفر فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ یہ بات بہت پریشان کن تھی۔ وہ بھی اللہ سے خیریت کی دعا مانگنے لگی۔

فجر کے وقت ظفر کی گاڑی گھر کے دروازے پر آکر رکی۔ گاڑی کے پیچھے ایسوی لیس بھی تھی۔ مختار صاحب کو ایسوی لیس میں لایا گیا تھا۔ مختار صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ نصرت غم سے نہڑاں اٹھاتی تھیں۔ بار بار بے ہوش ہو جاتیں جبکہ شمسہ آپا سکتے کے عالم میں مختار صاحب کی میت کے قریب بیٹھ گئیں۔ نازش بھی پہنچ گئی۔ اچانک ہی پورا گھر سوگ کی چادر میں لپٹ گیا۔ ظفر نے بظاہر تو اپنے آپ کو سنبھالا ہوا تھا مگر وہ بھی بہت ٹوٹ گیا تھا۔ ایسے میں نویرہ نے سب کو سنبھالا۔ گو کہ وہ بھی صدمے کا شکار تھی لیکن گھر کے باقی لوگوں کے لیے اس صدمہ کی شدت زیادہ تھی۔

نویرہ نے ساری ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھالی۔ شمسہ آپا کا سکتہ ٹوٹنے میں دو تین دن لگے جبکہ نصرت کی طبیعت سنبھلنے میں ہی نہ آئی تھی۔ ظفر سب کے سامنے مضبوط نظر آتا تھا جبکہ نویرہ جانتی تھی کہ تنہا

میں وہ بچوں کی طرح ہلک کر رہا ہے۔ نازش بھی ایک مہینے تک گھر میں رہی پھر اسے جانا پڑا۔ نویرہ کے گھر والے بھی ہر کام میں پیش پیش رہے۔ نویرہ کی دل بھی ہر روز آجاتی۔ سب مہمانوں کو دیکھتیں۔ تعزیت کرنے والے ان ہی کے پاس بیٹھے۔ نویرہ نصرت اور شمسہ آپا کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ مہمانوں کو دیکھ سکتیں یا ان کی تواضع کر سکتیں۔ ظفر نے بھی ظفر کا بیڑہ بھائیوں کی طرح ساتھ دیا۔ وہ ظفر کو سمجھاتا کہ اب وہی اس گھر کا بڑا ہے۔ اسے اپنی ماں کا سہارا بننا ہے۔

نویرہ نے پورے گھر کو سنبھال لیا اور گھر کا نظام بھٹی چلانے لگی۔ کیونکہ زندگی کے اس کھیل میں اب اسے ذمہ دار ہو کر دوڑنا پڑتا تھا اور اس نے یہ کردار بھٹی نبھایا۔ شمسہ آپا کو تو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ مختار چلے گئے۔ وہ ان کے بھائی ہی نہیں بیٹے بھی تھے۔ کبھی نویرہ سے کہتیں مختار عصر کی نماز پڑھنے گئے تھے۔ انہیں فون کر دیا کہ اب تک آئے کیوں نہیں یا پھر کہتیں ان کے کپڑے تو استری کروادو۔ میرے بھائی کا کوئی دھیان نہیں رکھتا۔ ایسے میں نازش یا نصرت پاس ہوتیں تو رونے لگتیں جبکہ نویرہ انہیں سنبھالتی تھی۔

نویرہ شمسہ آپا کو اس غم سے نکالنا چاہتی تھی اور کامیاب بھی رہی۔ چھ ماہ بعد گھر معمول پر آگیا۔ پورے خاندان میں نویرہ کی دھاک بیٹھ چلی تھی۔ سب یہی کہتے کہ نویرہ جیسی ہو آج کے دور میں ملنا مشکل ہے ہر جگہ نویرہ ہی کا ذکر ہوتا۔ شمسہ آپا دنیا کی طرف دوبارہ راغب ہوئیں تو بقیوں ان کے خیر خواہوں کے پائی سر سے گزر چکا تھا۔ گھر کا نظام نویرہ خوش اسلوبی سے چلا رہی تھی۔ گھر میں کب کیا ہو گا کسی طرح ہو گا سب نویرہ کے ہاتھ میں تھا۔

شمسہ آپا کو بھائی کی موت کا غم ضرور تھا اور اس غم میں صبر کرنے میں انہیں کافی دیر بھی لگی مگر اپنی راجدھانیوں کسی کے ہاتھ میں دیکھ کر ان کی برداشت جواب دے گئی۔ انہوں نے پھر سے گھر میں داخلہ شروع کر دی۔ نصرت نے تو اللہ سے لو لگلی تھی۔ ان

کے ہاتھ میں ہر وقت تسبیح ہوتی یا وہ نماز اور قرآن پڑھنے لگتیں۔ یا پھر نویرہ کی پچن میں مدد کروانے چل پڑتیں۔ نازش اپنے گھر کی بھی۔ کبھی بھی آجاتی مگر مہمانوں کی طرح گھر کے معاملات میں نہ پہلے اس نے داخلہ کی تھی اور نہ اب کرتی تھی۔ جب کہ شمسہ آپا کسی بھی طرح سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ نویرہ کی ہر بات اور ہر کام میں میں میں نکلنے لگتیں۔ اس کے مشوروں کو رد کر کے اپنی مرضی توہمیتیں پہلے کچھ عرصہ تو نویرہ نے برداشت کیا کہ ابھی مختار صاحب کے جانے کا غم نازہ ہے لیکن ایک دن اس کی بھی برداشت جواب دے گئی۔ اس نے اپنے گھر والوں کو اس شام چلے پر بلایا تھا۔

شمسہ آپا پچن میں گئیں تو چائے کے لوازمات دیکھ کر ان کا دماغ ٹھوم گیا۔ انہوں نے آج تک نصرت کو اتنی اجازت نہ دی تھی کہ وہ اپنے میکہ والوں کی اتنی خاطر کرے چاہے وہ لوگ کھانے پر کیوں نہ آ رہے ہوں۔ جبکہ نویرہ نے تو تین منزلہ ٹرائی پوری کی پوری پہلی تھی۔

"تویرہ! حد ہے فضول خرچی کی۔ تمہارے گھر والے ماشاء اللہ کھانے پینے لوگ ہیں گھر سے بھی کھا کر آئے ہوں گے اتنا تو میں نے نصرت کو کبھی کھانے پر اہتمام نہیں کرنے دیا۔ حد ہے بھی۔" لیکن سامنے نویرہ بھی نصرت نہیں۔

"اللہ کا شکر ہے آئی میرا شوہر اچھا کماتا ہے اگر میں نے تھوڑا اہتمام کر لیا تو کیا بڑی بات ہوگی۔"

"بس بی بی! یہ اپنے شوہر کی کمائی کا زعم ہمیں نہ دکھاؤ۔" شمسہ آپا نے ہاتھ جھاڑے۔ "چلو اب اس میں سے دو چار چیزیں تو کم کرو۔" انہوں نے ٹرائی پورے اسی وقت ظفر بھی پچن میں داخل ہوا۔

"آئی! ایک منٹ دیکھیں میں جو کہتی ہوں سچ کہتی ہوں منافقت مجھ سے نہیں ہوتی۔ سچ پوچھیں تو آپ کی عمر اللہ اللہ کرنے کی ہے ناکہ دوسروں کی زندگیوں میں داخلہ کرنے کی۔ ظفر آپ کے بیٹوں کی جگہ ہیں جبکہ حقیقت تو یہی ہے کہ وہ آپ کے بیٹے نہیں سمجھے

ہیں۔ امی کے بیٹے ہیں۔ وہ چاہیں تو داخلہ کر سکتی ہیں لیکن انہیں دیکھیں، کتنے آرام سے لاؤنج میں بیٹھی میری بلاتے بائیں کر رہی ہیں۔" نویرہ نے دھیمی آواز میں سچ حقیقت بیان کی۔ "تم مجھے جلتا کیا چاہتی ہو۔ یہی کہ یہ گھر میرا نہیں۔ دیکھو ظفر اپنی بیوی کو یہی لکھی بائیں کر رہی ہے مجھ سے۔" شمسہ آپا کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

"دیکھیں پیچھو! غلطی نویرہ کی نہیں ہے۔ آپ بڑی ہیں۔ یہ بات تو آپ کے سمجھنے کی ہے۔ بہتر ہوگا اس گھر میں امن برقرار رہے اور تمہارے میرے کی باتیں نہ ہوں۔" ظفر نے دو ٹوک بات کی۔ شمسہ آپا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "تو کیا میں امن کے خلاف ہوں یا میری وجہ سے امن برقرار رہا ہے گھر کا۔"

"آئی! امیرا خیال ہے کہ اب ہمیں باہر جا کر چائے پینی چاہیے۔" یہ کہہ کر نویرہ اور ظفر ٹرائی لاؤنج میں لے گئے جبکہ شمسہ آپا کے اندر بہت کچھ ٹوٹ گیا۔ ان کی راجدھانی کبھی تھی ہی نہیں۔ وہ تو صرف قابض تھیں۔ یہ حقیقت سمجھنے میں انہوں نے بہت دیر کر دی۔ نویرہ ان کی ہم پہلہ تھی ان کی فکر کی تھی جبکہ نصرت نے سمجھوتہ کر لیا تھا اور نویرہ انہیں بہت کچھ سمجھاتی تھی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے  
آسیہ سلیم قریشی کے 3 دگش ناول

کتاب کا نام	قیمت
وہ شبلی سی دیوانی سی	600/- روپے
آرزو گھر آئی	500/- روپے
تھوڑی دور ساتھ چلو	400/- روپے

ناول منکوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ 45/- روپے

مکھانے کا پتہ:  
کتبہ عمران ڈائجسٹ - 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021



# میں کا کسو

ایک فلک شاہ کو خوابوں میں اکثر ایک خوب صورت اور نشلی آنکھوں والی لڑکی روتے ہوئے نظر آتی ہے۔ اس نے اسے فرضی نام ”خور عین“ دے رکھا ہے۔ وہ اس پر کچھ تحریر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔  
”الریان“ کے سربراہ عبدالرحمن شاہ ہیں۔ مصطفیٰ، مرتضیٰ، عثمان اور احسان (شرانی) ان کے بیٹے ہیں۔ عمارہ (عمو) اور زارا ان کی بیٹیاں ہیں۔

”مراد بیس“ کے سربراہ مرزا شاہ کے بیٹے سلجوق، عبدالرحمن کے گہرے دوست ہیں۔ سلجوق کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے فلک شاہ (موسیٰ) ”الریان“ آجاتے ہیں۔ وہاں ان کی سب سے دوستی ہو جاتی ہے۔ احسان سے ان کی دوستی زیادہ سہی ہو جاتی ہے اور عمارہ سے محبت کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ فلک شاہ کالج میں سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگتے ہیں۔ شاہ کو سلجوق کے انتقال کے بعد ان کی والدہ زہرا بیگم کے چکر میں لے جاتی ہیں مگر وہاں اس کا شوہر فیروز فلک سے چڑنے لگتا ہے۔ سلجوق کے انتقال کی وجہ سے جائیداد کے شرعی حق سے محرومی کے بعد وہ فلک شاہ کو واپس مراد شاہ کے پاس چھوڑ جاتی ہے اور چھ ماہ بعد فوت ہو جاتی ہے۔

## میں کا ناول





عبدالرحمن شاہ کی بہن مروہ کی سرالی رشتے دار ماہرہ سے ملاقات میں احسان اسے پسند کرنے لگتے ہیں۔ عبدالرحمن شاہ فلک شاہ سے اپنے بیٹوں کی طرح محبت کرنے لگتے ہیں اور اپنی بیٹی عمارہ کی شادی کر دیتے ہیں۔ ایک جھگڑے میں فلک شاہ "الریان" والوں سے پیشہ کے لیے قطع تعلق کر کے ہماول پور چلے جاتے ہیں۔ بہت عرصے بعد ان کے بیٹے ایک کی "الریان" میں آمد ہوتی ہے۔ احسان کی بیوی ماہرہ اور بیٹی رائیل کے علاوہ سب ایک کی آمد پر خوش ہوتے ہیں جبکہ احسان ایک کافین ہے۔ "الریان" میں رہنے والی ارب فاطمہ جو کہ مروہ پچھو کے شوہر کی رشتے کی بھانجی ہے ایک سے کافی متاثر ہے۔

عمارہ اور فلک شاہ "الریان" آنے کے لیے بہت ترپتے ہیں۔ عمارہ کو انجانا ایک ہوتا ہے تو عبدالرحمن شاہ بھی ہو جاتے ہیں۔

احمد رضا اور سمیرا، حسن رضا اور زبیرہ بیگم کے بچے ہیں۔ احمد رضا بہت خوب صورت اور ہنڈسم ہے۔ وہ خوب ترقی کامیابی اور شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ رضا کا دوست ابراہیم اسے ایک بزرگ اسماعیل خان سے ملوا تا ہے۔ ان سے مل کر رضا کو حسن بن صباح کا گمان گزر تا ہے۔

عمارہ کی طبیعت بہتر ہوتے ہی ایک انہیں بابا جان عبدالرحمن شاہ کی بیماری کا جتنا ہے۔ عمارہ یہ سنتے ہی بابا جان سے ملنے کے لیے پہنچ جاتی ہیں۔

احسان شاہ، فلک شاہ کو ماہرہ سے اپنی محبت کا احوال سناتا ہے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ماہرہ نے اس سے کھل کر اظہار محبت کر لیا ہے جو کہ اس کا رشتہ عمارہ سے طے ہو چکا ہے اور وہ عمارہ سے بے حد محبت کرتا ہے۔

احمد رضا کو پولیس گرفتار کر کے لے جاتی ہے۔ اس پر الزام ہے کہ ایک شخص اسماعیل جو خود کو اللہ کا بھیجا ہوا خلیفہ کہتا ہے، لوگوں کو مگاتا ہے۔ احمد رضا اسماعیل سے ملتا ہے۔ احمد رضا کو اس کے والد کھلے آتے ہیں۔

الویتا جو اسماعیل کے ہاں احمد رضا کو ملی تھی۔ وہ اسے فون کر کے بلائی ہے۔ وہ وہاں جاتا ہے تو اس کی ملاقات اسماعیل سے ہوتی ہے۔ اسماعیل احمد رضا سے کہتا ہے کہ احمد رضا کو دولت، عزت اور شہرت ملنے والی ہے۔ احمد رضا محسوس ہو جاتا ہے۔

ہمدان کو عمارہ پچھو کی بیٹی انجی بہت پسند تھی، لیکن گھروالوں کے شدید رد عمل نے اسے مایوس کر دیا۔ نئی نسل میں سے کوئی نہیں جانتا کہ عمارہ پچھو پر الریان کے دروازے کیوں بند ہیں۔

ارب فاطمہ مروہ پچھو کی سرالی رشتہ دار ہے، جسے مروہ پچھو پڑھنے کے لیے الریان لے آئی ہیں۔ یہ بات ماہرہ بھی کو پسند نہیں ہے۔ ایک عمارہ کو لے کر بابا جان کے پاس آیا تو اتنے عرصہ بعد انہیں دیکھ کر بابا جان کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔

بابا جان کی طبیعت سنبھل جاتی ہے۔ اسپتال میں عمارہ کو کچھ کرسب بہت خوش ہوتے ہیں، مگر ماہرہ اور رائیل انہیں تنفر اور سخت تنقیدی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ ماہرہ عمارہ سے کافی بدتمیزی سے پیش آتی ہے جبکہ احسان شاہ غصے سے منہ موڑ کر چلے جاتے ہیں۔

فلک شاہ، مروہ پچھو سے ماہرہ کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ وہ فلک اور عمارہ کے فوری نکاح کا مشورہ دیتی ہیں۔ پول مصطفیٰ اور عثمان کے وکیلہ میں ان دونوں کا نکاح ہو جاتا ہے۔ ماہرہ رحیم یار خان سے مصطفیٰ کو فون کر کے اپنا نام پوچھ رہی ہے۔

فلک شاہ کے خلاف بھڑکائی ہے مگر مصطفیٰ مروہ پچھو سے بات کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں تاہم ان کو یہ فون کال آج بھی یاد ہے۔

فلک شاہ نے حق نوازی کی پارٹی کا قاعدہ طور پر اختیار کر لیا۔ ماہرہ اور احسان کی شادی کے بعد ایک جھگڑے میں فلک شاہ بھی بھی "الریان" میں قدم نہ رکھنے کی قسم کھاتے ہیں بصورت دیگر ان کی طرف سے عمارہ کو طلاق ہوگی جبکہ احسان شاہ کہتے ہیں کہ "الریان" سے اگر کوئی "مراویس" گیا تو وہ خود کو گولی مار لیں گے۔

سمیرا کو شک ہو جاتا ہے کہ احمد رضا اسماعیل خان کے پاس اب بھی جاتا ہے تاہم احمد رضا اسے ہلا لیتا ہے اور پولیس ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ اسماعیل خان اسے ورلڈ سوسائٹی آف مسلم یوٹی کا اہم کارکن بنا کر اس سے اپنے

سیدھے بیان دلوادیتا ہے۔ حسن رضایہ خبر پڑھ کر احمد رضا کو کھرے نکال دیتے ہیں۔

عبدالرحمن شاہ کی طبیعت ذرا سنبھلتی ہے تو ایک انہیں کرنل شیردل کی انیکسی میں لے آتا ہے۔ وہاں سے وہ فلک شاہ سے ملنے ہماول پور جانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ احسان شاہ، ماہرہ اور رائیل کے ساتھ رحیم یار خان چلے جاتے ہیں اور عمارہ سے نہیں ملتے۔ ایک کی پیدائش کے بعد ماہرہ نے احسان شاہ کے ساتھ منگنی کرتے ہوئے فلک شاہ کو دھمکی دی تھی کہ وہ اپنی بے عزتی نہیں بھولی ہے اور وہ اس بات کا بدلہ ضرور لے گی۔

ایک ارب فاطمہ سے اظہار محبت کرتا ہے۔

حسن رضا، احمد کو کھرے نکال کر دھکی ہو جاتے ہیں۔ تاہم انہیں احمد کی حرکت پر ملال بھی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے معافی مانگتے ہیں اور اس کے دوست ابراہیم کے ساتھ اسے دھوکہ دیتے ہوئے طیب خان کی کوٹھی جاتے ہیں، مگر وہ لا علی کا اظہار کر دیتا ہے۔ احمد رضا، الویتا کے ساتھ رہنے لگتا ہے۔ وہ اکثر گھر جانے کی خواہش کرتا ہے۔ مگر الویتا مختلف

چلے ہمانوں سے اسے روک لیتی ہے۔ ایک بریس کانسٹبل میں طیب خان اور رباب حیدر مدہوشی کی کیفیت میں احمد رضا سے اسماعیل خان کی نبوت کا بیان دلوادیتے ہیں۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ اس بیان کی تردید کرتا ہے، مگر رچی اسے سخت سے جھٹا دیتا ہے۔

عمارہ اور ایک کے ساتھ عبدالرحمن شاہ کے مراد بیس آنے کی خوشی میں فلک شاہ خوب تیاری کرتے ہیں۔ وہ اپنے ماضی میں کھو جاتے ہیں۔ فلک شاہ، ماہرہ اس کا ذکر شیردل سے کرتے ہیں۔ شیردل انہیں تسلی دیتے ہیں کہ وقتی جذباتیت ہے۔ ختم ہو جائے گی۔ ان کی پارٹی نے بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ حق نوازی کی صحافی دوست کو چند اہم شخصیات نے اغوا کر کے قتل کر دیا تھا جس کی وجہ سے حق نواز نے پارٹی چھوڑ دی۔

ایک کی پیدائش پر عمارہ ہماول پور چلی گئیں۔ ایک ایک ماہ کا ہوا تو ادائی کا انتقال ہو گیا۔ حق نواز نے دوسری پارٹی اختیار کر لی۔ فلک شاہ ان کے ساتھ تھے۔ فلک شاہ الریان کے برابر والے مکان میں رہتے تھے اور اکثر ہی الریان جاتے رہتے تھے۔ دادا جان کا بھی انتقال ہو گیا۔ عبدالرحمن شاہ نے احسان کی شادی کا فیصلہ کیا۔ ماہرہ نے عین وقت پر شادی سے انکار کر دیا۔ یہ بات مروہ پچھو اور فلک شاہ جانتے تھے۔ رحیم یار خان میں ماہرہ اچانک فلک شاہ کے کمرے میں داخل

ہوئی ہے اور پرانی باتیں دہرائی ہے تاہم آخر میں احسان سے شادی پر راضی ہو جاتی ہے۔ ان دنوں ملک دشمن عناصر کی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ حق نواز بہت پریشان رہتا تھا۔ اس کی جان کو بھی خطرہ تھا۔ دوسری طرف ماہرہ، عمارہ سے بدتمیزی سے پیش آتی تھی۔ حق نواز کہیں لاپتا ہو گیا۔ کافی دنوں بعد شیردل فون پر جاتے ہیں کہ حق نواز زخمی حالت میں

اسپتال میں ہے اور فلک سے ملنا چاہتا ہے۔ فلک پریشانی کے عالم میں تیز بخار میں جھکتے ایک کو الریان چھوڑنے جاتے ہیں تو ملازمہ کی اطلاع پر وہ احسان کے کمرے میں جاتے ہیں۔ مگر کمرے میں قدم رکھتے ہی ماہرہ ان پر غلط الزامات کی بوچھاڑ

کر دیتی ہے۔ احسان شاہ، ماہرہ کی بات پر یقین کر لیتا ہے۔ فلک شاہ کو صفائی دینے کا موقع نہیں ملتا۔ انہیں حق نواز کے پاس جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ وہ نیچے آتے ہیں تو بابا انہیں ڈانٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ انہیں علم ہو جاتا ہے کہ وہ کسی سیاسی پارٹی سے منسلک ہیں۔ غصے کی کیفیت میں فلک شاہ کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ آئندہ اگر وہ الریان آئے تو عمارہ کو نین طلاق۔

حق نواز ان سے ملے بغیر مر جاتا ہے۔ جنازے میں انہیں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ان پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ وہ کی مفتیوں اور علماء سے فتویٰ لیتے ہیں۔ ان سب کے مطابق الریان جانے کی صورت میں عمارہ ان پر حرام ہو جائیں گی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مراد بیس چلے جاتے ہیں۔

—۴—  
چھٹی قسط

"تم ٹھیک تو ہونا احمد؟" الویتا نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا۔  
"الویتا! مجھے گھر جانا ہے۔"  
"ہاں تو چلے جانا لیکن۔۔۔" وہ یکدم پریشان نظر



آئے لگی تھی۔

”لیکن کیا۔۔۔؟“ اس نے بے چینی سے اس کا ہاتھ

اپنے بازو سے ہٹایا۔

”وہ۔۔۔“ کچھ جھجکی ”آج باہر جانے میں خطروہ

لوگ بہت غصے میں ہیں۔ وہ نہیں۔“

”وہنا! مجھے یہاں ہر شخص نہیں پہچانتا۔ کسی کو کیا

خبر میں کون ہوں۔ میں کوئی ایسی وی آئی پی شخصیت

نہیں ہوں۔ مجھے تو میرے سارے محلے والے بھی

شکلا ”نہیں جانتے ہوں گے۔ کسی کو کیا خبر کہ یہ شخص

جو جا رہا ہے احمد رضا ہے جس نے وہ کیواس کی ہے۔“

”لیکن کیا دیتا؟“ اس نے بے چینی سے اس کی

بات کاٹی۔

”وہ شاید حضرت صاحب اجازت نہ دیں۔ انہوں

نے منع کیا ہے باہر جانے سے۔“

”لیکن مجھے جانا ہے ونا! میرے باپ نے یہ خبر نہ

لی تو وہ پاگل ہو جائے گا۔ مر جائے گا اس غم سے کہ اس

کا بیٹا۔“

”اچھا تم چلو اٹھو اپنے۔۔۔ میرا مطلب ہے

میرے کمرے میں چلو۔ میں ابھی آئی ہوں۔ پھر کچھ

کرتے ہیں۔ تم اتنے میں اپنے کپڑے وغیرہ بیک میں

رکھ لو۔“

”اچھا۔۔۔!“ وہ اٹھ کر الوینا کے کمرے میں آیا تھا۔

اس نے الماری میں سے اپنے کپڑے نکال کر بیڈ پر ڈھیر

کر دیے اور الماری کے نچلے خانے سے بیک نکالتے

ہوئے اس کی نظر اپنے اپنی کپڑوں پر پڑی تھی۔ حسن

رضانے اس کی ہر چیز اس میں رکھ دی تھی۔ ہر وہ چیز

جس کی اسے ضرورت ہو سکتی تھی۔

”کیا ابو مجھے معاف کر دیں گے۔ کیا وہ میری بات کا

یقین کر لیں گے کہ یہ سب کچھ میں نے نہیں کہا۔“

وہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک وہ یونہی بیٹھا سوچتا

رہا۔ اس روز ابو نے میرے ساتھ زیادتی کی تھی۔

اور میں نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر

گئی الوینا ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ اٹھا۔ اس نے

دروازہ کھول کر باہر جانا چاہا لیکن دروازہ باہر سے لاکر

تھا۔ وہ دروازے کی تاب پر ہاتھ رکھے شدید سا کھرا

تھا۔ ایک بار پھر اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی

۔ تاب کو ادھر ادھر کھمایا اور پھر الجھا الجھا سا واپس بیڈ

آ کر بیٹھ گیا۔ بیڈ پر بکھرے کپڑے ایک طرف کر کے

بیک نیچے بیڈ کے پاس رکھ کر وہ لیٹ گیا۔ بیٹھے بیٹھے

تھک گیا تھا۔

کیا نہیں اس سے کچھ غلط ہو گیا تھا۔

اور یہ غلطی کہاں تھی۔

وہ آنکھیں موندے سوچنے لگا۔

اس دن سے جب وہ چلی بار ابراہیم کے ساتھ

اسماعیل خان کے پاس آیا تھا۔ آج تک اس نے ہر

بات سوچ لی تھی لیکن اسے کہیں کچھ غلط نظر نہیں آیا

تھا۔ بس یہ ایک بیان جو اس سے غلط منسوب کر دیا گیا

تھا۔ اسماعیل خان اچھا آدمی تھا۔

شاید کوئی بزرگ۔

کوئی ولی۔

لیکن نفوذ باللہ وہ بیغیر کیسے ہو سکتا ہے اور اس نے

تو ایسا کوئی دعو ابھی نہیں کیا۔

اس نے کروٹ بدلی اور ایک بار پھر اسماعیل خان

سے اب تک ہونے والی گفتگو دل ہی دل میں دہرائے

لگا اور یوں ہی سوچتے سوچتے جانے کب اس کی آنکھ

لگ گئی۔ دوبارہ اس کی آنکھ بجنے ہوئے گوشت کی

خوشبو سے کھلی تھی۔

اس نے صبح سے کچھ نہیں کھلیا تھا۔ وہ ایک دم اٹھ

کر بیٹھ گیا۔ بڑی میز پر دو دو ٹکے اور پائیں رکھی تھیں۔

الوینا ایک ڈونٹے کا ڈھکن اٹھائے دیکھ رہی تھی۔ اسے

اٹھنا دیکھ کر وہ مسکرائی۔

”منہ ہاتھ دھو کر کھانا آ جاؤ۔“

وہ خاموشی سے اٹھ کر واش روم چلا گیا۔ واپس آیا تو

میز پر کچھ اور بھی لوازمات رکھے تھے۔ وہ خاموشی سے

کری پر بیٹھ گیا۔ الوینا نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی

۔ ”تم بغیر کچھ کھائے پیے سو گئے تھے۔ میں آئی تھی

نہیں بلانے۔ تم سو رہے تھے میں نے جگایا نہیں۔

بہت سوئے تھے۔ چھن کر رہے ہیں شام کے۔“

”اس زندان میں دن رات کا پتا ہی نہیں چلتا۔“

اچھے میں ہلکی سی آہی در آئی تھی۔ الوینا نے اس کی

پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”تم خود کو یہاں قید سمجھتے ہو احمد!“ وہ بے حد سنجیدہ

تھی۔

”کیا ایسا نہیں ہے؟“

”نہیں بالکل بھی نہیں۔“ الوینا نے نفی میں سر ہلایا

تھا۔ ”مگر آج ہمیں حضرت جی نے باہر جانے سے

منع کر دیا تھا تو صرف تمہارے محلے کے لیے ایک دو

روز میں لوگوں کا جوش و خروش ختم ہو جائے گا تو چلے

جانا۔“

اس نے کھانا کھاتے کھاتے الوینا کی طرف دیکھا۔

”پھر کراہا ہر سے لاک کیوں تھا؟“

”ہرگز نہیں۔۔۔ تم سے کس نے کہا کہ کراہا ہر سے

لاک تھا۔“ الوینا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”میں نے کھولنے کی کوشش کی تھی۔ بند تھا۔“

”اوہ مائی گاڈ! تم غلط فہمی کا شکار ہو۔ اس کمرے کا

لاک خراب ہے۔ بعض اوقات خود بخود لاک ہو جاتا

ہے اور پھر اندر سے نہیں کھلتا۔ جب سے ہم ادھر

نقل ہوئے ہیں تب ہی سے ایسا ہے۔ تم جانتے ہو

حضرت جی کی سیکورٹی کے خیال سے ہم کسی لاک

ٹھیک کرنے والے کو ادھر نہیں لاسکتے ابھی۔“

احمد رضانے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس نے سوچا

ضرور تھا کہ اتنے دنوں سے وہ یہاں ہے۔ پہلے تو کبھی

کرا خود بخود لاک نہیں ہوا تھا۔

”تم بدگمان ہو رہے ہو ہم سے نا تو ٹھیک ہے تم

کھانا کھاؤ۔ میں تمہیں خود گیسٹ تک چھوڑ کر آتی

ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں نمی سی پھیلی تھی۔

”ایسا نہیں ہے ونا۔ میں بدگمان نہیں ہوں۔“ وہ

بکھلا۔

”لیکن میں گھر جانا چاہتا ہوں۔ تم جانتی ہو ابو مجھ

سے پہلے ہی خفا ہیں۔ اس بیان کے بعد تو وہ مزید ناراض

ہو جا جس گے اور مجھے گھر میں کبھی گھسنے نہیں دیں

گے لیکن اب کی بار میں بھی وہاں دھرتا دے کر بیٹھ

جاؤں گا۔ اسی اور سیرا میں تا میری سفارش کرنے کو۔“

اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی

تھی۔

”کو تو میں بھی چلوں تمہارے ساتھ تمہاری

سفارش کرنے کو۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں ابھی نہیں۔“ وہ گھبرایا۔

الوینا بے اختیار ہنس دی۔ اور وہ دم بخود سا ہو کر اس

کے ہموار دانتوں کو دیکھنے لگا۔ اس وقت وہ ساڑھی میں

لبوس تھی اور اس کے نازک سر پر بے پروا اور

میسروں شیدوائی ساڑھی بے حد جرجری تھی۔

”تو ٹھیک ہے پھر کل چلے جانا۔“

”کل۔۔۔“ اس نے الوینا کی طرف دیکھا۔

”ہاں آج حضرت صاحب پر پے سے نکل آئے

ہیں۔ کل شام یہاں ایک بڑی تقریب ہے دو سری

بلڈنگ کے ہال میں کچھ لوگ حضرت جی کے ہاتھ پر

بیعت کریں گے اور اسلام قبول کر لیں گے۔“

”کون رچی وغیرہ؟“

”شاید بھی کچھ اور لوگ بھی ہیں۔“ اس تقریب

میں شرکت کر کے چلے جانا۔ پرسوں صبح کی کسی فلائٹ

سے حضرت جی بھی چلے جائیں گے یہاں سے دہلی اور

وہاں سے شکاگو۔“

”اور تم بھی ان کے ساتھ جاؤ گی؟“

”ہاں!“ الوینا نے کہا یوں کی ڈش اس کی طرف

بڑھائی۔ ”یہ لوٹا۔۔۔“

”نہیں تھینک یو۔“

وہ افسردہ سا ہو گیا تھا۔ بھوک ایک دم مر گئی تھی۔ یہ

افسردگی گھر نہ جانے کی تھی یا الوینا سے پھڑکنے کی وہ

سمجھ نہیں سکتا تھا۔

”ابھی ڈنر میں تو بہت دیر ہے۔ میں نے تمہارے

لیے اسپیشل کمرہ کر بوائے ہیں۔ تم نے صبح سے کچھ

کھایا جو نہیں تھا۔“

وہ بہت محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے



بے بسی سے ایک کباب اٹھا کر پیٹ میں رکھ لیا۔  
”تو پھر کل تقریب کے فوراً بعد میں چلا جاؤں گا“

”ٹھیک ہے۔“ الوینا مسکرائی تو اس کی نظریں الوینا کی طرف اٹھیں اور وہ مسحور سا لے دھتا رہا۔ ایک رات اور الوینا کے سنگ۔

اندر کہیں خوشی کا جلتنگ سا بجاتھا اور افسردگی کا غبار چھٹنے لگا تھا۔ کل۔۔۔ صرف ایک دن کی تو بات ہے اس نے خود کو مطمئن کر لیا تھا۔

اب وہ پوری طرح الوینا کی طرف متوجہ ہو گیا تھا اور اس کی نظریں بار بار اس کا طواف کر رہی تھیں۔

”بہت پیاری لگ رہی ہو۔“  
”نوشہ ہاتھ صاف کرتے ہوئے وہ مسلسل اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔“

”جلدی آتاؤنا۔!“  
جب وہ برتن سمیٹ رہی تھی تو اس نے کہا۔ تو الوینا نے اثبات میں سر ہلادیا اور حل گئی۔ اب وہ صرف الوینا کے متعلق سوچ رہا تھا۔

\*\*\*  
شام کے چھ بجے حسن رضا بے حد تھکے اور نڈھال سے سر جھکائے اسٹاپ پر کھڑے تھے۔ دور دور تک بس کا کوئی نشان نہ تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد پیچھے ہٹ کر بیچ پر بیٹھ گئے تھے۔ وہ صبح سات بجے گھر سے نکلے تھے لیکن دفتر نہیں گئے تھے۔ بہت دیر تک وہ ایک دوکان کے کھڑے پر بیٹھے رہے۔ انہیں لگتا تھا جیسے ان کا دل غل خالی ہو گیا ہو اور وہ کچھ بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔

انہوں نے دوبارہ کوٹ کی جیب سے وہ مڑا ترا اخبار نکال کر دیکھا اور پھر پونی واپس جیب میں رکھ لیا۔ گلی میں چل پل شروع ہوئی تو وہ اٹھ کر اسٹاپ کی طرف چل دیے تھے۔ پھر بس آئی تو وہ بس میں بیٹھ گئے۔ سر نیچے کیے پیشانی پر ہاتھ کا چھجا سہانے جیسے انہیں ڈر ہو کہ لوگ انہیں دیکھ کر پہچان لیں گے کہ یہ احمد رضا کا

باپ ہے۔ پھر پونی ان کا اسٹاپ گزر گیا اور انہیں تنہا نہ چلا۔ آخری اسٹاپ پر کئی میٹر نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”صاحب! اترنا نہیں ہے۔“  
”ہاں۔۔۔!“ انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔

”ارے آپ میاں صاحب! آپ کا دفتر تو پچھلے اسٹاپ پر تھا۔“ ہر روز آنے جانے کی وجہ سے کئی میٹر انہیں پہچانتا تھا۔

”ہاں بس وہ آج اور دوسری آتا تھا۔“ وہ تیزی سے اتر گئے۔ کچھ دیر فٹ پاتھ پر بے دھیانی سے کھڑے رہے پھر ایک رکشا روکا اور اس سے اخبار کے دفتر میں چلے گئے۔

خبر کے دفتر میں پہلے تو کسی نے ان کی بات نہ سنی۔ بڑی مشکل سے ان کی ایڈیٹر تک رسائی ہوئی۔۔۔ صحافیوں کی بڑی عزت کرتے تھے اور اپنے دل میں انہیں بڑا اعلیٰ مقام دیتے تھے۔ کیونکہ ان کے ہاتھ میں قلم تھا اور ہر قلم تھامنے والا ان کے نزدیک بہت قابل احترام تھا لیکن یہاں آکر ان کے رویے سے ان کے احساسات کو بہت تھیں پچھی تھی اس لیے جب ایڈیٹر کے سامنے آئے ان کی آنکھیں ان کے رویے سے بھی نم ہو رہی تھیں۔

”یہ کانفرنس کہاں ہوئی تھی؟“  
انہوں نے مڑا ترا اخبار کھول کر ایڈیٹر کے سامنے رکھا تو ایڈیٹر نے مشکوک نظروں سے انہیں دیکھا۔

”کیا آپ اس جھوٹے نبی کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔“  
”میں ایک کمزور ایمان رکھنے والا آدمی ہوں۔۔۔ کچھ بھی سوچنے سے پہلے میرے سامنے میری پنی اور پونی آجاتی ہے جو میرے بعد بے سہارا اکیلی رہ جائیں گی۔۔۔ وہ اور لوگ ہوتے ہیں جو بے خطر آتش نمود میں کود جاتے ہیں۔“

ان کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے جنہیں اپنے ہاتھوں کی پشت سے پونچھا۔  
”تو پھر آپ اس جگہ کا پتا کیوں معلوم کرنا چاہتے ہیں؟“ وہ اب بھی مشکوک نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”میرا بیٹا!“ انہوں نے ایک گہری سانس لی۔  
”وہ اس کے مریدوں میں شامل ہو گیا ہے۔ میں اسے ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔“ ان کی نظریں جھک گئیں۔

ان کے چہرے پر چھائی بے بسی ان کی آنکھوں میں پھیلی تھی۔ ایڈیٹر کو مزید کچھ کہنے سے روک اس نے ترجمہ پھر نظروں سے انہیں دیکھا اور کھٹی بجاکر اس صحافی کو بلایا جو اس پریس کانفرنس کی رپورٹنگ کرنے گیا تھا۔ اس نے انہیں اس بلڈنگ کا آگاہ کیا سمجھا دیا تھا۔

”آپ تو بڑے معقول آدمی لگتے ہیں۔ آپ کا بیٹا کیا اتنا نا سمجھ تھا کہ جھوٹ اور سچ میں فرق نہیں جان سکا؟“

”میرا بیٹا یو۔ ای۔ ٹی کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اس کا رشپ ہو لڈر۔“  
وہ بات کر کے رکے نہیں تھے اور تیزی سے باہر نکل گئے تھے۔ ایڈیٹر حیرت اور دکھ سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

اس بلڈنگ کے جس ہال میں کانفرنس ہوئی تھی وہ صرف ایک دن کے لیے کرائے پر لیا گیا تھا۔ یہاں اسی مقصد کے لیے تھا۔ اکثر سینارو وغیرہ کے لیے این جی اوڈیا کوئی ادارہ کرائے پر لے لیتا تھا۔ وہ دل گرفتہ سے بلڈنگ سے باہر نکل آئے تھے اور ایک بار پھر طیب خان کی رہائش گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ شاید۔۔۔

چوکیدار نے بتایا کہ طیب خان تو پشاور گیا ہوا ہے۔ پھر انہیں پہچان کر بولا۔  
”آپ وہی ہیں نا ایک بار پہلے بھی آئے تھے ایک لڑکے کے ساتھ۔“

”ہاں۔۔۔“ وہ خوشی کے باہر بنے چوتھے پر بیٹھ گئے۔  
”آپ کو کیا کام ہے طیب خان سے؟“

چوکیدار نے پوچھا تو کچھ سوچ کر انہوں نے وہی بات دہرائی جو اخبار کے دفتر میں کہی تھی۔ چوکیدار لمحہ بھر کچھ سوچتا رہا۔ پھر اوروہ دیکھ کر بولا۔ ”آپ کل

تین بجے آئے گا۔ مجھے چھٹی پر جانا ہے۔ میں آپ کو لے چلوں گا وہاں جہاں وہ غیث رتا ہے۔ بس اب جائیں۔“

وہ کچھ کہنا چاہتے تھے پوچھنا چاہتے تھے کہ وہ زبانی بتا سمجھا دے وہ ڈھونڈ لیں گے لیکن چوکیدار نے اندر جا کر گیٹ بند کر لیا تھا۔ وہاں سے وہ واپس گھر جانے کے لیے اٹھے تھے لیکن پھر تھوڑا آگے جا کر اسٹاپ پر موجود بیچ پر بیٹھ گئے تھے اور ابھی تک وہیں بیٹھے تھے۔ اس پاس موجود ایک دو پھل بیچنے والے خواجہ فروشوں نے دو تین بار انہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ سر جھکائے بیٹھے رہے تھے۔ دو جوان ان کے پاس آکر کھڑے ہو گئے تھے وہ دونوں اسماعیل خان کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ ایک بہت جذباتی ہو رہا تھا۔

”میرا دل چاہتا ہے کہ ہم بخت مجھے مل جائے تو اس جنم رسید کر دوں اپنے ہاتھوں سے۔“  
انہوں نے بڑی حسرت سے ان لڑکوں کو دیکھا۔

”کیسے خوش نصیب باپ کی اولاد ہیں۔“  
وہ اٹھ کھڑے ہوئے بس آگئی تھی۔ ان کا بی چاہا وہ اس لڑکے کی پیشانی چوم لیں۔ جواب بھی جوش و خروش سے اسے جنم رسید کرنے کی باتیں کر رہا تھا لیکن وہ اسے حسرت سے دیکھتے بس کی طرف بڑھ گئے۔ جب وہ اپنی گلی میں داخل ہوئے تو انہوں نے سمیرا کو گیٹ کھول کر گلی میں پریشانی سے نکلتے پایا۔ پھر سمیرا کی نظر ان پر پڑی اور اس کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔ وہ یکدم ہی گیٹ سے باہر نکل آئی۔

”ابو! آپ آگئے۔ بہت دیر کر دی آپ نے؟“  
”ہاں کام زیادہ تھا۔“ وہ اس کے ساتھ اندر چلے آئے۔

اگلی صبح وہ دفتر نہیں گئے تھے۔ سارا دن کمرے میں لیٹے رہے۔ زندہ نے انہیں لیٹے دیکھا لیکن کچھ پوچھا نہیں۔ سمیرا کاج چاچکی تھی۔

ایک بجے کے قریب وہ اٹھے تھے۔ زندہ کچن میں کھانا بنا رہی تھیں۔  
”زندہ۔۔۔!“ انہوں نے کچن کے دروازے کے



قرب جاکر کہا۔ زبیدہ نے آلو چھیلے ہوئے مرکز انہیں دیکھا۔

”زبیدہ! مجھے معاف کر دینا میں نے شاید تمہارے بیٹے کے ساتھ زیادتی کی۔“

”وہ صرف میرا بیٹا نہیں تھا۔“

”ہاں! ان کا سر جھکا ہوا تھا۔“

”میرا بھی تھا پھر بھی تم ماں ہو۔ مجھ سے زیادہ اس سے محبت کرتی ہوگی۔ اس لیے مجھے معاف کر دینا کہ۔“

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”شاید آپ نے اپنی طرف سے جو بہتر سمجھا وہ کیا۔“

پہلی بار زبیدہ نے اس طرح کی بات کی تھی شاید سمیرا انہیں اخبار کی خبر کے متعلق بتا چکی تھی۔ مزید کوئی بات کیے بغیر وہ چپن کے پاس سے ہٹ آئے تھے۔ کچھ دیر سخت پر بیٹھے کے بعد انہوں نے وضو کر کے نماز پڑھی جب وہ نماز پڑھ رہے تھے سمیرا بھی آگئی تھی اور سخت پر بیٹھی انہیں پیچھے پڑھتے دیکھ رہی تھی۔

”ابو! آپ دفتر نہیں گئے؟“

وہ نماز پڑھ چکے تو اس نے پوچھا۔

”ہاں اپنی ماں کا خیال رکھنا۔ میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔“

”کیا ہوا انی کو؟“ وہ گھبرا گئی۔

”کچھ نہیں۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

”لیکن۔“ پھر بات ادھوری چھوڑ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد وہ طیب خان کی کوٹھی کے باہر کھڑے تھے۔ چوکیدار نے باہر نکل کر انہیں دیکھا تھا۔

”صاحب! آپ اسٹاپ پر میرا انتظار کرو۔“

چوکیدار کے ساتھ وہ دو تیس بیل کریمیں پہنچے تھے وہاں سے بیل وہ بانس بازار کے رش میں سے گزر کر ایک تنگ گلی میں داخل ہوئے تھے۔ اس نے دور سے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”وہ اس گلی میں دو سرا مکان ہے۔“

آج کل وہ یہاں چھپا ہوا ہے۔ آپ کا بیٹا بھی ادھر ہی

ہو گا۔ آج یہاں سے انہیں کیس جانا ہے ادھر بڑی قریب ہے۔ آپ یہاں بیٹھ جاؤ۔ آپ کا بیٹا نکلا تو بات کر لیتا۔ ماں گیا تو ساتھ لے جانا۔ مکان کے اندر نہیں جاسکو گے اندر گن میں ہوں۔۔۔ خیر میں چلتا ہوں۔ کسی کو میرے متعلق مت بتانا۔ اپنے بیٹے کو بھی نہیں۔۔۔ یوں ظاہر کرنا جیسے اتفاق۔ ادھر آٹکے ہو۔ یہاں پیچھے تھوڑی سی ٹھہری جگہ۔ وہاں ان کی گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ کسی چائے وغیرہ کے ہو مل پر بیٹھ جاؤ۔ وہ ٹھیک پانچ بجے یہاں سے نکل کر جائیں گے۔۔۔ وہ جگہ بھی نزدیک ہی ہے۔“

انہوں نے چوکیدار کی ساری باتیں دھیان سے سنی تھیں اور اس کا شکریہ ادا کر کے وہ کھلی جگہ پر بے ہوئے کوڑے دان کے پیچھے زمین پر پڑے ایک پتھر بیٹھ گئے تھے۔ ان کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ جب بھی آہٹ ہوتی وہ تھوڑا سا جھانک کر دیکھ لیتے۔۔۔ اس جگہ لوگوں کی آمد و رفت کم ہی تھی۔ ایک بار ایک لڑکا کوڑا پھینٹنے آیا تھا۔ ایک بار سائیکل پر کوئی گزرا تھا اور پھر انہوں نے اسے دیکھا۔

اس کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں۔ وہ ادھر ہی آ رہا تھا۔ وہ کتنے دنوں بعد احمد رضا کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے پیچھے دو یا تین افراد اور تھے پھر ایک لڑکی تھی۔ وہ کھڑے ہو گئے تھے۔

وہ لمحہ بھر کے لیے رک کر پیچھے دیکھنے لگا تھا۔ انہوں نے اپنا سر پیچھے کر لیا تھا۔ وہ تقریباً ”کوڑا دان کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ انہوں نے اپنی جیب کو تھپتھا کر اپنے پائل کی موجودگی کو محسوس کیا اور پھر ذرا سا جھانک کر دیکھا۔ وہ اب پھر ساتھ والی لڑکی سے کچھ کہتا تھا وہاں کھڑی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بہت خوب رو لگ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ انہیں بڑا سنجیدہ لگا تھا۔ انہوں نے فوراً اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھا اور اب جب سے اپنا پائل نکال کر انہوں نے مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور اس سے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے تھے۔ صرف چند قدم



فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس نے گاڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھا تھا اور انہوں نے مضبوطی سے دانت و انتقل پر جمائے انہوں نے ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔

ایک ارب فاطمہ سے بات کر کے وہاں رکائیں تھا اور انیکسی کے ککڑی کے منقش دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے خیال آیا تھا کہ وہ تو سب کے لیے کولڈ ڈرنک لینے نکلا تھا۔

اپنے سر پر ہولے سے ہاتھ مارتا ہوا وہ پلٹا تھا۔ ارب فاطمہ ابھی تک وہیں ٹیٹ سے نیک لگائے ککڑی تھی اور اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

”اوہ مائی گاڈ! اس لڑکی کی آنکھیں ہیں یا سمندر۔“  
”آپ آخر اس طرح اور اس قدر کیوں رو رہی ہیں۔ اب تم از کم یہاں اس گھر میں کوئی خطرہ نہیں ہے اور اگر آپ واپس جانا چاہتی ہیں تو میں عمر سے کہتا ہوں۔ وہ آپ کو چھوڑ آنا ہے۔ لیکن بخدا! روکیں تو مت۔“

ارب فاطمہ نے بے حد شامی نظروں سے اسے دیکھا اور ہاتھوں کی پشت سے رخسار رگڑا لے۔  
”اگر میری کوئی بات آپ کو بری لگتی ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا ہرگز نہیں تھا۔ یقین کریں مس ارب فاطمہ! میرے لیے آپ اتنی ہی محترم اور عزیز ہیں جتنی منیبہ، مہینہ، حفصہ اور میں آپ سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی ”الریان“ کے لوگوں سے کرتا ہوں۔ میں آپ کے لیے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ ڈر گیا تھا، آپ یوں اکیلی چلی پڑیں گھر سے۔ میں کسی کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا اور ”الریان“ سے وابستہ لوگوں کی آنکھوں میں تو بالکل بھی نہیں۔ ”الریان“ سے میرے پایا کو عشق ہے اور مجھے اپنے پایا سے عشق ہے۔“

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا اور ارب فاطمہ کی آنکھوں میں پھر نئی پھیلتی چلی گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے کیا سمجھا تھا۔ وہ بھی نری احمق اور بے وقوف ہے۔ بھلا کہاں ایک فلک شاہ اور کہاں وہ۔ اس نے اپنی سی دیہ میں جانے کیا کیا سوچ ڈالا تھا۔ اسے

اپنا دل ڈھونڈتا ہوا سامحوس ہوا لیکن اس نے زبردستی اپنی آنکھوں میں اٹھ آنے والے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا اور ایک بار پھر شامی نظروں سے اسے دیکھا۔  
کیا تھا اگر وہ کچھ دن اپنی بات کی وضاحت نہ کرتا تو اس خوش فہمی میں رہتی کہ وہ انتادگش انسان۔  
”آپ اس طرح مجھے دیکھیں گی تو مجھے اپنا آپ مجرم لگنے لگے گا۔“ ایک کے لیوں پر مبسم مسکراہٹ تھی۔ اس نے فوراً ”گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں نے آپ کی تو کسی بات کا برا نہیں مانا۔ مجھے تو بس ڈر لگ رہا تھا۔“  
”کس سے مجھے ہے؟“

”نہیں بھلا آپ سے کیوں ڈر لگے گا۔“ اس نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔  
”تو پھر کس سے ڈر لگ رہا تھا آپ کو؟“ وہ جیسے فرصت سے کھڑا تھا۔  
”ماڑہ آئی ہے۔“

”لیکن میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ یہاں نہیں ہیں رحیم بارخان کی ہیں۔“  
”تو اسی لیے تو ڈر لگ رہا ہے کہ وہ وہاں۔“ اس وقت اس کے چہرے پر اتنی معصومیت تھی کہ ایک نیک لے دیکھے گیا اور وہ بات کرتے کرتے اٹک گئی۔ ایک نے فوراً ”نظریں اس کے چہرے سے ہٹائیں۔“

”وہ وہاں کیا کریں گی ایسا جو آپ کو خوف زدہ کر رہا ہے؟“ ایک نے اسے اٹتے دیکھ کر پوچھا۔

”وہ وہاں سے ہمارے گاؤں جاسکتی ہیں۔“  
”تو کیا آپ کے گاؤں میں کفر لوگا ہوا ہے۔ آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں جاسکتا۔“

”نہیں“ نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ میرے ابا اور اماں سے شکایت لگائیں گی کہ میں یہاں پڑھنے نہیں آئی بلکہ۔“ اور آنسو پٹپٹ اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔  
”میں نے موہہ آئی سے کہا بھی تھا کہ مجھے ہاشل

میں داخل کروا دیں لیکن وہ کہتی تھیں۔ ”الریان“ میں سب میرا خیال رکھیں گے۔ بہت جیتیرا ملیں گی۔“  
”تو کیا ”الریان“ میں سب آپ کا خیال نہیں رکھتے؟“ تھی۔

ایک نے سنجیدگی سے پوچھا۔  
”رکھتے ہیں۔ بہت رکھتے ہیں لیکن ماڑہ آئی۔“  
اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کیے جو بہتے ہی چلے آ رہے تھے۔

اس روز ماڑہ آئی نے کتنی بے عزتی کی تھی اس کی۔ وہ اسپتال سے گھر آئی تھی اور منیبہ کے کمرے میں کتاہیں کھولے بیٹھی تھی جب ماڑہ اندر آئی تھیں۔  
”فاطمہ۔۔۔ ان کی آنکھوں میں غصہ اور ناراضی تھی۔“

”جی!“ وہ یک دم گھبرا کر کھڑی ہو گئی تھی۔  
”بیٹھ جاؤ اور میری بات دھیان سے سنو۔ تم یہاں پڑھنے آئی ہو۔ موہہ مائی نے تمہیں یہاں بھیجا ہے تو صرف پڑھائی سے مطلب رکھو۔ کوئی اور گل نہ کھلا بیٹھنا۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے خاندان کی بے عزتی ہو ”الریان“ میں سید قسمتی سے تمہارا تعلق میرے خاندان سے ہے۔“

”لیکن میں نے تو کچھ ایسا نہیں کیا۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔

”نہیں کیا تو کر لو گی۔ یہ ہمدان سے ملنے ہاسپٹل کیوں گئی تھیں تم؟“

”ہمدان سے؟“ وہ سٹپٹا گئی تھی۔ ”نہیں تو۔ میں تو۔۔۔“

”آپ کو بتایا تھا میں نے۔“  
”مجھے کیا خرچ کہہ رہی تھیں یا جھوٹ۔“ انہوں نے کندھے اچکائے۔

”بہر حال آئندہ میں تمہیں ہمدان یا کسی لڑکے سے فری ہو کر بات کرتے نہ دیکھوں۔ اگر تم یہ جھگڑتی ہو کہ ہمدان کو پھنسا لو گی اپنی معصومیت سے تو یہ تمہاری غلطی ہے۔ ہمدان اور رانیل کی بات تقریباً طے ہے۔ پٹوں میں بات طے ہو چکی ہے۔ بچوں تک ابھی نہیں چٹا۔ اور مجھے ذرا سی بھی تمہاری شکایت ملی تو میں

تمہارے ماں باپ سے بات کروں گی کہ وہ بنا لیں تمہیں یہاں سے۔“  
”نہیں۔“ وہ خوف زدہ سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔

اور وہ اس پر خوانخوار سی نظروں والی باہر چلی گئی تھیں۔ وہ بہت ڈر گئی تھی۔ اعلا تعلیم حاصل کرنا صرف اس کا ہی نہیں اماں کا خواب بھی تھا۔ اور وہ اپنے خوابوں کی موت تو برواشت کر سکتی تھی لیکن اماں کے خواب۔

ایک بہت غور سے اس کے چہرے کے آثارِ ماؤ دیکھ رہا تھا۔ یقیناً ”ماڑہ مائی“ نے کوئی غلط بات ہی کی ہو گی۔ وہ سمجھ سکتا تھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔ ماڑہ مائی نے یوں ہی کہہ دیا ہو گا کچھ۔۔۔ ان کی عادت ہے۔ وہ بعض اوقات یوں ہی بول جاتی ہیں۔ آپ دل پر نہ لیں۔۔۔ وہ آپ کے گاؤں نہیں جائیں گی۔“ اس نے بھیجی پلکیں اٹھا کر ایک کو دیکھا۔

”آپ کو کیسے پتا کہ وہ نہیں جائیں گی۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اماں سے اور ابا سے میری شکایت لگائیں گی کہ میں۔۔۔ وہ پھر اٹک گئی تھی۔ ایک مسکرایا تھا۔

”مجھے پتا ہے کہ وہ نہیں جائیں گی آپ کے گاؤں اور اب پلینز یہ آنسو صاف کر لیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں آپ کا رونا نہیں سمجھ سکتا۔“

”جی!“ اس نے فوراً ہی دونوں ہاتھوں کی پشت سے چہرہ صاف کیا اور پھر چادر کے پلو سے رگڑ ڈالا۔

”آئیے میں آپ کو اندر چھوڑ آؤں۔“  
”نہیں۔“ اس نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ ”میں جا رہی ہوں۔“

وہ تیز تیز چلتی ہوئی انیکسی کی طرف جا رہی تھی اور اس کی سیاہ چادر کالون زمین کو چھو رہا تھا۔ بالکل ایسے ہی بالکل یونہی۔

اس کی کمانی کی ہیروئن کی طرح۔  
وہ جب اپنی کمانی کی ہیروئن کا سراپا لکھ رہا تھا تو اس



کے سامنے شاید ارب فاطمہ تھی۔

وہی ہی بھگی بھگی آنکھیں۔

اور ان غزال آنکھوں میں گھرا سہم۔

وہ وہیں گیٹ کے پاس بڑی چوکیدار کی کرسی پر بیٹھ گیا اور اسے جلتے دیکھ رہا تھا۔ انیسویں کی طرف مڑتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا تھا اور پھر فوراً ہی چہرہ موڑ لیا تھا۔

ایک کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

یہ لڑکی۔۔۔ اس لڑکی میں ایسا کیا ہے جو براہ راست دل پر ضرب لگاتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اسے روتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار رہی اس کے لبوں سے نکل گیا تھا۔

”میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں ارب فاطمہ!“

اپنے الفاظ پر وہ خود ہی حیران رہ گیا تھا اور اب اسے یونہی روتے دیکھ کر اس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن خود اس کا دل اپنی وضاحت سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ آج سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی سے ایسی بات کہتا پھر آج ہی کیوں۔ تو کیسے وہ جچ چڑچاؤ سے بھرا فاطمہ سے۔

اس نے اپنے دل کو ٹھلا۔

صرف چند ملاقاتوں میں کیا کوئی کسی سے محبت کر سکتا ہے بغیر جانے بغیر مجھے۔

”بہر حال!“ اس نے ہولے سے سر کو جھکا ”کچھ بھی ہو اس لڑکی میں مقابل کو متاثر کرنے کی ضرورت صلاحیت ہے۔“

تب ہی اس کی نظر کرنل شیردل کے گھر کی طرف سے آتے عمر احسان پر پڑی۔ اس کے ساتھ کرنل شیردل کا ملازم چائے کا سامان اٹھائے چلے آ رہا تھا۔

”ارے ایک بھائی! آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟“ عمر نے ملازم کو انیسویں کی طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود گیٹ کی طرف ایک کے پاس آیا تھا۔ ایک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”بس یونہی بیٹھ گیا تھا۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

عمر احسان کی آنکھوں میں حیرت تھی ”آپ تو کوئلہ

ڈر نکس لینے گئے تھے۔“

”اوہ ہاں، بس جا رہا تھا۔“ ایک نے گیٹ پر ہاتھ رکھا۔

”لیکن اب تو چائے بن گئی ہے۔ چلیں ادھار رہا آپ، پھر کبھی سہی۔ اس وقت تو گرم چائے کے ساتھ گرم گرم چکن رول اور پکوڑے، سموسے اور زبردست قسم کا چاکلیٹ کیک کھائیے آکر۔ آئی میرے دل نے یہ سب کچھ بنایا ہے۔ چکن رول اور سموسے فریز کر رکھے تھے اور پکوڑے ابھی ابھی تلتے ہیں اور اس وقت مزید کچھ مل رہی ہیں۔“

”اچھا؟“ ایک مسکرایا تھا۔ ”اتنی سی دیر میں اتنی سے دوستی کر لی۔“

”ہاں آئی شیردل تو بہت کیوٹ سی ہیں۔“

”آئی شیردل کی اصطلاح پر ایک کو ہنسی آئی تھی۔ وہ عمر احسان کے ساتھ باتیں کرتا جب انیسویں میں آیا تو منیبہ اور حفصہ سب کو پیش سرور رہی تھیں۔ بڑی پھرتی کے ساتھ انہوں نے سٹنگ میں موجود چھوٹی گول ڈاننگ ٹیبل پر سب ڈشز رکھوا دی تھیں اور اب ایک ایک ڈش اٹھا کر سب کو پیش کر رہی تھیں اور اس میں تو کوئی شے نہیں تھا کہ ”الریان“ کی لڑکیوں میں بلا کالیقت اور گھمڑیں تھا۔ سوائے رائیل کے۔ ایک فلک شاہ نے سوچا اور بابا جان والے بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے تھوڑا سا کھک کر اس کے لیے جگہ بنائی۔

”کوئے میں کیوں تک گئے ہو ایزی ہو کر بیٹھو بیٹا!“ بابا جان نے اپنے خوب صورت نواسے کو دیکھا تھا اور پھر فوراً ہی نظریں اس کے چہرے سے ہٹائی تھیں مبادا ان کی نظر لگ جائے۔

”میں ٹھیک ہوں بابا جان!“ منیبہ شاہ نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

”تھینک یو۔“ ایک شاہ نے پلیٹ لے لی تھی اور اب حفصہ رول اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔ اس نے ایک رول اٹھا لیا۔

”بیٹا! تم خود بھی کچھ لے لو نا۔ ٹھنڈے ہو جائیں

گے۔“

”آپ کو پتا ہے پچھو!“ عمر احسان نے سموسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

”مونی! آپ اور حفصہ! الریان کی وہ بہنیاں ہیں جو دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتی ہیں۔“ بابا جان نے محبت سے انہیں دیکھا۔

”مونی بالکل اپنے باپ پر گئی ہے۔ مرتضیٰ بھی بچپن میں ایسا ہی تھا۔ اپنے حصے کی چیزیں چھوٹے بہن بھائیوں کو کھلا کر خوش ہوا تھا۔“

”تو پھر مرتضیٰ ماموں پاکستان کیوں نہیں آتے کبھی؟“ عمارہ سے بڑی بیٹی عاشری نے بابا جان سے پوچھا۔

”ناکہ وہ پاکستان آ کر اپنے حصے کی چیزیں سب چھوٹوں میں بانٹ دیں۔“

زیر احسان کو اس کی بات پر بے تحاشا ہنسی آئی عاشری نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

”زیر بھائی! آپ کی پاس تو میسینس ہی نہیں ہے۔ میرا یہ مطلب ہر گز نہیں تھا۔“ اب کے عمر احسان کا تہمتہ بہت بلند تھا۔

”شیپور!“ اس نے زیر احسان کو انگوٹھا دکھایا تھا۔

”ہماری عاشری گڑبا تو بہت ذہین ہے۔“

”پھر آپ کا کیا مطلب تھا عاشری رانی؟“

ایک نے تھوڑا سا آگے جھک کر عاشری کے رخسار کو دو انگلیوں سے چھوا۔

”مرتضیٰ ماموں اتنے لوگ، اتنے کیرنگ ہیں تو یہاں کیوں نہیں رہتے الریان“ میں ہم سب کے ساتھ۔ بابا جان کے ساتھ۔ میں نے تو کبھی انہیں نہیں دیکھا جب سے الریان“ میں آئی ہوں دو سال سے۔“

عثمان شاہ کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

”کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں میری جان! چاہ کی زندگی کے سیٹ اپ کی وہ الریان سے دور نہیں جانا چاہتا تھا لیکن۔“

”الریان“ سے تو کبھی کسی نے دور نہیں جانا چاہا

تھا۔ اس کے بابا جان نے بھی نہیں۔“ ایک نے افسردگی سے سوچا۔

اور وہ کبھی الریان سے دور ہوئے بھی نہیں تھے۔ وہ بھول پور میں رہ کر کبھی ”الریان“ میں سانس لیتے تھے اور ان سے زیادہ کس نے ”الریان“ کو چاہا ہو گا بھلا۔

”بابا جان! عاشری کو تو مجھے دے دیں۔ میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ ہماری زارا کی شالی ہے۔ اپنی جان سے بڑھ کر چاہوں گی اسے اور مونی کا تو آپ کو پتا ہے نا، ہمیشہ بہنوں کی طرح چاہا زارا کو، بہنوں جیسا ہی مان دیا اسے۔ زارا کو اس دنیا سے گئے دو سال ہو گئے، ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب مونی زارا کو یاد نہ کیا ہو۔“

”ہاں، میرے بعد لے جانا اسے۔ اچھا ہوا تم سے ملاقات ہو گئی۔ سوچتا تھا میرے بعد کیا ہو گا اس کا۔ کون خیال رکھے گا اس کا۔ یہ بچیاں تو کل اپنے گھروں کی ہو جائیں گی اور۔۔۔ میری عاشری سات سال کی عمر میں ماں سے تو محروم ہوئی ہی۔ باپ نے بھی بھلا دیا۔“

”بابا جان! آپ نے پھر وہی باتیں شروع کر دیں۔“ عمارہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

”یہ زندگی کی حقیقت ہے بیٹا! جانا تو ہے نا سب نے اور ہم تو عمر کی اس منزل پر ہیں کہ سلمان باندھے بیٹھے ہیں۔ جانے کب گاڑی آجائے۔ بس بیٹا! جب تک زندہ ہوں، عاشری کو اپنے پاس رکھوں گا۔ اس کی صورت میں تم دونوں کی صورتیں دیکھنا ہوں۔“ ماحول میں یکدم افسردگی سی پھیل گئی تھی۔

”بس اب ایک ہی حسرت ہے کہ ایک بار مونی کو دیکھ لوں۔ اس سے مل لوں، گلے لگا لوں۔“ انہوں نے ایک کی طرف دیکھا۔

”بیٹا! اس سے کہو، آجائے یہاں تمہارے پاس۔ فون کرو اسے۔ میری بات کرو اسے۔ میں کہتا ہوں اس سے کہ ایک بار مجھ سے آکر مل جائے۔“ الریان کے دروازے اس نے خود پر بند کیے تھے، یہاں تو آسکتا ہے نا۔“

ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے۔



ایک نے ان کے لرزے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھامے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔  
”جی بابا جان! وہ تو خود آپ سے ملنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔“

اس کی نظریں بیکم اندر آتے کرئل شیردل پر پڑی تھیں اور شیردل نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پچھنے لگنے سے منع کیا تھا۔ ایک نے فوراً بات بدل کر کرئل شیردل کو مخاطب کیا۔

”ارے انکل! یہ آپ اپنے ساتھ کیا لائے ہیں۔ پورے کمرے میں مزیدار خوشبو پھیل گئی ہے۔“  
”فرائیڈ چکن ہے بھی تیساری آئی کی اپیشل ریسپی۔“ کرئل شیردل نے منیبہ کی طرف دیکھا۔  
”بیٹا! ہر نیپل سے ڈش اٹھا کر سرو کرو۔“  
”جی! منیبہ جو کھڑی تھی باہر چلی گئی۔“

ایک بابا جان کو بتانے لگا کہ آئی چکن کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کر کے تو تھیک میں پرو کر جانے کون سے مسالے لگا کر فرائی کرتی ہیں کہ بس آپ چکھ کر دیکھیں۔“

”اچھا دیکھتے ہیں۔“ بابا جان مسکرا رہے تھے۔ ایک موضوع بدلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بابا جان ابھی ایک انیک سے سنبھلے تھے اور کرئل شیردل کو ڈر تھا کہ وہ فلک کے متعلق جان کر کہیں ڈسٹرب نہ ہو جائیں اور کچھ مسئلہ نہ ہو جائے تب ہی انہوں نے ایک کو تاکید کی تھی کہ بابا جان ذرا ریٹیکس ہو جائیں تو آرام سے انہیں بتا دینا اور پھر میں یا تم جا کر اسے لے آئیں گے۔

”اریب باجی! آپ دیکھ بھی نہیں لے رہے۔ کم از کم یہ چکن تو لے لیں نا جس کی ایک بھائی نے اتنی تعریف کی ہے۔“

عمر احسان کی آواز پر چونک کر ایک نے ادھر دیکھا۔ اریب فاطمہ عمر کے قریب ہی ایک موڑے پر بیٹھی تھی۔ جانے یہ موڑا کب یہاں آیا تھا۔ شاید انکل شیردل نے بھجوا دیا ہوگا۔

اریب فاطمہ نے ایک اسٹک اٹھالی تھی۔ اس کی

آنکھوں کے نیچے رخساروں پر سرخی تھی۔ غالباً رگڑنے سے اور رونے سے۔ اس کے گندم رنگ رخساروں پر یہ ہلکی سرخی بہت بھلی لگ رہی تھی اور اس پر قدرے سوچی ہوئی آنکھیں اور بھی غضب ڈھا رہی تھیں۔ عمر نے نہ جانے اس سے کیا کہا تھا کہ وہ مسکرا رہی تھی۔ نگاہیں جھکا کر ہولے ہولے مسکرا رہی تھی اور اس کی لمبی گھٹی چلکوں کا سایہ اس کے رخساروں پر لرز رہا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے گیا۔

اس کی اس خویت کو سب سے پہلے منیبہ شاہ نے ہی محسوس کیا تھا جو حفصہ کی مدد سے سب کو چائے تقسیم کر رہی تھی۔ ایک کو چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے وہ ہولے سے کھنکھہاری تھی۔

”ایک بھائی! چائے۔“  
”اوہ ہاں! ایک نے چونک کر ہاتھ میں پکڑی پلیٹ حفصہ کی رے میں رکھ دی اور چائے کا کپ منیبہ سے لیتے ہوئے مسکرایا منیبہ نے جان بوجھ کر شرارت سے مڑ کر اریب فاطمہ کی طرف دیکھا اور کہا۔  
”فاطمہ! تم آج بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ بہت پیاری۔“

ایک اور ہمدان نے ایک ساتھ اس کی طرف دیکھا تو وہ گھبرا گئی۔  
”مونی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ اریب آپلی تو ہمیشہ سے ہی خوب صورت ہیں۔ صرف آج ہی تو پیاری نہیں لگ رہی ہیں۔“  
عمر کو اریب فاطمہ بہت خوب صورت لگتی تھی۔ معصوم پاکیزہ اور شفاف سی۔

عمارہ نے دلچسپی سے اریب فاطمہ کو دیکھا جو خود موضوع بنائے جانے پر گھبرا سی گئی تھی اور اس کی چلکیں لرز رہی تھیں۔

”اگر رائیل آپلی ادھر ہوتیں نا تو آپ سے ناراض ہو جاتیں عمر بھائی!“

عاشی ابھی تک عمارہ سے جڑی بیٹھی تھی۔ عمار نے ایک بازو اس کے گرد جمائل کر رکھا تھا۔  
”ہاں یہ تو ہے۔“ عمر نے سر ہلایا۔

”اور کیا پتا مارتیں بھی۔“ اس نے مزے سے کیک کھاتے ہوئے آنکھیں جھپکائیں۔  
”وہ کیوں بھلا گڑیا؟“ ایک نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے عاشی کی طرف دیکھا۔

”وہ نہیں پسند کرتیں نا! ان کے علاوہ کسی اور کی تعریف ہو اور وہ تو مجھے بھی پسند نہیں کرتیں۔“  
”کیوں؟“ آپ کو پسند کیوں نہیں کرتیں؟“

ایک کو اس کی باتیں بہت دلچسپ لگ رہی تھیں۔

”میں ان سے زیادہ خوب صورت جو ہوں۔ ہوں نا؟“  
اس نے ایک سے تائید چاہی۔

”ہاں بالکل ہو۔“ صرف ایک کے ہی نہیں سب کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑا تھی۔

”ہماری شہزادی کا تو کوئی مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔“  
ایک نے جواباً کہا تو اس نے اریب کی طرف دیکھا۔

”اریب فاطمہ بھی نہیں؟“  
”نہیں۔“ ایک کھل کر ہنسنا۔

”لیکن اریب آپلی رانی باجی سے زیادہ خوب صورت ہیں۔ وہ ذرا زیادہ گوری ہیں، لیکن اریب آپلی زیادہ کیوت ہیں۔ سب کو اچھی لگتی ہیں۔ اس لیے تو مارہ آئی ان سے جلتی ہیں۔ اور ان سے لڑائی بھی کرتی ہیں۔ اس روز ان سے کہہ رہی تھیں کہ میں ہمیں رائیل کے حق پر ڈاکا نہیں ڈالنے دوں گی۔ اب اس میں اریب آپلی کا کیا قصور کہ سب انہیں خوب صورت کہتے ہیں۔ رانی باجی سے بھی زیادہ۔“

وہ مزے سے اور گردے بے نیاز کے جاری تھی جب کہ کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی تھی اور اریب نے جو ایک کی ہنسی میں کھوئی ہوئی ابھی تک سوچ رہی تھی کہ اس شخص پر ہنسی واقعی سوٹ کرتی ہے۔ ایک دم چونک کر عاشی اور پھر سب کی طرف دیکھا۔

عاشی اب مزید کیا کہنے والی تھی وہ یک دم خوف زدہ ہو گئی اور ہاتھ میں چوک پکڑا کر وہ فوراً اٹھ کر تیزی سے باہر چلی گئی لیکن عاشی نے مزید کچھ نہیں کہا

تھا اور اپنی انگلیوں پر لگی کیم اور چاکلیٹ چاٹ رہی تھی۔ تب ایک نے اختیاری اٹھ کر اس کے پیچھے باہر گیا تو ہمدان اور منیبہ کے لبوں پر ایک ساتھ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی لیکن دونوں نے سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی جبکہ بابا جان بہت دل گرفتہ سے عثمان شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”عثمان! یہ مانہ بیٹی کو اس بجی سے کیا دشمنی ہے۔ میں نے کئی بار محسوس کیا ہے۔ اس کا رویہ اس بچی سے صحیح نہیں ہے۔ مرود نے ہماری ذمہ داری پر اسے یہاں چھوڑا ہے۔ وہ اسے اپنی بیٹی ہی سمجھتی ہے۔

بیٹیوں کی طرح ہی پیار کرتی ہے وہ اس سے۔“  
”اگر مرود کی بیٹی کا نامہ بھالی! الریان“ میں رہنا پسند نہیں کرتیں تو پھر ہمارے بچوں کی الریان“ میں موجودگی بھی انہیں کھلتی ہوگی۔“

عثمان شاہ کے لہجے میں جانے ایسا کیا تھا کہ منیبہ ایک دم بولی تھی۔

”نہیں نہیں چچا جان! مانہ چچی تو ہم سب سے بہت پیار کرتی ہیں۔“

”گڈ فادر! اے عمر زب لب کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔“  
”اریب فاطمہ غمیز ہیں! اجبی ہیں! اس لیے مانہ چچی کو ان کا الریان“ میں رہنا پسند نہیں ہے۔“ منیبہ وضاحت کر رہی تھی۔

”ایک بچی کا کیا بوجھ۔ کتنا کھا جاتی ہے وہ۔ جہاں اتنے نوکر جا کر کھاتے بٹتے ہیں وہاں اگر مرود کی منہ بولی بیٹی کھا رہی ہے تو مانہ تو کیا تکلیف ہے۔ ابھی تو ہم زندہ ہیں۔“ بابا جان ابھی تک افسوس میں تھے۔

”ایسا نہیں ہے بابا جان! آپ کو بتاؤ ہے مانہ بھالی کا مزاج ایسا ہی ہے۔“ عمارہ نے ہولے سے ان کا بازو تھپتھا کر تسلی دی۔

”آپ خواہنا دل پر ملتیں۔“  
”وہ تو یہ بھی کہتی ہیں رمت بوا مفت کی روٹیاں کھاتی ہیں۔ نہ کام کی نہ کلج کی۔ ان کی اب الریان“ میں کیا ضرورت ہے۔“

عاشی نے نشو سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا تو عثمان شاہ نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔



”عاشی گل! آپ خواہ کی فضول باتیں مت کیا کریں۔“ عاشی سہم کر عمارہ سے لپٹ گئی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ عمر احسان نے دروازے پر ہاتھ رکھے رکھے مڑ کر عاشی اور عثمان چچا کی طرف دیکھا اور پھر باہر کا دروازہ کھول کر لان میں قدم رکھا لیکن ایک کواریب فاطمہ کے پاس کھڑے دیکھ کر مسکرایا۔

”ایک بھائی! اریب آپ آئی کو جانے مت دیجیے گا۔“ انہی شیردل زبردست قسم کا ڈنڈا تیار کر رہی تھی۔ ایک نے مڑ کر اسے دیکھا تو وہ ہاتھ ہلاتا ہوا واپس انٹیکسی میں چلا گیا۔

”اریب فاطمہ رکیں پلیز کہاں جا رہی ہیں آپ؟“

اریب فاطمہ کو دوبارہ گیٹ کی طرف جاتے دیکھ کر ایک کے لبوں سے نکلا تو اریب فاطمہ نے مڑ کر اسے دیکھا اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے بھگا ہوا تھا۔

”میں آپ سے پوچھ رہا تھا آپ اس طرح کیوں چلی آئی ہیں اور آپ روکیوں رہی ہیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔“ عاشی نے تڑپا کچھ نہیں کہا۔

”عاشی نے۔“ اس کے لب کپکپائے۔ ”ہاں عاشی نے کچھ نہیں کہا مجھے لیکن اگر اس نے سب کو وہ ساری باتیں بتا دیں جو مجھے ماںہ ماہی نے کہی تھیں تو سب کیا سوچیں گے۔ مجھے نہیں پتا تھا جب وہ مجھے ڈانٹ رہی تھیں تو عاشی کُن رہی تھی۔“

”عاشی نے اور کچھ نہیں کہا۔“ ایک کے لہجے میں نرمی تھی۔ ”میرا خیال ہے اس نے زیادہ کچھ نہیں سنا ہو گا اور اگر آپ صحیح ہیں تو آپ کو لوگوں سے نہیں ڈرنا چاہیے اریب فاطمہ!“

”جیس۔“ اس نے چادر کے پلو سے اپنا بھیا چہرہ اچھی طرح صاف کیا۔ ”ہمیں لوگوں سے ڈرنا چاہیے۔ میری اماں کہتی ہیں کہ لوگوں کا ڈر اور خوف اچھی چیز ہوتا ہے۔ خاص کر لڑکیوں کے لیے۔ احتساب کا کام کرتا ہے۔ بہت بڑا محتسب ہوتا ہے لوگوں کا ڈر

”بھی۔“

”مجھے کبھی اپنی ماں سے ملوایئے گا اریب فاطمہ! اور کوئی فلسفی یا اریب ہیں؟“

”نہیں۔“ اریب فاطمہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”نہ فلسفی ہیں نہ اریب لیکن زمانے نے جو کچھ انہیں سکھایا ہے، آپ اریب ہو کر بھی نہ سیکھ پائے ہوں گے۔“

ایک کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے حیرت کی نق ابھری اور پھر معدوم ہو گئی۔

”آپ اچھا بوٹی ہیں اریب فاطمہ! ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا، آپ صرف روٹی اور ڈرنی ہیں۔“

”ہاں مجھے ڈر لگتا ہے زمانے سے لوگوں سے۔“ اریب فاطمہ! جب آپ کی کوئی غلطی نہیں ہے

آپ بالکل صحیح ہیں تو پھر کس لیے ڈرتا؟“

”لیکن لوگ تو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھتے اور سنتے ہیں۔ کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ جھوٹ اور سچی حقیقت کرنا پھرے۔“

”لیکن سچ کبھی زیادہ دیر تک چھپا نہیں رہ سکتا۔ حقیقت ایک دن ظاہر ہو جاتی ہے۔“

”ہاں ایک دن حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔“ وہ ہتا نہیں کیوں یکدم تن ہو گئی تھی، ایک حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”لیکن بعض اوقات حقیقت ظاہر ہونے تک سب کچھ حتم ہو چکا ہوتا ہے۔ آپ کسی پر جھوٹا الزام

لگا دیں۔ ایک دنیا اس الزام کو سچ مان لے اور جب آپ سچ ظاہر ہو تو آپ کس کس کے پاس جا کر کوئی دین

مجھے کہہ کہ وہ جھوٹ تھا۔ کون آپ کی بات کا یقین کرے گا اور اگر کر بھی لیا تو ایک زندگی جو اس جھوٹ کی وجہ سے

زندہ درگور ہو گئی۔ آپ اس میں زندگی واپس لاسکیں گے؟ جو کھو گیا، جو نقصان ہو گیا وہ پورا کر سکیں گے

نہیں کبھی نہیں۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں شاید، لیکن کیا آپ بتانا پند کریں گی کہ ماںہ ماہی نے ایسا کیا کہہ دیا ہے جو آپ اپنی ڈری ہوئی اور خوف زدہ ہیں۔ مجھ پر اعتبار کریں۔ مجھے



بتائیں شاید میں کچھ مدد کر سکوں۔  
 ”ہاں کوئی تو ہو کسی کو تو پتا ہو کہ ماہ ماہی نے کتنی  
 گھٹیا بات کی ہے۔“ ارب فاطمہ نے سوچا اور ایک  
 کی طرف دیکھے بغیر آہستہ سے بولی۔  
 ”وہ کہہ رہی تھیں میں ہمدان بھائی کو۔ یقین  
 کریں۔ میں نے بھی ہمدان بھائی کے متعلق ایسا سوچا  
 بھی نہیں۔“  
 ”اور ایسا سوچنا بھی نہیں ارب فاطمہ!“ بے اختیار  
 ہی ایک کے یوں سے نکلا تھا۔  
 ”کیا کہا آپ نے؟“ ارب فاطمہ چونک کر اسے  
 دیکھنے لگی۔  
 ”کچھ نہیں ارب فاطمہ! میں کہہ رہا تھا آپ ماہ  
 ماہی کی باتوں کی پروا مت کیا کریں۔ وہ تو جو منہ میں آتا  
 ہے بولتی چلی جاتی ہیں۔ آپ پلیز اندر چلیں نا۔ بابا  
 جان آپ کے اس طرح اٹھ آنے سے پریشان ہو گئے  
 تھے۔“  
 تب ہی اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ عمر احسان ادھر  
 ہی آ رہا تھا۔  
 ”ایک بھائی! آپ ابھی تک آپ یہیں کھڑے  
 ہیں۔ میں سمجھا آپ فاطمہ آپنی کو گھر چھوڑنے چلے  
 گئے ہیں۔“  
 ”میں تو ارب فاطمہ سے بات کر رہا تھا کہ عاشی تو  
 بچی ہے ایسے ہی بے سوچے سمجھے بول جاتی ہے۔“  
 ”تو اور کیا۔ میری ماما آپ سے بالکل بھی جھلس  
 نہیں ہوتی ہیں۔ آئیں چلیں اندر۔ بابا جان آپ کے  
 لیے پریشان ہو رہے ہیں۔“  
 ایک نے آہستہ سے اسے جانے کے لیے کہا۔  
 ”آپ کہیں جا رہے ہیں ایک بھائی؟“ عمر نے  
 پوچھا۔  
 ”ماما کی دوائیاں لینی تھیں اسٹور سے اور دس پندرہ  
 منٹ کا ایک اور کام ہے۔“  
 وہ بات کر کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا اور عمر ارب  
 فاطمہ کے ساتھ واپس انیس کی طرف جانے لگا۔

اس نے نیپل پر اپنا سامان رکھتے ہوئے کچھ دیر کے  
 لیے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔ آج کا سارا دن  
 بے حد مصروف گزارا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی سب لوگ  
 انکل شیردل کے گھر سے ڈنر کر کے نکلے تھے۔ بقول عمر  
 احسان کے، آئی شیردل نے زبردست ڈنر تیار کیا تھا۔  
 انکل مصطفیٰ اور شائمی بھی ڈنر تک آ گئے تھے۔  
 ”آئی! یہ اتنا سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت  
 تھی۔“ ہمدان نے کہا تو منیبہ نے اس کی بات ایک  
 لی۔  
 ”ہاں کچھ اگلے دنوں کے لیے رکھ لیتیں کیونکہ ہم  
 کو تو اب روزہ ہی آتا ہے جب تک عمارہ پچھو اور بابا  
 جان یہاں ہیں۔“  
 مسز شیردل بہت خوش تھیں۔ ”مجھے آپ سب  
 لوگوں کا آنا بہت اچھا لگا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے ہماری  
 بے رنگ زندگی میں رنگ سا آ گیا ہے۔ آپ لوگ روز  
 آئیں۔ ڈنر ہر روز ہماری طرف۔“  
 وہ سب ہی کرٹل شیردل اور ان کی ٹیم کے خلوص و  
 محبت سے بہت متاثر ہوئے تھے۔  
 منیبہ کو بار بار افسوس ہو رہا تھا کہ وہ لوگ پہلے  
 کرٹل شیردل کی ٹیم سے کیوں نہیں ملے۔  
 یونہی ہنستے مسکراتے ماحول میں کھانا کھایا گیا اور  
 ایک فلک شاہ کو بھی آج کا کھانا ہر روز کے کھانے سے  
 کہیں زیادہ اچھا لگا تھا۔ آج اس نے اپنے ہوش میں  
 پہلی بار ماما کو اس طرح کھل کر ہنستے دیکھا تھا۔  
 کاش بابا بھی اس ماحول کا حصہ ہوتے۔ کتنے اواس  
 اور کتنے اکیلے ہوں گے وہ وہاں۔ ایک فلک شاہ کے  
 خیال سے اواس ہو گیا تو اس نے سر جھٹک کر خود کو  
 یقین دلایا۔  
 ”ایک روز بابا بھی ضرور بابا جان سے ملیں گے  
 ان شاء اللہ۔“  
 وہ سیدھا ہو کر بیٹھا اور نیپل پر پڑا کلب بورڈ اٹھا  
 لیا۔  
 سب لوگ ڈنر کے بعد چلے گئے تھے۔ بابا جان دوا  
 کھا کر سو گئے تھے اور کرٹل شیردل نے اس کے لیے

نیپس بھجوا دیا تھا جو اس نے سنگ میں بچھالیا تھا۔ ماما  
 بھی تھک گئی تھیں اس لیے وہ انیس سوئے کی تلقین  
 کرتا ہوا سنگ میں آ گیا تھا لیکن خود اسے نیند نہیں آ  
 رہی تھی سو اس نے کچھ لکھنے کا سوچا تھا۔  
 ”کیا ہی اچھا ہو یہ کہانی جلد مکمل ہو جائے تو۔ وہ  
 ڈی وی کے لیے بھی ڈرما لکھ سکے۔ جس پر بہت پہلے  
 قلم لیا۔ کیا چاہتا تھا اور اس کاغذ بھی تیار کر لیا تھا۔ پتا  
 نہیں کیوں اسے لگتا تھا کہ یہ کہانی اس کی شاہکار  
 کہانیوں میں سے ہوگی۔ اس لیے پہلے وہ یہ کہانی لکھنا  
 چاہتا تھا اور پھر ڈرامے پر کام کرنا چاہتا تھا۔ اس نے  
 کلب بورڈ اٹھا لیا اور ڈائمنگ نیپل پر آکر بیٹھ گیا۔ کلب  
 بورڈ کے اوپر لگے ہوئے کانڈنوں پر نظروں ڈالی اور قلم  
 اٹھایا اور لکھا۔  
 ”اس نے ایک ناراض سی نظر مجھ پر ڈالی اور میری  
 منیبہوں سے اپنی اوڑھنی کا پلو چھڑانے کی کوشش کی۔“  
 ”نہیں پلیز حور عین! اس طرح خفا ہو کر مت جاؤ۔  
 یہاں آؤ بیٹھو اور مجھے بتاؤ اپنے متعلق۔“  
 اچھا اپنے متعلق کچھ بھی مت کو زمین کے متعلق  
 بتاؤ۔ میں بہت دھیان سے تمہاری بات سنوں گا۔  
 اور بالکل بھی نہیں بولوں گا لیکن بس تم میرے پاس  
 بیٹھی رہو یہاں۔ بولتی رہو اور میں تمہیں سنتا  
 رہوں۔“  
 وہ اب بھی شیا کی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور  
 اس کی اوڑھنی کا پلو اب بھی میری منیبہ میں تھا۔  
 ”زمین کے سینے پر اتنے زخم لگے ہیں کہ اگر میں  
 تمہیں ایک ایک زخم دکھاؤں تو کتنی صدیاں بیت  
 جائیں۔“  
 ”یہ زمین بھی تو صدیوں پرانی ہے حور عین!“  
 ”ہاں صدیوں پرانی۔“ ایک آہ کے ساتھ وہ وہیں  
 بیٹھ گئی تھی اور دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے  
 میری طرف دیکھا تھا۔  
 ”اچھا میرا پلو تو چھوڑو۔“  
 ”جی چاہتا ہے اب تمہارا پلو پکڑا ہے تو زندگی کی  
 آخری سانس تک پکڑے رکھوں۔“

”یہ تم شاعر ارب بھی بس باتوں میں ماہر ہوتے  
 ہو۔“ مسکراہٹ اس کے لبوں پر اس طرح طلوع ہوئی  
 تھی جیسے افق کے کنارے سے سورج کی پہلی کرن  
 چھانکے اس کی پلکیں جھٹک گئی تھیں، لابی منیبہ  
 پلکیں لرز رہی تھیں اور ان کا سایہ اس کے رخساروں  
 پر اس طرح پڑ رہا تھا جیسے۔  
 ”جیسے ارب فاطمہ کے رخساروں پر۔“ وہ چونکا۔  
 ”ارب فاطمہ!“ اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار  
 ہوئی۔  
 ”یہ لڑکی ایسی ہے کہ اسے چاہا جائے۔ معصوم  
 شفاف اور۔۔۔ مجھے لگتا ہے کسی روز میں اس لڑکی کی  
 محبت میں بہت شدت سے مبتلا ہو جاؤں گا۔“  
 ”تو کیا اب بھی تم اس لڑکی سے محبت نہیں کرتے  
 ہو۔“ دل نے ہولے سے سرگوشی کی تھی۔  
 ”شاید۔۔۔“  
 ”شاید نہیں سچ سچ تم اس سے محبت کرتے ہو ایک  
 فلک شاہ!“ اس روز سے جب تم نے پہلی بار اسے  
 ”الریان“ میں منیبہ کے پیچھے پیچھے دیکھا تھا اور وہ  
 منیبہ کے کندھے کی اوٹ سے چپکے چپکے تھیں دیکھتی  
 تھی اور اس کی آنکھوں میں جگنو سے چپکتے تھے اور  
 پلکیں جھٹک جاتی تھیں۔  
 ”شاید۔۔۔“ وہ مسکرایا ”شاید اسی روز اس نے میرے  
 دل میں کہیں کسی کو نے میں جگہ بنالی ہو۔“  
 ہولے سے سر جھٹک کر اس نے پھر قلم اٹھالیا تھا۔  
 ”تو میں کیا لکھ رہا تھا؟“  
 اس نے ایک نظر اپنے لکھے پر ڈالی اور پھر تیزی سے  
 اس کا قلم چلنے لگا۔  
 ”اور زمین کے آنسو تو کبھی خشک ہی نہیں ہوئے۔  
 ایک کے بعد ایک زخم ایک نیا چرکا، ایک نیا دکھ اور  
 زمین تو شاید پیدا ہی رونے کے لیے ہوئی تھی۔  
 کبھی حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے لیے۔  
 اس کا دور آنسوؤں کا تو انبی ساتھ ہے۔ تم تو شاعر ہو،  
 ارب ہو، مصنف ہو۔ تم نے تو تاریخ کے اوراق  
 کھول کر دیکھے ہوں گے۔ تمہیں تو ان موتیوں کی



قیمت کا اندازہ ہو گا جو اس بد نصیب کی آنکھوں سے  
ہمیشہ بہتے رہے۔  
”تم زمین کے لیے اتنی دیکھی کیوں ہوتی ہو۔“ میں  
اس کی آنکھوں کے کٹوروں کو پانیوں سے بھرنا دیکھ رہا  
تھا۔

”اس لیے کہ میرا اور زمین کا ازلی رشتہ ہے۔  
ہمارے دکھ بھی ساتھ ہیں اور خوشیاں بھی۔“

میں بھی تو زمین کی طرح صدیوں سے رو رہی  
ہوں، جب میری کوکھ اجاڑی گئی۔ جب وہ ہاتھوں نے  
مجھے زندہ گڑھے میں ڈال کر اوپر مٹی ڈالی تو میری ننھی  
چپٹیں صرف زمین سنتی تھیں اور اپنے ماتا بھرے  
ہاتھوں سے مجھے شکستیں مٹی لیکن تم دیوانے شاعر تم کیا  
جانو زمین کے دکھ۔“

آنکھوں کے کٹورے چمک بڑے تھے۔  
”تمہیں تو لب و رخسار گئے قہے کہنے سے ہی  
فرصت نہیں ملتی۔ تم تو بس محبت کی جھوٹی کمائیاں  
لکھو۔ حالانکہ تم تو خود محبت کے میم کے بھی معنی  
نہیں سمجھتے، پوری پوری محبت کا دور اک کیسے کرو گے؟“

اس نے نظریں جھکا لیں۔ میں اس کے چہرے کی  
طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کر پاتا تھا جو بھیٹکا جا رہا تھا۔  
وہ جب جب زمین پر لگنے والے زخموں کا ذکر کرتی  
تھی اس کا لورا وہ جیسے کسی اذیت سے ترپتا تھا۔

”سنو! مجھے اب جانے دو اور تم اپنے خیالی محبوب  
کے تصور سے اپنی برہم سجاؤ اور اس کے لب و رخسار کی  
کمائیاں لکھو۔“

وہ اٹھنے لگی تھی۔ لیکن میں نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر  
بٹھالیا۔ میری اس جسارت پر وہ جڑبڑھائی لیکن اپنا ہاتھ  
چھڑا کر بیٹھ گئی۔

”نک۔۔۔ نک!“ ایک نے چونک کر قلم رکھ دیا  
اور سامنے دیکھا کلاک نے دو بجائے تھے۔ اس نے  
لکھے ہوئے آخری صفحے کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اسے  
بچے رکھا۔ دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ سے ہلکا سا دبا دیا اور  
پھر قلم اٹھایا۔

آج اس نے کافی لکھ لیا تھا اور لکھتے ہوئے اس کا  
قلم ایک بار بھی نہیں رکھا تھا۔ ایک اطمینان بھرنا سا  
لپٹے ہوئے اس نے لکھے ہوئے کاغذوں پر ایک نظر ڈالی  
اور مزید لکھنے کا ارادہ ترک کر کے کاغذوں کو ترتیب  
سے رکھتے ہوئے اس نے ایک سرسری نظر ان پر  
ڈالی۔

اور یوں ہی ایک صفحہ پڑھنے لگا۔  
”اور اس روز جب کنے کی گلیوں میں گزرتے  
ہوئے بوڑھی عورت نے کوڑا پھینکا تھا اور جس روز  
طائف والوں نے پتھر سائے تھے تو کیسے کیسے زمین کا  
جی چاہا تھا کہ وہ دھس جائے مارے شرمندگی کے اور  
بھی ظاہر نہ ہو۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم  
بلخ میں ہاتھ اٹھائے اہل طائف کے لیے دعا میں  
کرتے تھے کہ یا اللہ! انہیں بصیرت عطا کر کہ سمجھ جائیں  
تو زمین ان کی نارتار اور دھنی اور زخمی پاؤں دیکھ کر خوب  
ترپ کر روتی تھی، کمر لاتی تھی اور ان پائیز مقدس  
قدموں پر شمار ہوتی تھی۔ اور جب شعب ابی طالب  
میں وہ صبر درختوں کے پتے کھاتے تھے اللہ سے صبر  
شکر کی دعا کرتے تھے تو زمین کابں نہیں چلتا تھا کہ وہ  
اپنا سینہ چیر کر ان کے لیے پھلوں اور اناج کے ڈھیر لگا  
دے۔ بس وہ آنسو بہاتی تھی اور روتی تھی۔ مریم کی  
طرح۔“

”یہ مریم کا ذکر زمین کے ذکر میں کہاں سے آگیا؟“  
میں نے حیرت سے پوچھا۔  
”مریم کے ذکر کو زمین کے ذکر سے الگ تو نہیں کیا  
جاسکتا نا لیکن تم کیا سمجھو گے خوابوں اور خیالوں میں  
رہنے والے اور زمین کی ملکیت پر فخر کرنے والے تم  
زمین کو اپنی ملکیت کیوں سمجھتے ہو۔“

”اسے چھوڑو تم ہتاؤ مریم کون ہے۔“ مجھے جتنس  
ہو رہا تھا۔

”مریم!“ اس نے اپنے لبوں پر زبان پھیری تھی۔  
”مریم نے صدیوں پہلے جنم لیا تھا۔“  
یوں سمجھ لو اس زمین کے ساتھ ہی اس کا جنم ہوا  
تھا اور زمین پر پہلا قلم بھی اسی کی وجہ سے ہوا چاہے

تم اسے کوئی نام کوئی روپ دے دو۔  
کبھی وہ نام ہوتی ہے۔  
زندہ دفن کر دی جاتی ہے۔  
کبھی وہ شوہر کی چار چل جانے والی ہوتی ہے۔  
کبھی اس کے گلے میں بائق ڈال دیا جاتا ہے۔  
کبھی وہ کینز ہوتی ہے بادشاہوں کا دل بہلانے والی  
اور کبھی بازار میں بیٹھ کر گانے والی۔  
چھوڑنے والی۔  
کبھی وہ اور کبھی سوارہ بنتے والی۔

لیکن یہ جس مریم کا میں نے ذکر کیا ہے نایہ چک  
فیروز شاہ کے چودھری غلام فرید کی بیوی تھی۔ جس کی  
پانچ بیٹیاں تھیں اور جو روٹی بھی زمین کی طرح اللہ  
سے صبر و شکر کی دعا کرتی تھی۔ ”ایک کے لبوں پر  
مدھمی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔  
”لکھتا ہے میں کچھ ایسا لکھنے میں کامیاب ہو رہا ہوں  
جو شاہکار کہلایا جاسکے۔“ اس نے تمام کاغذ ترتیب  
سے فائل میں رکھے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اڑھائی بج رہے  
تھے۔ وہ میٹرس پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے سوئے  
کی کوشش کرنے لگا۔  
”لے سکتا تے ویلا تر۔“

Le songlot de la terra  
”زمین کی سکلیں“  
”آپاؤن لیکول بد قسمت۔۔۔“  
وہ ہولے سے ہنسا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔  
نیند دور دور تک آنکھوں میں نہیں تھی۔ اس نے سوچا  
کہ ایک بار پھر اٹھ کر لکھنا شروع کر دے لیکن اب  
لکھنے کا مزمون نہیں رہا تھا۔

پتا نہیں ٹل لافورگ (Zhil Laforg) کی  
”زمین کی سکلیں“ شاہکار قرار دی گئی تھی یا نہیں  
لیکن ایک فلک شاہ کی ”زمین کے آنسو“ کو ایک  
شاہکار ہونا چاہیے۔ ایسی کتاب جو اس کی پچھلی تمام  
کتابوں کو پیچھے چھوڑ دے۔ میں صبح اس سارے لکھے  
گئے کو دوبارہ پڑھوں گا اور اسے پھر سے لکھوں گا۔

اسے دوبارہ لکھنے کی عادت نہ تھی۔ وہ ایک باری  
لکھتا تھا بعض اوقات تو وہ اپنے لکھے ہوئے کو دوبارہ  
پڑھتا بھی نہیں تھا، لیکن اس بار وہ غلطی کی گنجائش  
نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

جب کوئی تحریر چھپ کر آتی تھی کئی بار تو اسے دیکھ  
کر اسے احساس ہوتا تھا کہ اسے لکھنے کے بعد اسے  
ایک دفعہ پڑھ لینا چاہیے تھا اور اگر وہ پڑھ لیتا تو اس  
موضوع پر زیادہ ہنر لکھ پاتا لیکن وہ ہمیشہ ہی وقت کی کمی  
کا شکار رہتا تھا۔ لیکن اس بار وہ جب تک مطمئن  
نہیں ہو گا اس تحریر کو چھپنے کے لیے نہیں دے گا۔

اسے اپنی فرانسیسی زبان پڑھانے والی پتھر پاؤن لیکول کا  
خیال آیا۔ پتا نہیں وہ اب بھی وہاں اس انٹینیٹیوٹ میں  
ہوتی ہوگی یا اپنے وطن چلی گئی ہوگی۔ ان دنوں جیسے  
دوسری زبانیں سیکھنے کا فیشن چل نکلا تھا اور اس کے  
کتنے ہی کلاس فیلو لڑکے اور لڑکیاں جرمن اور فرنیچ  
سیکھ رہے تھے سو وہ بھی فرنیچ سیکھنے لگا تھا۔

پاؤن لیکول۔۔۔ وہ شہرے پاؤں اور بھوری  
آنکھوں والی اس کی نیچر۔۔۔ وہ صبح ضرور جا کر کرپتا  
کرے گا۔ کیا پتا وہ اب بھی وہیں۔۔۔ وہ اور پھر وہ اس  
سے ڈل کے متعلق کچھ اور جاننے کی کوشش کرے  
گا۔ وہ اس کی نظریں پڑھ کر دیکھے گا اور پاؤن کی مدد  
سے سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ اسے اپنا شاہکار تخلیق  
کرنے کے لیے کچھ محنت کرنا چاہیے۔

اس نے کرپٹ بدلتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور  
پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔



”بیا۔۔۔ بیا! وہ آرہے ہیں۔“ پہنچ گئے ہیں ایرپورٹ  
پہ۔۔۔

انجی بہت ایکسائٹڈ ہو رہی تھی۔ ”ابھی جو اد کا فون  
آیا ہے۔“

فلک شاہ کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ انہوں  
نے انجی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں بے حد سُرخ  
ہو رہی تھیں۔



وہ 1979ء تھا جب ایک رات انہیں گرفتار کر لیا گیا تھا ملک میں فتنہ و شورش پھیلنے کے الزام میں۔ کوٹ لکھنوت جیل اور پھر شانی قلعے میں ان پر جو بھی گزری تھی وہ اذیت کی ایک داستان تھی لیکن وہاں

”ہم نے بھی غلطیاں کی۔ ہم بھی قصور وار ہیں۔ ہم نے دو سروں کے کانوں سے سنا اور دو سروں کی

”عمومی! بیابان نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔  
”کیسے جی لیا تم نے ”الریان“ کے بغیر، کسے

”ہاں حق نواز کی وجہ سے۔ وہ اپنی صحافی دوست کے  
نوائے بہت دل برداشتہ تھا، ورنہ پارٹی سے ہمیں کئی



اختلافات تھے۔

”اتنا بڑا سامعہ ہو گیا کسی نے احتجاج نہیں کیا، جلوس نہیں نکلا؟“

”اتنے بڑے پانے پر نہیں شاید لوگ خوف زدہ ہیں۔ حالانکہ ایوزیشن اور مخالف گروپ کو بھی یہ چانس دیا جانا پسند نہیں آیا۔“ سرالطاف نے انہیں بتایا تھا۔

”ان کے کارکنوں کو کچھ تو کرنا چاہیے تھا۔ کوئی احتجاج کچھ تو۔“

اور پھر تمہیں انہیں کیسے اس کی آمد کی خبر ہو گئی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے اپنے دفتر میں وہ سب احتجاج کرنا چاہتے تھے۔ ایک بڑا جلوس نکالنے کی تیاری کر رہے تھے کہ فلک شاہ کو ان کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ تب شیردل کیسے مارا مارا پھرا تھا۔ کتنی کوششیں کی تھیں جب اسے کوٹ لکھیت سے قلعے میں منتقل کیا گیا تھا۔ اور جب شیردل کسی بہت اونچی سفارش کے ساتھ قلعے پہنچا تھا تو اسے پتا چلا تھا کہ اسے توکل صبح ہی رہا کر دیا گیا تھا لیکن پھر پورے ایک ہفتے بعد بالکل حق نواز کی طرح اسے کوئی کرٹل شیردل کی کوشش کے باہر پھینک گیا تھا۔ ان کی ٹانگیں چل دی گئی تھیں۔

”بس کرو خدا کے لیے شیردل! بس کرو مزید سننے کی تاب نہیں ہے مجھے۔“

باباجان رو پڑے تھے۔ فلک شاہ کی وہ بیل چیر دیکھ کر انہیں شیردل کی زبانی اپنے مومی پر ہونے والے ظلم کی داستان پھر سے یاد آگئی تھی۔ پتا نہیں چھپیس سال کیسے گزار لیے تھے انہوں نے اس بے خبری میں اور انہوں نے مصطفیٰ عثمان سے بھی نہیں پوچھا تھا اور نہ ہی احسان شاہ کی ناراضی کا خیال کیا تھا۔ بس مصطفیٰ کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ بہاول پور جا رہے ہیں مومی سے ملنے۔

”ابھی آپ کی طبیعت کچھ اور سنبھل جاتی تو میں آپ کو لے جاتا باباجان۔“

لیکن انہوں نے مصطفیٰ کی بات کا جواب نہیں دیا

تھا۔ ”چھپیس سالوں میں تو تمہیں کبھی خیال نہیں آیا کہ مجھے میری عمو اور مومی کے پاس لے جاؤ۔ تم نے کبھی اس فاصلے کو پائے کی کوشش نہیں کی جو خود بخود ہی بنتے چلے گئے تھے۔“

انہوں نے دل ہی دل میں سوچا ضرور تھا لیکن مصطفیٰ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس رات کے بعد بیچ میں صدیوں کے فاصلے حاصل ہو گئے تھے۔

وہ رات کیسے گزری تھی۔ انہیں خبر نہیں تھی۔ غصے میں اس نے سوچا تک نہیں کہ وہ اپنے ہی پاؤں پر کھڑا می مار رہا ہے۔ انہوں نے لکھی ہی پاراماں جان سے کہا تھا اور وہ تو خود پوری رات روٹی رہی تھیں۔ ”میں نے غصہ کیا تھا۔ ڈانٹا تھا۔ بزرگ تھا۔ اس کے باپ کی جگہ تھا۔ میں غصے میں تھا۔ تو وہ ہی خاموش ہو جاتا۔ یہ غضب نہ ڈھاتا۔“

رات آنکھوں میں کٹی تھی اور صبح وہ فجر کے لیے نکلے تو سیدھے ملک ہاؤس جا پہنچے تھے۔ وہاں تالا لگا ہوا تھا۔

”کہاں چلے گئے آخر دونوں اتنی صبح۔“

انہوں نے سوچا تھا پھر اس روز انہوں نے دو تین چکر لائے تھے۔ ان کا گھر مقفل تھا۔ تب انہوں نے مصطفیٰ کو فون کر کے ساری حقیقت بتادی تھی اور جب وہ مصطفیٰ سے بات کر رہے تھے تو احسان شاہ اندر خاموشی سے آکر بیٹھ گئے تھے اور انہیں مصطفیٰ سے بات کرتے سنتے رہے تھے اور جب وہ بات کر چکے تھے تو احسان شاہ نے کہا تھا۔

”باباجان! اس گھر کے دروازے خود مومی نے اپنے اوپر بند کر لیے ہیں لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتا تو میں خود اس کا آئبند کر دیتا۔“

انہوں نے جی رانی سے احسان شاہ کو دیکھا تھا۔

”وہ یہاں نہیں آسکتا اور نہ ہی ”الریان“ کا کوئی فرد اس سے کوئی تعلق یا رابطہ رکھے۔“

”کیوں رابطہ نہ رکھے احسان شاہ! وہ کوئی غیر تو نہیں ہے۔ ہماری عمارہ کا شوہر ہے۔ ٹھیک ہے وہ جذباتی ہے عصبیلا ہے۔ میں نے بھی اس طرح اس سے بات

نہیں کی تھی اتنے غصے سے اور ناراضی سے تو وہ برداشت نہیں کر سکا اور فضول اور غلط بول دیا۔ میں جاؤں گا کل خود مفتی صاحب کے پاس مسئلہ پوچھوں گا۔“

”باباجان! میں نے آپ سے کہا تھا کہ وہ خودیہ نہ کرتا تو میں منع کر دیتا سے یہاں آنے سے۔“

”لیکن کیوں احسان شاہ کیوں۔ کیا کیا ہے مومی نے؟“

”بہتر ہے باباجان! آپ کچھ مت پوچھیں۔ جو بھرم ہے اسے رہنے دیں۔“

اور اپنی بات کر کے احسان شاہ وہاں رکا نہیں تھا بلکہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا اور وہ سوچتے ہی رہ گئے تھے کہ آخر احسان کو کس بات پر اتنا غصہ ہے۔ شاید کسی بات پر مومی سے ناراض ہے اور احسان شاہ کی بچپن سے عادت تھی کہ وہ بڑی سے بڑی بات پر بھی نہ ناراض ہوتا تھا نہ برا ماننا تھا لیکن اگر کبھی کسی بات پر ناراض ہو جاتا تو پھر سخت ناراض ہوتا تھا۔ لیکن انہیں یقین تھا کہ مومی سے زیادہ عرصہ تک وہ ناراض نہیں رہ سکتا اور پھر اگلے دو تین دن احسان شاہ کے منع کرنے کے باوجود بھی انہوں نے ملک ہاؤس کے چکر لگائے تھے اور مفتی صاحب کے پاس جا کر بھی اس مسئلے کو ڈسکس کیا تھا اور مفتی صاحب کے بتانے کے بعد کہ اب کوئی صورت نہیں ہے اور بھی دل برداشتہ ہوئے تھے لیکن دل میں یہ امید تو تھی کہ وہ نہیں ہم تو ملنے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے لکھی ہی بار بہاول پور فون کیا تو پتا چلا وہ وہاں نہیں ہے۔ آخر دونوں کہاں چلے گئے پریشان ہو کر وہ پھر احسان کے پاس ہی آئے تھے۔ ”الریان“ میں صرف سوئی تو تھے اس وقت۔

”یہیں اسی شہر میں ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“

”کیسے پریشان نہ ہوں احسان! غصے میں کچھ کرنے بیٹھا ہوں خدا کے لیے بیٹا! اس کا پتا کرو۔“

”کچھ نہیں کیا اس نے باباجان! آیا تھا میرے آفس میں مجھ سے ملنے۔ میں نہیں ملا۔“

”کیوں نہیں ملے تم اس سے؟“

”میں اس سے ملنا نہیں چاہتا۔“ آج نہ پھر کبھی زندگی میں۔ اور عمارہ کا فون آیا تھا میرے پاس میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ ایک کو چھوڑ کر آجاؤ۔ لیکن اگر اس کے بغیر نہیں رہ سکتی ہو تو لے آؤ اسے بھی۔ ”الریان“ کے دروازے اس کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔“

”وہ کیسے آسکتی ہے یہاں؟ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس کا مطلب سمجھتے ہو۔ وہ اگر یہاں قدم رکھے گی تو اسے طلاق ہو جائے گی۔“

”سمجھتا ہوں باباجان! اسے کسی ایک کو تو چھوڑنا ہو گا۔ ہمیں یا مومی کو۔“

”درمیانی راستہ بھی نکالا جاسکتا ہے بیٹا! جو غلطی مومی نے کی ہے اس کا ازالہ تو نہیں ہو سکتا لیکن ہم انہیں اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتے۔ ملنے جاسکتے ہیں۔“

”نہیں، آپ کیسے ملنے جاسکتے ہیں۔ مومی نے کہا تھا کہ وہ یا ان کی بیوی اگر ”الریان“ میں آئی یا ہم لوگوں سے ملی تو۔“

یہ مانہ تھی۔ جو وہیں بیٹھی ان کی اور احسان کی گفتگو سن رہی تھی۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔“ انہوں نے فوراً بات کاٹی تھی۔ ”مومی نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے ملنے کی بات ہرگز نہیں کی تھی۔“

انہیں پورا یقین تھا لیکن پھر مانہ نے اتنی بار اس بات کو دہرایا کہ انہیں یقین سا ہونے لگا۔ لیکن اس روز جب زارا آئی تھی اور اس نے رو رو کر عمارہ کے پاس جانے کی التجا کی تھی تو وہ یکدم ہی تیار ہو گئے تھے بہاول پور جانے کے لیے اور انہیں مومی کا کہا ایک ایک لفظ یاد آگیا تھا۔ اور اہل جان نے بھی اس کی تصدیق کی تھی تب احسان شاہ نے وہ بات کہہ دی تھی کہ وہ ششدر سے ہو کر رہ گئے تھے۔

”عمارہ نے ہمارے بجائے مومی کا انتخاب کیا ہے۔ یہ اس کی اپنی چوائس ہے۔ لیکن ”الریان“ سے اگر کوئی شخص بی یا عمارہ ملنے جائے گا تو میں قسم کھاتا ہوں کہ اسی وقت خود کو اور مانہ کو ختم کر دوں گا۔“



اتنی نفرت آتا غصہ۔

وہ حیرت سے احسان شاہ کو دیکھتے رہ گئے تھے۔  
”آخر ایسا کیا کر دیا ہے اس نے احسان شاہ! مجھے بتا کیوں نہیں دیتے؟“ انہوں نے بے بسی سے پوچھا تھا۔

”کچھ نہیں باباجان! میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ اس بات پر وہ ہی گزار رہے ہیں۔“

اور وہ خاموشی سے بیٹھ گئے تھے۔ زارا روتی ہوئی چلی گئی تھی۔ کتنے سارے دن یوں ہی گزر گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ ان کے پاس تو کسی کا فون تک نہیں آیا تھا۔ نہ عمارہ کا نہ مومی کا۔ وہ کتنی ہی بار ملازموں سے پوچھتے تھے۔ کوئی فون تو نہیں آیا۔ تب زارا کا فون آیا تھا۔ وہ عجیب کے ساتھ ہمالوں پور کا چکر لگا آئی تھی۔ عمارہ اور مومی بھائی ہمالوں پور آگئے ہیں۔ اس نے انہیں اطلاع دی تھی۔

”دونوں کی حالت بہت خراب ہے باباجان! پلیز آپ اور اماں جان جا کر انہیں مل آئیں۔ بہت روتے ہیں مومی بھائی۔ عمو آپی سے بھی زیادہ ان کی حالت بری ہے۔ باباجان! پلیز ان کی غلطی کو معاف کر دیں اور ان سے تعلق مت توڑیں۔ آپ ان کے ساتھ ہوں گے تو انہیں یہ غم سہارنے کی طاقت ملے گی۔“ ابرار نے چھوڑنے کا غم بہت برا ہے۔ آپ لوگوں نے بھی چھوڑ دیا تو کیسے سہیجے گے۔ تب انہوں نے کتنی بے چینی سے ہمالوں پور کا ممبر ملایا تھا۔

”عمارہ یا مومی سے بات کرو۔“  
”جی عمارہ لی بی تو ہسپتال گئی ہوئی ہیں تھوڑی دیر تک آجائیں گی آپ پھر فون کر لیتا۔“

”عمارہ ہسپتال گئی ہوئی ہے۔“ انہوں نے اماں جان کو بتایا تھا جو اس ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔  
”ہاں اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں کب سے کہہ رہی تھی کہ ڈاکٹر کے پاس چلی جائے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“

اور پھر دوبارہ فون کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ مرنے نہ شاید احسان شاہ کو بتایا تھا فون کے متعلق

تب ہی وہ ان کے کمرے میں چلے آئے تھے۔  
”باباجان! میں نے کہا تھا۔“ ابرار نے سے کوئی رابطہ نہیں کرے گا۔ نہ ملے گا۔ نہ دوں۔“  
”یہ رشتے ٹوٹنے والے تو نہیں بیٹا! بیٹی ہے وہ ہمارے ایک حماقت اس نے کی ہے۔ وہ سری اب ہم کریں۔“

”احسان نے قسم کھائی ہے باباجان! وہ؟“ مانہ نے آہستگی سے کہا تھا۔

”کسم کا کفارہ بھی ادا کیا جاسکتا ہے بیٹا! احسان نے بھی غصے میں کہہ دیا ہے اب۔“

”میں نے غصے میں ہی بات نہیں کی تھی سنجیدگی سے کہا تھا اور میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ اگر آپ اماں جان یا کوئی اور یہاں سے مراد پکس کیا تو میں ابھی اسی وقت خود کو شوٹ کر لوں گا۔“

انہوں نے جیب سے اپنا پستول نکال لیا تھا۔  
”یہ کیا حماقت ہے احسان شاہ! وہ یکدم گھبرا اٹھے۔“

”والو اسے جیب میں خواتم خواہ کیوں اٹھا لائے۔ اسے۔“

”خواتم خواہ نہیں باباجان۔ میں سچ کہہ رہا ہوں آپ ان سے تعلق رکھیں ملیں۔ لیکن اس سے پہلے میری لاش سے گزر کر جائے گا۔“

اور وہ تو جیسے ڈھسے گئے تھے۔  
”جاؤ احسان! اپنے کمرے میں اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ اس روز اماں جان کے آنسو ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں گھے تھے اور خود انہوں نے رات جاگ کر گزار دی تھی۔

”مصطفیٰ! خدا کے لیے جلدی آجاؤ۔“ انہوں نے مصطفیٰ کو فون کیا تھا۔

”لیکن ان کے آنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ احسان شاہ نے مصطفیٰ کی بھی کوئی بات نہیں سنی تھی۔ ان کی ایک ہی بات تھی۔ میری اور مانہ کی موت کے بعد۔“

مصطفیٰ بھی خاموش ہو گئے تھے۔

”باباجان! کچھ عرصے بعد احسان کا دل موم ہو جائے گا۔ ابھی تو سختی سے اپنی بات پر اڑا ہوا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ وہ ایسا کر بھی گزرے گا۔ یاد ہے نا بچپن میں اس نے ضد میں آکر میز سے نیچے چھلانگ لگا دی تھی۔“

”لیکن کیوں احسان ایسا کیوں کر رہا ہے مصطفیٰ؟“

”باباجان! اس سلسلے میں وہ کچھ نہیں کہتا۔ ہمارے لیے اس وقت سب سے اہم احسان کی زندگی ہے۔ کچھ عرصہ بعد ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ حوصلہ رکھیں۔“

لیکن وہ کچھ عرصہ چھپیس سالوں پر محیط ہو گیا۔ انہوں نے اماں جان کی بیماری پر کتنی ہی بار مانہ سے کہا تھا۔

”عمو کو فون کرو۔ اسے ماں کی بیماری کا بتا دو۔ وہ بیٹی سے اپنے ان آخری لمحوں میں ملنا چاہتی ہے۔ وہ۔“

”ابراہ! میں آسکتی لیکن ہسپتال میں تو آسکتی ہے۔“ لیکن اماں جان جب بھی ہوش میں آتیں، عمارہ کا پرچھٹیں۔ پتا نہیں مانہ نے فون بھی کیا تھا یا نہیں۔ تب انہوں نے احسان شاہ سے کہا تھا۔

”شانی بیٹا! اپنی مرنی ہوئی ماں کی آخری خواہش پوری کرو۔ عمارہ کو لے آؤ اپنی ماں سے ملانے کے لیے۔“ انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

”یہ کیا کر رہے ہیں باباجان! احسان شاہ نے ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔“

”میں مانہ سے کہتا ہوں وہ ہمالوں پور فون کر کے عمارہ کو بتا دے۔ اماں جان کی بیماری کا اور کہہ دے اسے آنے کو ہسپتال میں لیکن ایسی آئے مومی ساتھ نہ ہو اس کے۔“

اور تب مانہ نے انہیں بتایا تھا کہ اس نے دوبار عمارہ کو فون کیا تھا لیکن عمارہ نے بتایا ہے کہ اسے مومی نے اجازت نہیں دی آنے کی۔

”نہیں۔“ وہ کتنی ہی دیر تک بے یقینی سے مانہ کو دیکھتے رہے تھے۔ ”مومی ایسا نہیں ہے۔“

”وہ کیا ہے باباجان! آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

سکتے۔“

احسان شاہ نے آہستگی سے کہا تھا لیکن انہوں نے سن لیا تھا۔

”اور عمارہ کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ مومی نے اسے اجازت نہیں دی ہوگی۔“

اور وہ خاموش ہو گئے تھے اور پھر جب وہ وفات پا گئی تھیں تب بھی انہوں نے مانہ کی منت کی تھی۔

”اسے اطلاع کرو۔ اپنی ماں کا آخری بار منہ تو دیکھ لے۔“

اور مانہ نے بتایا تھا کہ اس نے بتا دیا ہے لیکن وہ نہیں آئی تھی۔

جنازہ کی نماز پڑھتے ہوئے قبر پر مٹی ڈالتے ہوئے بھی انہیں انتظار تھا کہ وہ آجائیں گے۔ مومی اتنا شقی القلب نہیں ہو سکتا کہ عمارہ کو اس کی ماں کی موت پر بھی نہ آنے دے۔ مگر۔

اور پھر اس روز کے بعد انہوں نے احسان یا مانہ سے کبھی مومی اور عمارہ کا ذکر نہیں کیا تھا۔ زارا ان سے آکر کتنا لڑی تھی۔

”اماں جان عمو آپی اور میں بھی اس کے لیے آپ کو معاف نہیں کروں گی۔“

اماں جان کی حسرت بھری نظریں۔ دروازے کی طرف آخری لمحوں تک دیکھتی اور ان سے سوال کرتی نظریں۔

وہ بھی بھلا نہیں پائے تھے۔ انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ مانہ نے عمارہ کو فون نہیں کیا ہو گا۔ عمارہ کا اماں جان کی بیماری اور موت کا سن کر بھی نہ آتا۔

احسان شاہ کی حتمی بات انہوں نے بھی سوچ لیا تھا کہ شاید اب عمارہ اور مومی سے ملنا نا ممکن ہی ہے۔ جب مصطفیٰ پیشہ کے لیے واپس پاکستان آگئے تھے تو ایک بار پھر انہوں نے چاہا تھا کہ احسان شاہ کے دل میں جو کدورت ہے فلک شاہ کے متعلق وہ ختم ہو جائے اور مصطفیٰ سے لٹھاکا تھی کہ وہ سمجھائے شانی کو۔ خون کے رشتے ختم نہیں کیے جاسکتے۔ وہ اپنی فضول قسم کا کفارہ ادا کرے اور انہیں اجازت دے کہ وہ مصطفیٰ



کے ساتھ عمارہ اور مومی سے جا کر مل آئیں۔  
 ”جب مومی نے عمو کو ماں کی بیماری اور موت پر  
 نہیں آنے دیا تو آپ کا وہاں جانا کیسے پسند کرے  
 گا۔“ یہ بارہ کا خیال تھا۔  
 ”وہ پسند کرے یا نہ کرے لیکن میں آپ کو واضح  
 طور پر بتا چکا ہوں کہ میری لاش پر سے گزر کر ہی آپ  
 بہاول پور جا سکیں گے۔“  
 ”شانی! اتنی نفرت کہاں سے تمہارے دل میں آکر  
 جمع ہو گئی ہے بیٹا! وہ تو تمہارا پار تھا۔ تم اسے اپنا دل  
 کہتے تھے کیسے پتھر کر لیا ہے تم نے اپنے دل کو۔“  
 ”اور آپ کے لیے بھی کبھی بستر ہے باباجان کہ آپ  
 بھی اپنا دل پتھر کر لیں۔ یہی سمجھ لیں کہ عمارہ بھی تھی  
 نہیں۔“

احسان شاہ سختی سے کہتا ہوا چلا گیا تھا۔  
 اور انہوں نے نظا ہر اپنا دل پتھر کر لیا تھا۔ لیکن وہ  
 اس باپ کے دل کو کیا کرتے جو ہمہ وقت عمارہ کی  
 خوشگوار زندگی کی دعا میں کرتا اور اس سے ملنے کو ترپتا  
 تھا۔  
 اس روز کے بعد انہوں نے کبھی عمارہ کی طرف  
 جانے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی اور چپ سا دھلی  
 تھی۔ ایک بار مصطفیٰ نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ان  
 کے ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

”باباجان! میں نے آج مراد پلس فون کیا تھا۔ عمو  
 اور فلک شاہ ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔ شاید انگلینڈ“  
 انہوں نے مصطفیٰ کی بات خاموشی سے سنی تھی اور  
 کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ یہ تو اب عمارہ نے انہیں بتایا  
 تھا کہ مومی اور وہ مومی کے علاج کی غرض سے انگلینڈ  
 گئے تھے وہ ماہ کے لیے کہ شاید ٹائلوں کے وہ نشو و  
 خراب ہو چکے تھے ٹھیک ہو جائیں۔  
 اس کے بعد جیسے ”الریان“ سے ان کا نا ہمیشہ کے  
 لیے ٹوٹ گیا تھا۔ اماں جان زندہ تھیں تو عمارہ اور مومی  
 کا ذکر ہوتا تھا۔ اب ”الریان“ میں وہ کس سے عمارہ  
 اور مومی کی بات کرتے۔  
 احسان شاہ اور ماٹو تو ان کا نام بھی سنتا نہیں

چاہتے تھے۔ زارا آتی تو بغیر خوف کے ذکر کرتی۔ پندرہ  
 دنوں کے قیام میں بہت بار عمارہ کا ذکر ہوتا۔ وہ ہر بار اس  
 سے ”مراد پلس“ چلنے کو کہتی ”وہ ہمارا منع کر دیتے  
 احسان شاہ کی بات بتائے بغیر وہ لڑتی ناراض ہوتی اور  
 چلی جاتی تھی۔  
 انہوں نے کبھی احسان شاہ سے اس کی اس وجہ  
 ناراضی کی وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔  
 وہ ڈرتے تھے کہ اس نے مومی کے متعلق کچھ ایسا  
 کہہ دیا تو وہ کیسے برداشت کریں گے۔  
 اور پھر ماں کی بیماری اور موت پر عمارہ کے نہ آنے کا  
 انہیں دکھ تھا۔ جب زارا نے پاکستان آنے کے بعد  
 انہیں بتایا تھا کہ عمارہ کو تو خبر ہی نہیں اماں جان کی  
 وفات کی۔

مصطفیٰ طویل عرصہ بعد پاکستان آکر سیٹل ہوئے  
 تھے۔ مرتضیٰ اور عثمان باہری سیٹل ہو گئے تھے عمو  
 ”الریان“ میں کون تھا جو عمارہ اور مومی کی کئی محسوس  
 کرتا اور ان فاصلوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتا۔  
 مصطفیٰ اپنے بزنس میں مصروف رہتے تھے ہاں شاہی جیسے  
 سے ”الریان“ میں واپس آئی تھی وہ عمارہ اور مومی کا دل  
 نہ کوئی ذکر لے کر بیٹھ جاتی تھی۔  
 وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتے رہتے تھے۔  
 انہوں نے لب سی لیے تھے وہ کچھ نہیں کہتے تھے۔  
 انہوں نے جیسے اس دکھ کو قبول کر لیا تھا اور حالات سے  
 سمجھو نا کر لیا تھا۔ پھر زارا کی اچانک موت نے تو جیسے  
 انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ زارا کے غم سے نہ حال ہونے  
 کے باوجود ان کی نظروں نے مومی کو کھوجا تھا لیکن وہ  
 کہیں نظر نہیں آیا تھا۔  
 بہن کہتا تھا زارا کو لیکن کتنا تنگ دل ہو گیا کہ نہ  
 بہن کے جنازے کو نہ دعا دیا اور نہ ہی قبر پر مٹی ڈالی۔  
 کہتے ہی دن ان کے دل میں یہ خیال آتا رہا تھا۔  
 انہوں نے سوچا تھا اتنے سالوں بعد وہ عمارہ کو  
 دیکھیں گے۔ وہ باپ کے گلے لگ کر بہن کی موت پر  
 رونے کی لیکن انہیں تو بس عمارہ کی ایک جھلک ہی نظر  
 آئی تھی جب وہ زارا کا چہرہ دیکھنے کے لیے اندر آئے

تھے وہ زارا کی چار پائی پر جھکی رو رہی تھی۔ اور جب  
 وہ اسے دفن کر آئے تھے تو انہوں نے اوسر اوسر اسے  
 کھینچنے کی کوشش کی تھی اور جب وہ کہیں نظر نہ آئی  
 تھی تو انہوں نے شائے پوچھا تھا کیا عمارہ چلی گئی؟  
 ”جی باباجان! وہ تو جنازہ اٹھتے ہی چلی گئی۔“  
 ”اور مومی؟“ ان کے لبوں سے نکلا تھا۔  
 ”وہ تو اپنی ملازمہ اور ڈرائیور کے ساتھ اکیلی آئی  
 تھی۔“

اور اس روز انہوں نے سوچا تھا کہ اب شاید کبھی یہ  
 دوریاں ختم نہیں ہوں گی۔ اور انہوں نے اس روز  
 کے بعد پھر کسی سے تو کیا خود اپنے آپ سے بھی عمارہ  
 اور مومی کا ذکر کرنا چھوڑ دیا تھا۔

واقعات کیسے نانا بابا بن کر غلط فہمیاں بھڑاتے چلے  
 جا رہے تھے۔ یہ تو اب عمارہ نے انہیں بتایا تھا کہ اس  
 روز پتا نہیں کیسے مومی کی کرسی الٹ گئی تھی اور وہ  
 فرسٹ فلور کی بیڑھیوں سے نیچے لاؤنج میں گر گئے  
 تھے۔ بہت چوہیں آئی تھیں انہیں اور کوئی کھٹے تنک  
 انہیں ہوش نہیں آیا تھا۔ زارا کی اطلاع ملی تو وہ آئی سی  
 یو میں تھے۔ ایک کوان کے پاس چھوڑ کر وہ پتا نہیں  
 کیسے وہاں پہنچی تھیں اور وہاں پہنچتے ہی ایک کافون آ  
 گیا تھا کہ ان کی حالت خراب ہو گئی ہے۔ لیکن وہ یہ  
 سب نہیں جانتے تھے اسی لیے تو جب وہ ماں ایک کو  
 لے کر آیا تھا تو انہوں نے ایک بار بھی اس سے عمارہ  
 اور مومی کے متعلق نہیں پوچھا تھا۔ ایک سے بھی وہ  
 زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے لیکن اسے ”الریان“ میں  
 دیکھ کر انہیں خوشی ہوتی تھی۔ جسے انہوں نے کبھی  
 ظاہر نہیں کیا تھا۔

”باباجان! آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے نا۔ میں  
 نے بڑی غلطی کی۔ بہت تکلیف دی آپ کو، اماں  
 جان کو عمارہ کو۔“  
 فلک شاہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر  
 انہیں دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔  
 ”بیٹا! تمہارا کیا قصور۔ بس مقدّر میں لکھی تھیں  
 یہ جدائیاں۔“

”باباجان! اب آپ یہاں رہیں گے نا ہمارے پاس  
 بہت سارے دن۔“  
 انہوں نے اثبات میں سر ہلادیا تھا۔  
 ”اور مصطفیٰ بھائی! باقی لوگ۔۔۔ شانی۔۔۔ کیا وہ بھی  
 آئیں گے یہاں۔“ وہ بچوں کی طرح پوچھ رہے تھے۔  
 انہوں نے پھر سر ہلادیا تھا۔  
 ”شانی تو مجھ سے بہت ناراض تھا بہت خفا تھا بابا  
 جان! کیا وہ ابھی تک۔۔۔؟“

”وہ تم سے اتنا کہ۔۔۔ ناراض تھا مومی؟ بے اختیار  
 ان کے لبوں سے نکلا تھا۔  
 ”کیا آپ کو اس نے کبھی نہیں بتایا باباجان کہ۔۔۔؟“  
 ”نہیں۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلادیا۔  
 ”لیکن وہ تمہارا نام بھی سننا پسند نہیں کرتا۔ اور یہ  
 وہی ہے جس کی وجہ سے عمارہ کی اماں جان اس سے  
 ملنے کی حسرت لیے دنیا سے چلی گئیں۔ اسی نے سب کو  
 زنجیر کر رکھا تھا، ورنہ ہم کیسے دور رہ سکتے تھے تم سے۔“  
 ”ہاں۔۔۔ شانی نے کہا تھا کہ میں ”الریان“ میں  
 دوبارہ قدم نہ رکھوں اور میں۔۔۔“

انہوں نے ایک گہری سانس لے کر نظریں جھکا لی  
 تھیں۔  
 ”لیکن کیوں۔۔۔ کیوں کی اس نے ایسی بات۔ اس  
 نے مجھے آج تک نہیں بتایا۔ کیا تم بھی نہیں بتاؤ گے  
 مومی؟“

”باباجان!“ انہوں نے اُمید نظروں سے انہیں  
 دیکھا۔ ”کیا آپ میری بات کا یقین کریں گے؟“  
 ”کیوں نہیں۔“

”میں نے آج تک عمارہ کو کبھی کچھ نہیں بتایا۔“  
 ان کی نظریں جھک گئیں۔  
 اور انہوں نے سب کچھ کہہ دیا۔ ماٹو سے اپنی پہلی  
 ملاقات سے لے کر اس رات کی بات تک اور باباجان  
 حیرت سے سب سن رہے تھے۔  
 ”شر دل اور مروہ پچھو کو بھی بتا ہے سب۔“  
 ”لیکن مروہ نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔“ بابا جان  
 سب جان کر اُحد حیران ہوئے تھے۔ ”اور اگر مروہ



مجھے بتادیتیں تو میں ہرگز شانی کی شادی ادھر نہ کرتا لیکن مرنے سے پہلے۔۔۔

”سمجھ میں نہیں آتا اس رات عنایت بی بی نے کیوں جھوٹ بولا جبکہ عمارہ میرے کمرے میں تھی۔“ وہ بڑبڑائے لیکن ایک نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے شکاف کی سے کہا۔

”بس اب برائی باتیں یاد کر کے ڈپریشن نہ ہوں۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا اور چلیں! آپ کو کمرے میں لے چلوں۔ کچھ دیر آرام کر لیں۔“

فلک شاہ نے عمارہ کی طرف دیکھا جو شام کی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں اور انہوں نے جیسے اس کے دل میں جھانک کر دیکھ لیا تھا۔

”سوری عمو! صرف تمہاری پریشانی کے خیال سے تمہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔“

”اور خود تمہارا تاجو جھ لیے پھرتے رہے؟“

”تو کیا کرتا اور لگتا تھا کہ تمہیں دکھ ہو گا۔“

”اور مروہ پھپھو۔۔۔ میں سوچ رہی ہوں انہوں نے بھی کبھی آج تک نہ فون کیا۔ نہ آئیں سب ہی خفا تھے ہم سے۔“

فلک شاہ کے لیوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔ تب ہی انہی ٹرائل دھکیلتی ہوئی لاؤنج میں آ گئی۔

”ادھر آؤ بیٹا! میرے پاس آ کر بیٹھو۔ تمہیں جی بھر کر دیکھ لوں۔“

بابا جان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔

”زارا اتنی سچی۔ انہی بالکل عمارہ کی طرح ہے۔ تم تو عمو سے بھی زیادہ پیاری ہو۔“ انہی کے لیوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”بابا جان! یہ لیں ناچکن سموے میں نے بہت کم مرچیں ڈال کر بنائے ہیں۔“

”میری بیٹی نے بنائے ہیں تو ضرور لوں گا۔“

موضوع بدل گیا تھا۔ سب نے ہنسی مذاق کرتے ہوئے چائے پی اور پھر ایک انہیں آرام کے لیے بلجوں والے کمرے میں لے گیا تھا۔

”بابا جان! بس اب آپ لیٹ جائیں۔“ فلک شاہ اور عمارہ بھی ان کے ساتھ ہی آئے تھے۔

”کچھ دیر آرام کر لیں بلکہ لیٹنے سے پہلے اپنی دوا لیں۔“

ایک کو یاد آیا تھا کہ یہ ان کی دوا کا وقت ہے اور وہ کھانے کے کچھ دیر بعد ہی وہ سو گئے تھے۔ تب ایک نے فلک شاہ اور عمارہ سے بھی درخواست کی تھی کہ کچھ دیر آرام کریں۔

”بابا! آپ تو سکون کے لیے کوئی دوا لے کر سو جائیں۔ انہی نے بتایا ہے کہ آپ پوری رات نہیں سوئے ڈاکٹر نے جو میڈیسن آپ کے لیے تجویز کی ہیں وہی لے لیں۔“

”آئی! ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ انہوں نے ایک کے ہاتھ تھامتے ہوئے بھرائی آواز میں پوچھا۔

”شانی کی غلط فہمی کیسے دور ہو گئی بیٹا!“

”بابا جان واپس جا کر ان سے بات کر س گئے نا۔“

”لیکن وہ نہیں مانے گا۔ وہ بابا جان کی بات نہیں مانے گا۔ اسے مانہ پر بہت یقین ہے اور ان چھپس سالوں میں تو۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا بابا جان! ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کی مروہ پھپھو بھی تو ہیں نا۔ آپ ان سے کہہ دیں گا۔ احسان انکل ان کی بات تو سنیں گے نا۔“

”پتا نہیں۔“ وہ کچھ مایوس سے تھے۔ جتنی شدید محبت احسان شاہ نے ان سے کی تھی اتنی ہی شدید نفرت بھی کر لی۔ انہوں نے ان سے اس روز جب وہ ان کے آفس میں گئے تھے ملنے تو انہوں نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا کہ رہا تھا۔

”نفرت ہے مجھے اس شخص سے۔ کہہ دو وہ آئندہ میرے آفس میں قدم نہ رکھے۔“

اور جب انہوں نے فون کیا تھا تو کیا کہا تھا احسان نے ان کی سماعتوں میں وہ لفظ جیسے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے تھے۔

”جتنی شدید محبت میں نے تم سے کی تھی موی!

اب اتنی ہی شدید نفرت کرتا ہوں۔ تمہاری شکل دیکھنا تو درکنار میں تمہاری آواز سننا بھی نہیں چاہتا بلکہ تمہارا نام سننا بھی پسند نہیں کرتا۔“

”شانی پلن! ایک بار میری بات سن لو۔“ انہوں نے التجا کی تھی لیکن احسان شاہ نے فون بند کر دیا تھا۔

اتنی شدید محبت جب نفرت میں بدل جاتی ہے تو کیا وہ نفرت پھر محبت میں بدل سکتی ہے۔

انہوں نے سوچا تھا شاید نہیں۔

”بابا! چلیں آپ کو کمرے میں لے جاؤں۔ سوکر انہیں گے تو فریش ہو جائیں گے۔“

اور پھر واقعی وہ سو کر اٹھے تو کافی فریش تھے۔ پنج بہت خوش گوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ ان کے اور عمارہ کے بچپن کی۔ بلجوں کی۔ زار کی باتیں۔۔۔ چھپس سال پہلے وہ اتنی زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ دوستانہ رویہ رکھنے کے باوجود وہ سب سے بہت زیادہ بے تکلف نہیں تھے اور ابھی وہ کھانا کھا کر قہقہہ پی رہے تھے کہ مروہ پھپھو کا فون آ گیا بابا جان مروہ ناراض ہو رہی تھیں۔

”مجھے کسی نے آپ کی بیماری کا بتایا تک نہیں۔ وہ تو آج میں نے عبداللہ بھائی کو فون کیا تو انہوں نے بتایا۔“

”الریان“ سے کسی کو یقین نہ ہوئی کہ مجھے بھی بتا دیتے۔“

”میں اب ٹھیک ہوں چند! تم پریشان نہ ہو۔“

”اور یہ آپ ”مرلو محل“ کیسے آ گئے۔ میں نے ”الریان“ میں فون کیا تو پتا چلا کہ آپ یہاں ہیں۔ کیا کوئی گنجائش نکل آئی یا پھر موی اور عمارہ میں طلاق۔۔۔“

”میں نہیں مروہ گریا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارے یہاں آنے میں تو کوئی ممانعت نہیں تھی۔ پہلے ہی بہت دیر کر دی ہم نے۔ بہت بھول ہو گئی ہم سے۔ بہت دکھ سے ہیں میری عمو اور موی نے اک ذرا سی غلطی سے۔“

”ہاں اک ذرا سی غلطی سے۔“

ایک نے جو عمارہ کے گرد بازو حائل کیے بیٹھا غاموشی سے سن رہا تھا سوچا۔

”ذہانت کے سفر میں کچھ در بھی چھوٹ جاتے ہیں گھر بھی چھوٹ جاتے ہیں ذہانت کے سفر میں پھر وہ کبھی نہیں ملتا جو کہ چھوٹ جاتا ہے ایک ہاتھ ہاتھوں سے ہاں اک ذرا سی غلطی سے کیا کیا کچھ بکھر جاتا ہے۔“ اس نے سر جھٹک کر بابا جان کی طرف دیکھا جو کہہ رہے تھے۔

”تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے مروہ بچے! موی نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ تم نہیں جانتیں احسان نے اسے ”الریان“ میں آئندہ قدم نہ رکھنے کو کہا تو غصے میں اس کے منہ سے وہ نکل گیا جس کی اذیت مرتے دم تک ہم سب کے دلوں کو کاٹتی رہے گی۔“

”لیکن بابا جان! مجھ سے تو مانہ نے کہا تھا کہ موی نے کہا ہے کہ اگر ہمارے خاندان کے کسی بھی فرد سے اس نے یا عمو نے بات کی یا ملے تو۔“

”جھوٹ بولا تھا اس نے مروہ! سارا کیا دھرا اسی کا تو ہے۔ کاش! اتم شروع میں ہی سب کچھ بتا دیتیں۔“

ان کی آواز بلند ہو گئی تھی اور ہاتھ کا پٹنے لگے تھے تب پاس ہی انہی کرسی پر بیٹھے فلک شاہ نے ان کے ہاتھ سے ریبور لے لیا تھا۔

”مروہ پھپھو! آپ نے بھی اتنے سالوں میں ہماری خبر نہیں لی۔ پوچھا تک نہیں کیا کزری ہم پر آپ کی عمارہ پر۔۔۔“

”موی۔۔۔! موی! یہ تم ہونا۔“ مروہ پھپھو بے قراری سے پوچھ رہی تھیں۔

”ہاں پھپھو! میں ہی ہوں۔“

”یقین کرو موی! التناہل چاہا جب میں پاکستان آئی اور اس سب کا پتا چلا تو کتنا تڑپی میں عمارہ کے لیے۔ بہت پیار ہے مجھے اس سے۔“

حب وہ پیدا ہوئی تھی تو بھابھی جان سے زیادہ میرے



پاس رہتی تھی۔ لیکن ماہر ہم سے ملنے رحیم یار خان آئی تھی اور اس نے سختی سے منع کیا تھا، مجھے تم لوگوں سے ملنے اور فون کرنے سے کیونکہ اس طرح۔۔۔ اور میں کیا نہیں جانتی تھی کہ عمارہ اور تم ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہو۔ میں ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی جس سے تم دونوں میں علیحدگی ہو جائے۔ مجھے پتا تھا زارا تم سے ملتی ہے۔ لیکن ماہرہ نے بتایا تھا کہ زارا کے علاوہ۔۔۔ اور پھر تین منٹ کی کل میں خیر خیریت کے علاوہ کبھی لمبی بات ہی نہیں ہوتی۔

انہوں نے ایک گہری سانس لی تھی۔  
”جو وقت گزر گیا وہ پلٹ نہیں سکتا مرہ پھپھو! ہماری غلطی کی بہت بڑی سزا ملی ہے ہمیں۔ آپ سب نے ہمیں چھوڑ دیا۔ اکیلا کر دیا اور شالی تو نفرت کرنے لگے۔ مجھ سے۔“

”کیوں؟“ مرہ کو حیرت ہوئی تھی۔  
”مجھے بتاؤ تفصیل سے موی! وہ تو تم سے بہت محبت کرتا تھا اور پھر ماہرہ نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ شالی کے ساتھ بہت مخلص ہے اور بہت محبت کرنے لگی ہے اس سے اور یہ کہ باضی میں اس نے جو کچھ کہا تھا وہ سب بھول جاؤں اور کبھی ذکر نہ کروں کسی سے۔ وہ بہت روتی تھی اس روز اپنی بے وقوفی پر اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں کبھی کسی سے ذکر نہیں کروں گی۔ پھر ایسا کیا ہو گیا موی! کیا پھر وہ۔“

”نہیں پھپھو! اس نے کہا تھا کہ وہ میری زندگی جہنم بنا دے گی۔ اپنی بے عزتی کا انتقام لے گی اور اس نے لے لیا پھپھو!“  
فون بند ہو گیا تھا۔ انہوں نے ریسیور کیٹل پر ڈال دیا۔ یکدم ہی ماحول میں افسردگی چھا گئی تھی۔ ایک نے قریب آکر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا اور مسکرایا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر وہ بھی زبردستی مسکرائے تھے اور خود کو کمپوز کرتے ہوئے وہ جواب کی طرف متوجہ ہو گئے تھے جو جانے کی اجازت لے رہا تھا۔  
”جو او بیٹا! غار غ ہو کر ادھر ہی آنا۔ تم سے مل کر ہی نہیں بھرا۔ اللہ تمہیں اور انجی کو بہت ساری خوشیاں

دے۔“  
”آپ بے فکر ہیں۔ آپ جب تک یہاں ہیں۔ میں ادھر سے ہوں گانگی نہیں۔“  
باباجان مسکرایے۔

یہ منظر خوابوں میں خیالوں میں کتنی بار انہوں نے دیکھا تھا لیکن یہ ابھی ناممکن تھا۔ اس منظر کو بھرتا تھا۔ مصطفیٰ، احسان، عثمان، مرضی بھائی۔ وہ تصور تصور میں ان سب سے اس منظر کو بھرتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور ان کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہو رہی تھی۔



زور سے آنکھیں میچتے ہوئے انہوں نے ٹریگر پر انگلی بادی۔ انہیں لگا جیسے ان کا ہاتھ آگڑا گیا ہو اور انگلیاں پتھری ہوں، جنہیں وہ حرکت دینے سے قاصر ہوں۔ انہوں نے دانت بر دانت جھا کر پوری قوت سے ٹریگر دبانے کی کوشش کی لیکن ان کی انگلی نے حرکت نہیں کی۔ گاڑی اشارت ہونے کی آواز سے چونک کر انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ گاڑی زن سے کوڑے دان کے پاس سے گزر کر روڈ کی طرف بڑھ گئی تھی۔ پستول پر ان کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ پستول ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ وہ کچھ دیر خالی نظروں سے اپنے پاؤں کے پاس بڑے پستول کو دیکھتے رہے۔ ان کا پورا جسم پینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ انہوں نے بائیں ہاتھ سے چہرے سے پسینہ پونچھا۔ اور جھک کر پستول اٹھا کر جیب میں ڈالتے ہوئے مرے مرے قدموں سے سر جھکائے چلتے ہوئے روڈ پر آگئے۔ اسٹاپ پر رکھے۔ پینجوں میں سے ایک پر بیٹھے ہوئے انہوں نے جیب سے رومال نکال کر ایک بار پھر ماتھے سے بتے پسینے کو پونچھا۔ حلق میں کانٹے چھ رہے تھے۔ تھوک نکل کر انہوں نے خشک حلق کو تر کرنے کی کوشش کی۔

دو لڑکیاں باتیں کرتی ہوئی ان کے قریب آکر بیٹھ گئیں۔ غالباً کسی آفس میں کام کرتی ہوں گی اور اب

چشتی کے بعد واپس گھر جارہی ہوں گی۔ ایک لڑکی کے ہاتھ میں تھمراس تھا۔ لڑکی نے اس میں سے اپنی نکال کر با اور پھر پانی پیتے پیتے اس کی نظر ان پر پڑی تھی جو یار بار اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر رہے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد جب سے رومال نکال کر ماتھے پر بتے پسینے کو صاف کرتے۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔“ لڑکی انہیں ہمدردانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پھر اپنے خشک ہوجانے والے ہونٹوں پر زبان پھیری تو لڑکی نے تھمراس کے ڈھکن میں پانی ڈال کر ان کی طرف بھمایا۔ انہوں نے منظر نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پانی لے لیا۔

”آپ کو کہاں جانا ہے اکل!“ خلی ڈھکن واپس لیتے ہوئے لڑکی نے پوچھا۔  
”سمن آباد۔“

”پتا نہیں آپ کے روٹ کی وہاں یا بس کب آئے۔ آپ رکشہ کیوں نہیں کر لیتے۔ مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ یہاں سے رشتے والا زیادہ پیسے نہیں لے گا۔“

لڑکی بات کر کے اپنا بس کھولنے لگی تھی۔  
”نہیں۔۔۔ نہیں بیٹا! میرے پاس رقم ہے۔“  
وہ اس کا ارادہ سمجھ کر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور قریب سے گزرتے ہوئے رشتے کو اشارے سے رکنے کے لیے کالو مار مڑ کر لڑکی طرف دیکھا۔

”جی تو بیٹا! اللہ تمہارا انصیب اچھا کرے۔“  
اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کے ہاتھ لڑنے لگے تھے اور آواز بڑھ گئی تھی۔  
وہ اسے دعا دے کر تیزی سے رشتے کی طرف بڑھ گئے۔ رشتے والا آواز لگا رہا تھا۔

”میاں صاحب جلدی کریں۔“ انہوں نے مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی وہیں کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔

”میاں صاحب!“ رشتے والے نے پھر کہا تو وہ تیزی سے رشتے میں بیٹھتے ہوئے بولے۔  
”سمن آباد“ اور رکشہ جھٹکا کھا کر ہوا ہو گیا۔  
”کون کتا ہے کہ ہماری نئی نسل سب ادب و آداب بھول بیٹھی ہے۔ پتا نہیں کیوں ہم اپنی نئی نسل سے مایوس ہو گئے ہیں اپنی جلدی حالانکہ۔۔۔ میں۔۔۔ میں بھی تو مایوس ہو گیا تھا۔۔۔ وہ چونک کر سیدھے ہو گئے۔

”آگر اس روز میں اسے اپنے پاس بٹھا کر سمجھاتا، غلط اور صحیح کا اور اک دیتا تو شاید۔ ایک چانس تو مجھے اسے دینا چاہیے تھا۔ اگر نہ سمجھتا تو۔۔۔ لیکن اب۔۔۔ اب کیا فائدہ۔ اب تو پانی سر سے گزر چکا۔“

ایک بار پھر بہت سارے بچھتاؤں نے انہیں گھیر لیا۔ ان کی خشک آنکھوں میں نمی اتر آئی اور آنسو ان کے اندر گرنے لگے۔

”میں بہت کمزور ہوں۔ بہت بزدل ہوں۔ میں اس پر گولی نہیں چلا سکا۔ میرے ہاتھوں نے میرا ساتھ نہیں دیا۔“  
انہوں نے ہاتھ پھیلا کر اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھا اور پھر جیب تھپتھا کر پستول کی موجودگی کو محسوس کیا۔

دو سال پہلے جب آس پاس کے ایک دو گھروں میں ڈاکا پر اٹھا یہ پستول وہ ہی پشاور سے لایا تھا اور اسی نے بھاگ دوڑ کر لائسنس بنوایا تھا اور اب اسی پستول کی گولی وہ اس کے سینے میں اتارنے کے لیے آئے تھے۔ آج اس نے جھوٹے نبی کی گواہی دی تھی۔ ایک شخص کو نعوذ باللہ نبی تسلیم کیا تھا۔ کل کو وہ خود بھی نبوت کا دعوا کر سکتا تھا۔

”یا اللہ! مجھے بہت عطا کر۔“  
وہ یکدم دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگے۔ رشتے والے نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

”میاں صاحب! آخریت ہے نا۔“  
وہ پوچھ رہا تھا۔ اور وہ بچپان لے لے کر روتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ میں بہت کمزور ہوں۔ میں کچھ



نہیں کر سکتا۔ کچھ بھی نہیں۔ وہ اور لوگ ہوتے ہیں ”قرطبہ کے قاضی“ جیسے۔ اپنی ہی اولاد کے خلاف فیصلہ سناتے والے۔ میرے جیسے کمزور دل تو۔۔۔“

”ہاں! انہوں نے پھر اثبات میں سر ہلادیا تھا۔ گھر آگیا تھا۔ انہوں نے کراہ ادا کیا۔

رکشہ سے اتر کر تیل پر ہاتھ رکھا لیکن فوراً ہی اٹھا لیا۔ اب وہ پھر مڑ کر گلی سے باہر روڈ کی طرف جا رہے تھے۔ روڈ پار کر کے وہ دوسرے روڈ پر آ گئے۔ یہاں انہوں نے کچھ ہی دن پہلے ایک پی سی او دیکھا تھا۔ دل ہی دل میں پختہ ارادہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنے والٹ سے ایک کارڈ نکالا۔ یہ کارڈ بہت دن پہلے اس ایس ایچ او نے دیا تھا جو احمد رضا کو نقیشت کے لیے گیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ اگر کبھی اس کذاب کے ٹھکانے کا علم ہو تو اس نمبر پر فون کر دینا۔

کچھ دیر ہاتھ میں لیے وہ متذبذب سے کھڑے رہے پھر پی سی او کی طرف بڑھے۔

”ایک فون کرنا ہے جناب!“

”کیبن میں بیٹھے ہوئے شخص نے جو کوئی جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا ناول سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھا۔

”فون خراب ہے۔ کمپلین کر رکھی ہے۔ کچھ دیر بعد آئیے گا۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔“

ایک گہرا سانس لیتے ہوئے انہوں نے سر ہلایا اور واپس گھر کی طرف چل پڑے۔ مٹھی میں دیا ہوا کارڈ انہوں نے جیب میں رکھ لیا تھا۔ اندر کہیں گہرائی میں اطمینان سا پھیل گیا تھا۔ پولیس گولی بھی چلا سکتی تھی۔ اور وہ گولی کسی کو بھی لگ سکتی تھی، احمد رضا کو بھی۔ وہ ایک لمحہ کے لیے ٹھٹھکے اور پھر تیز چلنے لگے۔

وہ گھر سے بھی فون کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے سوچا تھا کہ وہ گناہ آدمی کی حیثیت سے فون کر کے پولیس کو بتادیں گے کہ وہ کذاب کہاں چھپا ہوا ہے اور احمد رضا۔۔۔

احمد رضا تو محض اس کا مرید ہے۔ امید ہے پولیس اسے چھوڑ دے گی اور نہ بھی چھوڑا تو وہ دیکل کر لیں

گے اچھا ہے تھوڑی سزا ہو جائے گی تو اسے بھی کچھ میں آجائے گی۔

گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ تین چار وکیلوں کے متعلق سوچ چکے تھے۔ جن سے کسی نہ کسی ذریعے سے تھوڑی بہت واقفیت تھی۔

”ابو! آج پھر آپ کو دیر ہو گئی۔“ سمیرا برآمدے میں ہی بیٹھی تھی۔

”یاں بیٹا! ان دنوں کام زیادہ ہے کچھ۔“ وہ اس کے پاس تخت پر ہی بیٹھ گئے۔

”ابو! آپ ڈھونڈنے گئے تھے رضی کو؟“ سمیرا انہیں دیکھ رہی تھی۔ ”کچھ نہ چلا؟“ وہ اس کی بات سن کر چونکے پھر بے اختیار ان کا سفر فی میں مل گیا۔

”آپ دو دن سے دفتر نہیں جا رہے۔ آپ کے دوست ہیں نا قاضی صاحب! ان کا فون آیا تھا۔ آپ کی طبیعت پوچھ رہے تھے۔“

سمیرا نے نظریں جھکا لی تھیں۔ حسن رضا خاموش ہی رہے تھے۔

”کیا کچھ اندازہ ہے آپ کو کہ وہ کہاں ہو گا؟“

”نہیں۔۔۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور غیر ارادی طور پر ان کا ہاتھ اپنی پینٹ کی جیب کی طرف بڑھا۔

”ابو! یہ آپ کی پاکٹ میں کیا ہے؟“ سمیرا کی نظریں ان کی ابھری ہوئی پاکٹ پر تھیں۔

”وہ۔۔۔ یہ۔“ بالکل غیر ارادی طور پر انہوں نے پستول جیب سے نکالا۔

”یہ۔۔۔“ سمیرا کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ ”آپ۔۔۔ ابو! آپ اس لیے رضی کو ڈھونڈ رہے ہیں کہ اسے۔۔۔؟“

وہ ایک دم پیچھے ہٹی تھی اور بے حد خوفزدہ سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

”نہیں، نہیں۔۔۔ میں بھلا کسے۔۔۔ نہیں یہاں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اسے نہیں مار سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔۔۔ میں ایک کمزور دل باپ ہوں۔ میرے سینے میں صرف ایک باپ کا دل دھڑکتا ہے۔ صرف باپ کا دل

جو اپنے مرتد بیٹے کو قتل نہیں کر سکتا۔ چاہے وہ نبوت کا دعو ا کر لے۔ چاہے وہ۔۔۔“

وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے۔

سمیرا نے جو خوف زدہ نظریں سے انہیں دیکھ رہی تھی یکدم ان کے قریب ہوتے ہوئے ان کے بازو پر ہاتھ رکھے۔

”ابو! بے زور میں نہیں پلے بازو! وہ ہولے ہولے ان کا بازو تھپتھا رہی تھی۔ لیکن وہ رونے چلے جا رہے تھے۔ رونے رونے انہوں نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر سمیرا کی طرف دیکھا۔

”پتا ہے سمیرا! ایک بار حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے نے کہا۔ اسلام لانے سے پہلے جب ایک جنگ میں میرا آپ کا سامنا ہوا تو میں نے تلوار نیچے کر لی اور وہاں سے ہٹ گیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ”بخدا اگر تم میرے سامنے آتے تو میں ہرگز اپنی تلوار نیچے نہ کرتا۔“

یہ وہ قوت ایمانی ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں تو بس دعو ا کر سکتا ہوں۔ رو سکتا ہوں۔ توبہ کر سکتا ہوں۔ شاید وہ سن لے۔ شاید وہ تاب ہو جائے شاید اس کا دل پلٹ جائے۔“

”اس کا دل ضرور پلٹے گا ابو! مجھے یقین ہے۔ وہ ضرور تاب ہو گا۔ اس سے غلطی ضرور ہوئی ہے لیکن غلطیوں کی معافی مل جایا کرتی ہے۔ اللہ توبہ رحیم و کریم ہے۔ وہ توبہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی توبہ قبول کرے گا۔“

”ہاں ضرور۔“ انہوں نے ہاتھ بڑھ کر سمیرا کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ اب وہ دونوں رو رہے تھے تب ہی زبیدہ نے کمرے کے دروازے سے جھانک کر انہیں دیکھا اور باہر آ گئیں۔

”یہ کیا مغرب کے وقت باپ بیٹی نے رونا دھونا مچایا ہوا ہے۔ اللہ خیر کرے میرا بیٹا سلامت رہے۔ خوش رہے۔ دونوں وقت مل رہے ہیں اور تم۔۔۔“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر واپس مڑ گئیں۔ سمیرا

نے الگ ہوتے ہوئے جلدی سے آنکھیں صاف کر لیں اور حسن رضا کی طرف دیکھا۔

”ابو! آپ وضو کر لیں۔ مغرب کی اذان ہونے ہی والی ہے۔ نماز پڑھ لیں پھر کھانا لگا دیتی ہوں۔“

”نہیں بھوک نہیں ہے بیٹا!“

”صبح سے بھوکے ہیں۔ مجھے پتا ہے آپ نے کچھ کھایا نہیں ہو گا۔“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے تخت پر پراپستول اٹھالیا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں ادھر دو۔ بھرا ہوا ہے احتیاط سے۔“

انہوں نے اس کے ہاتھ سے پستول لے لیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ سمیرا وہیں برآمدے میں حیران سی کھڑی تھی۔

”ابو بھرا ہوا پستول لے کر رضی کو ڈھونڈنے گئے تھے۔ اللہ کرے رضی بھی نہ ملے ابو کو۔“ اس نے زیر لب کہا تھا اور پھر ایک جھرتھی سی لے کر فوراً ”بی دعا“ مانگی تھی۔

”یا اللہ! نہیں۔۔۔ رضی آجائے واپس آجائے۔“ وہ پھر وہیں تخت پر بیٹھ کر دعا مانگنے لگی۔ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی۔ مغرب کی اذانیں کب کی ہو چکی تھیں۔ دل دھڑوڑھ کر رہا تھا۔ پورے وجود میں یکدم کچھ سی طاری ہو گئی تھی۔ اٹھنے کو ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے لبوں سے ایسی غلط بات کیوں نکلی ”یا اللہ! رضی آجائے، ابھی آجائے“ آج ہی کل ہی۔۔۔

وہ بمشکل نماز کے لیے اٹھی تھی۔ نماز پڑھ کر اس نے چائے کے لیے پانی رکھا اور ساتھ ہی سالن گرم کرنے لگی۔ ابو صبح سے بھوکے ہیں۔ ناشتے میں بھی کچھ نہیں لیا تھا۔

جلدی جلدی ٹرے میں سب سامان لگایا اور کمرے میں آئی۔ حسن رضا آنکھیں موندے بیڈ پر نیم دراز تھے اور زبیدہ ابھی تک جاء نماز پر بیٹھی تھیں۔

”ابو! کھانا کھائیں۔“ اس نے ٹرے نیبل پر رکھی۔

”میں نے کہا تھا بیٹا! مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”تھوڑا سا کھالیں ابو! میں پھر چائے لے کر آ رہی



ہوں۔

وہ ایک بار پھر انہیں کھانے کی تاکید کرتی ہوئی چلی گئی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور سائیڈ ٹیبل سے ٹرے اٹھا کر بیڈ پر رکھی۔ ڈونگے کا ڈسکن اٹھایا۔ قیمہ کر لیے پکے تھے۔

احمد رضا کو قیمہ کر لیے بہت پسند تھے۔ فرمائش کر کر کے پکوا کر کھا تھا۔

”اماں جانی! آپ کے جیسے قیمہ کر لیے پورے پاکستان میں کوئی بھی نہیں بنا سکتا۔“ وہ موڈ میں ہوتا تو کہتا تو وہ اسے چرانے کو کہتے تھے۔

”نہیں محترم! میری اماں جیسے قیمہ کر لیے تو تمہاری اماں مر رہی نہیں پاکستان۔“

”اف!“ ان کے لبوں سے سسکی نکل گئی اور انہوں نے ڈونگے پر ڈسکن رکھ دیا۔

زیدہ جو نماز پڑھ کر ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھیں جاؤ نماز ایک طرف رکھ کر بیڈ کے قریب آئیں۔

”آپ نے کھانا کیوں چھوڑ دیا؟“ انہوں نے سر اٹھا کر زیدہ کی طرف دیکھا۔

”تم نے یہ قیمہ کر لیے۔“

”مجھے لگا تھا جیسے وہ آج آجائے گا۔ اتنے بہت سارے دن وہ کہاں ہمارے بغیر رہ سکتا ہے۔“ وہ ان کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

”یاد ہے نا جب آپ کے تایا جان کا انتقال ہوا تھا تو ہم رحیم ہار خان گئے تھے۔ ہمیں وہاں کچھ زیادہ دن لگ گئے تھے اور رضی اپنے امتحان کی وجہ سے یہاں تھا پھر یاد ہے جب ہم واپس آئے تھے تو وہ رو پڑا تھا حالانکہ دسویں میں پڑھتا تھا۔“

”ہاں۔۔۔ کہتا تھا میں آئندہ کبھی اتنے بہت سارے دن آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سن لیں اب آپ جب کبھی رحیم یا رخان یا کہیں اور جائیں گے تو میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ امتحان بے شک ہوتے رہیں۔“ انہوں نے ٹرے اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کرتے ہوئے زیدہ کی طرف دیکھا۔

”تو کیا اس نے صبر کر لیا ہے۔ صبر آگیا ہے اس کا پھر۔“ زیدہ کے چہرے پر وہ پلے جیسی بے چینی اور بے سکوئی نہیں تھی۔

”جھوٹی امیدوں نے اسے ہسلا لیا ہے۔“

زیدہ کے چہرے سے نظریں ہٹا کر انہوں نے ٹی وی کی طرف دیکھتے ہوئے آواز بلند کی۔ نیوز کا سٹرک رہا تھا۔

”آج شام ایک خبری اطلاع پر ایک جگہ جھلپا مارا گیا۔ جہاں اسماعیل کذاب کے کارندے میننگ کر رہے تھے اور۔۔۔“

وہ سانس روکنے کی وی کی طرف دیکھ رہے تھے اور انہیں سوائے نیوز کا سٹرک کی آواز کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، جیسے ان کے ارد گرد ساری آوازیں مر گئی تھیں۔ انہیں سیرا کے دروازہ کھولنے کی آمیت بھی نہیں ہوئی تھی۔

”جس مکان پر چھلپا مارا گیا تھا وہاں کوئی تقریب ہو رہی تھی۔“

نیوز کا سٹرک خبروں کی تفصیل بتا رہا تھا۔

”آج شام بوقت مغرب خفیہ اطلاع پر مکان کے گرد گھیرا ڈالا تاکہ اسماعیل کذاب اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کیا جاسکے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے فساد پھیلنے کا خطرہ ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کے نبوت کے جھوٹے دعوے کی وجہ سے مذہبی حلقوں اور عام لوگوں میں خت غم و غصہ پایا جاتا ہے بلکہ شہر ہے کہ وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں بھی ملوث تھا۔ تاہم وہ لوگ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ غالباً“ کوئی خفیہ راستہ تھا۔“

انہوں نے بہت دیر سے روکی ہوئی سانس کو خارج کیا اور ان کی نظریں سیرا سے ملیں جن میں شکوک کے سائے لہراتے نظر آئے تھے انہیں بے اختیار نفی میں ان کا سر ہلا۔

”ابو! چائے لے لیں۔“

سیرا کی آواز نے کمرے کے کونٹ کو توڑا۔ انہوں نے چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور زیدہ کی

طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہت آہستگی کے ساتھ نکل نکل کر ان کے رخساروں پر سے ہوتے ہوئے گر کر ان تک آ رہے تھے۔

”تم نے اپنی امی کو چائے نہیں دی۔“

انہوں نے ریموٹ سے ٹی وی بند کرتے ہوئے خود کو بچانے کی کوشش کی۔

”نہیں! انہوں نے منع کر دیا تھا۔“

”زیدہ! بہت رو۔ اس طرح اللہ رحم کرے گا اس پر بھی اور ہم پر بھی۔“

انہوں نے چائے کا کپ بھی ٹرے میں رکھ دیا اور زیدہ کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی۔ زیدہ اسی طرح بیٹھی تھیں اور آنسو پونہ خاموشی اور آہستگی سے بہہ رہے تھے۔ سیرا پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

”ابو! کیا رضی بھی۔۔۔ رضی بھی ان کے ساتھ ہو گا؟“

”پتا نہیں۔۔۔“ انہوں نے سیرا کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ زیدہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”ابو! اگر پولیس والے کامیاب ہو جاتے تو کیا وہ رضی کو بھی پکڑ لیتے۔۔۔ جیل میں ڈال دیتے؟“

سیرا کے ذہن میں بہت سارے سوالوں کے بھنور بن اور ٹوٹ رہے تھے۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ابو سے کیا پوچھ رہے تھے۔ وہ کیا جانتا چاہتی تھی اسے ابھی یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کون سا اپنی بڑی ہو گئی تھی۔ فرسٹ ایر کی طالبہ ہی تو تھی۔ بے شک زیدہ کی تربیت اور گھر کے ماحول نے اسے اپنی ہم عمر لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ ہر دیا۔ زیادہ سمجھ دار بنایا تھا۔ پھر ابھی یہ سب جوانی کے ساتھ ہوا تھا وہ اسے سمجھ نہیں پاتی تھی۔

”ابو! کیا آپ کو پتا تھا کہ رضی اور وہ لوگ کہاں ہیں؟“

سیرا مطلب ہے اس گھر کا پتا تھا آپ کو؟

بہت دیر سے وہ سوال جو اس کے ذہن میں کلبل رہا تھا لبوں پر آگیا۔ آنکھوں کے سامنے خت پوش پر پردا ہوا پتہ تو لایا تھا۔

”نہیں! مجھے اس گھر کا علم نہیں تھا۔“ انہوں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کماور ہاتھ بڑھا کر زیدہ کے آنسو پونہ پچھے چاہے۔

سیرا کھڑی ہو گئی۔

”ابو۔۔۔“ اس نے ٹرے اٹھاتے ہوئے چائے کے کپ کو دیکھا جو اس طرح بھرا ہوا تھا۔

”جے جاؤ بیٹا! کچھ کھانے پینے کو جی نہیں چاہتا۔“

”ابو! اس نے پھر کہا۔“ اگر کبھی رضی کے کسی ٹھکانے کا پتا چلے تو اکیلے جانے کے بجائے مجھے بھی ساتھ لے جائے گا۔ وہ میری بات ضرور سنے گا اور سمجھے گا بھی۔“

اس کے لہجے میں یکدم ہی ایک یقین سا، مان سا آ گیا تھا۔ انہوں نے سر ہلادیا اور وہ ٹرے اٹھائے کمرے سے باہر چلی گئی تو ایک گھبرا سانس لیتے ہوئے انہوں نے زیدہ کے بازو سے ہاتھ ہٹا لیا۔

”میں کچھ دیر بیٹوں گا زیدہ! اگر آنکھ لگ گئی تو عشاء کے لیے جگاں بنا۔“

زیدہ نے دونوں ہاتھوں کی پشت سے چہرہ صاف کیا اور دروازہ کھول کر باہر چلی گئیں تو انہوں نے لپکتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

”پتا نہیں کون تھا وہ جس نے خبری کی۔ چاہتے تو وہ بھی تھے لیکن بہت نہ کہا ہے تھے۔ پتا نہیں اب کہاں گئے ہوں گے وہ لوگ۔“

یونہی سوچتے سوچتے جانے کب ان کی آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ وہ زیدہ کے جگانے پر ہی اٹھے تھے اور عشاء بڑھ کے دعا مانگتے ہوئے انہوں نے عہد کیا تھا کہ آج کے بعد وہ رضی کے متعلق سوچیں گے بھی نہیں۔ یہی سمجھیں گے کہ ان کا کوئی بیٹا تھا ہی نہیں۔ وہ نہ تو اسے تلاش کریں گے اور نہ اس کے پیچھے بھالیں گے۔ لیکن یہ عہد کرتے ہوئے وہ ہرگز نہیں جانتے تھے کہ وہ اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکیں گے۔ لوگ انہیں بھولنے نہیں دیں گے۔ نماز پڑھ کر وہ خاموشی سے بیڈ پر آکر لیٹ گئے اور کوٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگے تھے۔



اگلی صبح وہ معمول کے مطابق اٹھے تھے پچھلے کئی دنوں کی طرح انہوں نے گھر میں ہی نماز پڑھی اور جب تیار ہو کر دفتر جانے کے لیے باہر نکلے تو گلی کے کنارے انہیں فیاض صاحب مل گئے۔

”ارے حسن رضا صاحب! آج کل کہاں ہوتے ہیں آپ۔ مسجد میں بھی نظر نہیں آتے۔“

”جی بس کچھ طبیعت خراب تھی۔“

”احمد بھی نظر نہیں آیا کئی دنوں سے۔ کہیں گیا ہوا ہے کیا؟“

”جی! انہوں نے قدم آگے بڑھانا چاہا۔“

”وہ میں نے سنا تھا۔“ انہوں نے اوھر اوھر دیکھا اور زوارانہ انداز میں بولے۔

”وہ جو بے ٹاننا کرانے والے کا بیٹا علی۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا کہ احمد رضائی کی تصویر چھپی تھی اخبار میں۔ کسی جھوٹے نی کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔ کیا سچ ہے یہ؟“

ایک لمحہ کے لیے انہیں اپنا سانس رکنا ہوا محسوس ہوا تھا لیکن انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے فیاض صاحب کی طرف دیکھا۔

”میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جب واپس آئے گا پتا چلے گا۔“

”کہاں گیا ہوا ہے؟“

فیاض صاحب کی متحس نظر میں جیسے انہیں اپنے وجود میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”رحیم ہار خان گیا ہوا ہے۔“ انہوں نے قدم آگے بڑھائے۔

”دفتر سے دیر ہو رہی ہے ان شاء اللہ پھر ملاقات ہو گی۔“ وہ فیاض صاحب کی بات سنے بغیر آگے بڑھ گئے۔

اب پتا نہیں فیاض صاحب نے ان کی بات کا یقین کیا تھا یا نہیں لیکن۔

یہ تو ہونا ہی تھا۔ ایسی باتیں بھی بھلا کبھی چھپی ہیں۔

آج فیاض صاحب نے پوچھا، کل ملک صاحب استفسار کریں گے، پھر کوئی اور پھر محلے کی عورتیں آکر زبیدہ کو کہیں گی۔

وہ سر تھام کر اسٹاپ پر موجود بیچ پر بیٹھ گئے۔

اب انہیں بہت ساری نظروں کا سامنا کرنا تھا۔ ترس کھاتی، ہمدردی، حسداتی۔ طنز کرتی مذاق اڑاتی ہر طرح کی نظریں۔ وہ چاہتے ہوئے بھی احمد رضا کو اپنی زندگی سے نہیں نکال سکتے تھے۔ اس کی ولدیت کے خاتمے میں ہمیشہ ان ہی کا نام رہنا تھا۔

اگلے کئی دن تک خاموشی رہی۔ فیاض صاحب کے بعد کسی نے ان سے احمد رضا کے متعلق کچھ نہیں پوچھا تھا۔ یوں بھی انہوں نے خود کو گھر اور آتش تک محدود کر لیا تھا۔ اب وہ ساری نمازیں گھر میں ہی پڑھ رہے تھے۔ گھر میں اخبار نہیں آتا تھا اب لیکن دفتر میں وہ اخبار ضرور پڑھتے اور اسماعیل کے متعلق دی گئی چھوٹی سی خبر کو بھی وہ کئی کئی بار پڑھتے یوں ہی بلاوجہ۔

پھر پتا نہیں کہاں سے کچھ بیلا رازی قسم کے صحافی ان کی کھوج لگا کر ان کے گھر تک پہنچ گئے۔

”احمد رضا آپ کا بیٹا ہے؟“

”جی! وہ اس کی ولدیت سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔“

”کہاں ہے؟“

”مجھے علم نہیں۔“

”کیوں؟“ صحافیوں کی متحس نظریں انہیں کھوج رہی تھیں۔

”میں نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔“

ہم نے اس پر دوس سے سنا ہے وہ بڑا فرماں بردار اور مہذب بچہ تھا۔ پھر وہ گھر سے نکالنے کی؟“

”ابلیس بھی پہلے اللہ کا بہت عبادت گزار اور برگزیدہ تھا۔“

”کیا آپ سے رابطہ ہے ان کا؟“

”نہیں۔“ وہ ان سے جان چھڑانا چاہتے تھے لیکن وہ تو جیسے انہیں زنج کر رہے تھے۔

”یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ گھر والوں سے رابطہ نہ رکھے؟“

”میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں اسے گھر سے نکال چکا ہوں۔“

”اوہ ہاں!“

بڑی مشکل سے انہوں نے ان سے جان چھڑائی لیکن پھر تو جیسے سب کے لیے راستے کھل گئے تھے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی چلا آتا۔ کبھی دفتر میں کبھی گھر میں، ایک صحافی تو ان کا انٹرویو کرنا چاہتا تھا اور بار بار اصرار کر رہا تھا۔

”کیا یہ میرا گناہ ہے کہ اللہ نے مجھے اس کا بیٹا بنایا؟ ہر آدمی کو اپنے حصے کا بوجھ اٹھانا ہے۔ اسے اٹھانے والا اس سے جا کر ملو۔ اس سے پوچھو جو پوچھنا ہے۔“ وہ تنہا ہوئے تھے۔

”سر! وہ کہاں ملیں گے۔ کوئی پتا ٹھکانہ ہے تو لکھوا دیں۔“

”اللہ کا واسطہ! میری جان چھوڑ دو۔ ہمارے لیے وہ مرچا ہے۔ اسی روز مرچا تھا۔ جب اس نے اس ملعون کی تعریف کی تھی اور اسے سچا قرار دیا تھا۔“

انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور اندر ڈرائنگ روم کے دروازے کے پاس کھڑی سمیرا کانپ گئی تھی۔

”نہیں! وہ ہمارے لیے بھی کہیں مر سکتا۔ ہمارے لیے وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ بھلے وہ جہاں بھی رہے۔“

اگلے بہت سارے دن وہ بہت زیادہ مصروف رہے تھے۔ آتش سے اٹھ کر وہ مختلف پرائیویٹ میگزینز کے پاس جاتے رہتے تھے۔ گھر میں انہوں نے کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اندھیرا پڑنے پر ہی وہ گلی میں قدم رکھتے تھے اور اوھر اوھر دیکھے بغیر سر جھکائے اپنے گھر کی طرف بڑھ جاتے۔ اگر کوئی سلام کرتا تو یوں ہی سر جھکائے سلام کا جواب دیتے۔ انہیں لگتا تھا جیسے محلے کا ہر فرد انہیں ہمدردی اور ترحم سے نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ کبھی لگتا جیسے سب کی آنکھوں میں ان کے لیے نفرت اور تمسخر ہے۔ کچھ بڑے بیل گلی میں وہ سر اٹھا کر خنجر سے چلتے اور لوگوں کی سبکدوشی وصول کرتے تھے۔

”بہت مذاق اور اچھے بچے ہیں۔ بہت خوش نصیب ہیں آپ۔ نیک اولاد بھی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔“

جنتاب! وہ ایسے ہی جملے اب تک سنتے رہے تھے۔ اور اب لوگ انہیں مشورہ دیتے کہ اخبار میں اشتہار دے دو کہ میں نے اپنے بیٹے کو عاقی کر دیا ہے۔ وہ مشورہ دینے والوں کو حیرت سے دیکھتے۔

”میں اس کا جواز نہیں ہوں۔ وارثوں کو ان کے حق سے محروم کرنے کا اختیار اللہ نے ہمیں نہیں دیا۔“

گھر میں اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔

اس روز انہیں معمول سے بھی زیادہ دیر ہو گئی تھی۔ نیل ہوئی تو سمیرا بھاگ کر گیٹ تک آئی تھی اور حسن رضا کو دیکھ کر ایک اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے اس نے ہمیشہ کی طرح دور تک گلی میں دیکھا تھا۔ گلی خالی تھی۔ گیٹ بند کر کے جب وہ برآمدے میں آئی تو حسن رضا تخت پر بیٹھ چکے تھے اور جھک کر جوتے اتار رہے تھے۔ سمیرا نے جلدی سے تخت کے نیچے سے ان کے چپل نکال کر سامنے رکھے۔

انہوں نے سمیرا کی طرف دیکھا۔ ان چند ماہ میں اس کی رنگت پھیک پیڑ گئی تھی۔ آنکھوں کی وہ شبنم چمک ماند پڑ گئی تھی۔

جب سے احمد رضا گیا تھا۔ انہوں نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہیں دیکھی تھی۔ ایک گمراہ سانس لیتے ہوئے انہوں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔

بہت پہلے کی بڑھی ہوئی نظم کے چند مصرعے ان کے ذہن میں آئے تو انہوں نے زیر لب دہرایا۔

”یہ دنیا کب اجڑ جائے ہو اسور کرتی ہے مگر خطرے کی آگ کتنی کہیں بجتی ہی رہتی ہے کے معلوم ہے لیکن ذرا سی نفرت پیاسے توازن کب بڑھ جائے یہ دنیا کب اجڑ جائے۔“

انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے سارے گھر پر نظر



یہ گھر۔ یہاں ان کی زندگی کے کتنے بہت سارے سال گزرے تھے۔ زیدہ نے کیسے کیساں ڈال ڈال کر اور اپنا زور بچ کر یہ گھر خریدا تھا۔ اسی گھر میں احمد رضا اور سیرا پیدا ہوئے۔ بڑی گئی تھی ان کی دنیا بھی۔

سیرا نے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

”ابو کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک ہے نا؟ رضی ٹھیک ہے نا؟ آپ نے کیا کیا ہے اس کے ساتھ؟“

سیرا کے اندر کا زور زبان پر آگیا اس نے ان کا بازو پکڑ کر جھجھوڑا۔

”اس نے اپنے ساتھ خود جو کچھ کر لیا ہے اس کے بعد اور کیا ہو سکتا تھا؟“

انہوں نے سر جھکا لیا اور تخت پر بڑی اس کی کتابوں کو دیکھا۔

”تم یہاں سردی میں بیٹھ کر پڑھ رہی تھیں۔ کل بھی تم سے کہا تھا۔ موسم بدل گیا ہے۔“

”جی ابو!“ وہ خود کو سنبھال کر کناٹیں سمیٹنے لگی۔

”کتنی ڈسٹرب ہو گئی ہے۔ پہلی بار اس کا ڈسٹربسٹ کا رزلٹ اس طرح آیا ہے۔ پچاس فیصد تو بھی زندگی میں غیر نہیں لیے تھے۔ ہمیشہ اسی فیصد سے زیادہ ہی لیتی تھی۔“

”تو میں نے جو فیصلہ کیا وہ صحیح ہے۔“

مشکل مرحلہ سیرا اور زیدہ کو اس فیصلے سے آگاہ کرنے کا تھا جو انہوں نے رات کے کھانے کے بعد کر لیا۔ زیدہ اور سیرا خاموش بیٹھی انہیں دیکھتی رہیں۔

”کیا اس کے بغیر کوئی اور چارہ نہیں تھا؟“ زیدہ نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”نہیں۔“ انہوں نے زیدہ کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا اور وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ زیدہ اس گھر کے لیے بہت خوار ہوئی تھیں۔ بہت پشیمانی تھیں

انہوں نے۔ جب فرسٹ فلوور برکرا اور واش روم وغیرہ بن رہا تھا تو سیرا اور احمد رضا کتنے خوش تھے۔

”اور اگر وہ واپس آیا نہ ہو تو؟“

”وہ اب واپس نہیں آئے گا زیدہ! اسے دولت کی

ہوس اور لالچ کے سانپ نے ڈس لیا ہے۔“

”پھر بھی، ہم اسے یاد آئے تو؟“

”تو۔۔۔ اللہ کو منظور ہوا تو کوئی سبب بتا دے گا۔“

انہوں نے اب بھی زیدہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ سیرا اس دوران ہاتھ گود میں دھرے ساکت بیٹھی رہی۔ انہوں نے ذرا کی ذرا اس کے چہرے پر نظر ڈالی تھی۔ وہ پتھروں جیسی سنجیدگی چہرے پر سجائے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ہولے سے کھنکھارے۔

”یہ ضروری تھا زیدہ! بے حد ضروری۔ یہاں جونا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن چلے آتے تھے احمد رضا کا بوجھ۔ اور اب تو ایک بار پھر کالم نگاروں نے لکھنا شروع کر دیا ہے۔“ سیرا نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”کل کے ایک اخبار میں ایک کالم نویس نے صرف احمد رضا کے متعلق لکھا ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

”کیا وہ اتنا اہم ہو گیا ہے وہ تو ایک معمولی مرید ہے۔“ اس نے سوچا۔

”کل دو صفائی میرے دفتر میں آئے تھے اور اب آتے رہیں گے۔ خبر رکھوں گا۔ تم فکر نہ کرو زیدہ! جب بھی موقع ملا پتا چلا۔ میں خود جا کر اسے لاؤں گا۔“

زیدہ نے پھر کچھ نہیں کہا۔ وہ یونہی خاموش بیٹھی رہیں۔

”تم کل لیونگ سٹریٹفیکٹ کے لیے درخواست دے دینا۔“

”ہم کہاں جائیں گے ابو!“ سیرا نے پہلی بار بات کی۔

”راولپنڈی یا اسلام آباد۔ تاکہ تمہاری پڑھائی اچھے اداروں میں ہو سکے۔“

سیرا بنا کچھ کے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ صرف کچھ ڈیڑھ کلچ میں ایڈمیشن لینے کے شوق میں اتنی محنت کر رہی تھی کہ اس کا میرٹ بن جائے اور کسی سفارش کے بغیر اسے ایڈمیشن مل جائے اور یہ شوق اس وقت سے اس

بلکہ دفتر سے نزدیکی مارکیٹ میں چلے جاتے اور وہاں سے سب کچھ لے آتے تھے۔ آج بھی اسٹور کی طرف جاتے جاتے وہ ٹھکے لیکن پھر سر جھکائے اسٹور پر آ گئے۔

”ایک درجن انڈے اور ڈبل روٹی دو دینا۔“ اسٹور کے مالک نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”ارے رضا صاحب! آپ بڑے دنوں بعد آئے۔ خدا نخواستہ طبیعت تو خراب نہ تھی۔“

”طبیعت خراب نہ ہو تو کیا ہو سکتی!“ ان کے بڑوسی قاضی صاحب بھی وہیں کھڑے تھے۔ ”جوان بیٹا اس عمر میں جھوڑ کر چلا گیا اور وہ بھی ایک مرتبہ دین کا فر شخص کے پیچھے۔ ہم تو شکر کرتے ہیں کہ ہمارے بیٹے نے ایک لڑکی کے لیے ہی گھر چھوڑا، کم از کم دین تو خراب نہیں کیا اپنا۔“ انہوں نے بنا کچھ کے پیسے ادا کیے اور ڈبل روٹی اور انڈے لے کر گھر کی طرف پلٹ گئے۔

”بے چارے رضا صاحب۔“ انہوں نے اپنے پیچھے اسٹور والے کی آواز سنی تو تیز تیز چلنے لگے۔

پھر مزید چند دن لگے تھے سب کچھ طے کرنے میں۔ گھر تک گیا اور جب سے انہوں نے اسٹور والے دیا تھا۔ کچھ سال ہی رہ گئے تھے ریٹائرمنٹ میں بھی۔

دفتر کے ساتھیوں نے سمجھا۔ باس نے کمرے میں بلا کر وجہ پوچھی۔

انہوں نے وجہ نہیں بتائی تھی۔ پھر راولپنڈی شفٹ ہونے سے پہلے انہوں نے دو دن مکمل بائس بازار سے آگے والے اس مکان کا چکر لگایا تھا۔ جہاں احمد رضا رہتا تھا لیکن مکان کو نالا لگا ہوا تھا۔ وہ طیب خان کے ٹھکانے پر بھی گئے تھے لیکن وہاں بھی نالے کے ساتھ ایک نوٹ لگا ہوا تھا۔

”کرائے کے لیے خالی ہے۔“ وہ یہ شہر چھوڑنے سے پہلے ایک بار اس سے ملنا چاہتے تھے۔ زیدہ اور سیرا سے ملوانا چاہتے تھے۔ لیکن پتا نہیں کہاں گم ہو گئے تھے وہ سب

کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ جب وہ ایک بار رحیم یار خان گئی ہوئی تھی اور اب اسے لے کر اپنی چھوٹی زاد بہن کے گھر گئے تھے۔ وہاں اس نے ایک بہت باوقاری عورت کو دیکھا تھا۔ جو اسے بے حد اداسی لگتی تھیں۔ وہ تب چھوٹی سی تھی، آٹھ نو سال کی شاید اور اب اسے بتایا تھا کہ یہ آپاکی بیٹی ہیں۔ بہت لائق اور ذہین ہیں۔ انہوں نے میٹرک میں ٹاپ کیا تھا۔ ان کے ابا تپ لاہور میں ملازمت کرتے تھے اور پھر انہوں نے سرنہ ڈکلیج سے ایف ایس سی کیا اور پھر ان کی شادی ہو گئی رحیم یار خان کے قریب ہی ایک گاؤں میں۔ ان کے تین بچے بھی تھے دو بیٹے ایک بیٹی۔ ابو جب ان کے متعلق بتا رہے تھے کہ وہ کنیر ڈس پڑھتی تھیں تو ان کے لہجے میں بڑا غر تھا اور تب ہی اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بھی کنیر ڈس پڑھے گی اور پھر ابو اس کے متعلق بھی غرتے بتایا کریں گے کہ میری بیٹی نے کنیر ڈ کالج سے پڑھا ہے۔

وہ کمرے سے چلی گئی تھی اور زیدہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں بالکل غیر ارادی طور پر حسن رضا نے آٹھ کر دو واڑہ چھول کر باہر دیکھا۔ وہ سر جھکائے سر دھریاں چھ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کھڑے اسے رک رک کر میڑھیاں چڑھتے دیکھتے رہے۔ وہ جب اوپر جا رہی تھی تو اس کی آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی صورت میں بہ رہے تھے۔

حسن رضا ایک آہ بھر کر واپس کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے اس کے پیچھے جانے کا سوچا تھا لیکن پھر نہیں گئے۔ اچھا ہے اکیلی رو کر بھڑاس نکال لے۔ بیڈ پر بیٹھے ہوئے انہوں نے زیدہ کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی حسرت سے کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ زیادہ دیر تک زیدہ کا حسرت بھرا چہرہ نہ دیکھ سکے اور ایک دم واپس مڑے۔

”میں ذرا مارکیٹ تک جا رہا ہوں۔ صبح سیرا نے انڈے اور ڈبل روٹی لانے کے لیے کہا تھا، یاد نہیں رہا۔ گیس باہر سے لا کر جاؤں گا۔“

بہت دنوں سے وہ ٹھکے کے اسٹور پر نہیں گئے تھے۔

”خواتین ڈائجسٹ فروری 2013 203“



شاید ملک چھوڑ گئے ہوں، انہوں نے سوچا تھا۔  
لیکن انہوں نے ملک نہیں چھوڑا تھا اور اس وقت  
بھی جب وہ اس مکان کے سامنے سے مایوس ہو کر  
واپس جا رہے تھے، اسی گلی کے ایک اور مکان کے  
بیسمنٹ میں وہ الوینا کے ساتھ بیٹھا ہوا پوچھ رہا تھا۔  
”کب تک الوینا کب تک ہم یوں اندر گراؤنڈ  
رہیں گے؟ کم از کم مجھے تو جانے دو۔ مجھے اپنے گھر  
والوں سے ملنا ہے۔“

”تمہیں کیسے جانے دیں؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟  
تمہارے ذریعے انہیں ہم تک پہنچنے میں تھوڑی دیر  
بھی نہیں لگے گی۔“  
”میں رات میں کسی وقت یہاں سے نکل جاؤں  
گا۔“

”رات میں۔۔۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ وہ تمہارے گھر کی  
نگرانی نہیں کر رہے ہوں گے۔“  
وہ ہولے سے ہنسی تھی۔

”تم لوگ فون بھی نہیں کرنے دیتے مجھے گھر میں  
تاکہ میں اپنے امی ابو کو اپنی خیریت بتا سکوں۔ تم اندازہ  
کر سکتی ہو۔ وہ میرے لیے نئے پریشان ہوں گے۔“  
”نہیں۔“ الوینا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

”اس لیے کہ میں نے ماں باپ کی محبت نہیں  
دیکھی۔ کسی بھی رشتے کی محبت نہیں دیکھی میں نے،  
پھر بھی تمہاری حالت سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔ اچھا  
تم فکر نہ کرو۔ آج میں رچی سے بات کرتی ہوں کہ تم  
فون کر سکو گھر۔“

اس نے ہولے سے اس کا بازو دبایا اور اس کی  
طرف دیکھ کر مسکرائی۔

”ہم حالات کا جائزہ لے رہے ہیں احمد! جیسے ہی  
حالات بہتر ہوتے ہیں، تم گھر جاسکو گے۔ یوں بھی  
تمہارا اور باپ سب کا سپورٹ بن گیا ہے۔ جلد ہی ہم  
کسی اور ملک میں چلے جائیں گے۔“  
”لیکن مجھے کہیں نہیں جانا۔“

”ہاں ہاں ٹھیک ہے مت جانا۔ یہ تو اس لیے کہ  
رہی ہوں کہ کیا خبر حالات کیا ہوں۔ جانا پڑے۔ اوکے!

تم ٹی وی سے دل بہلاؤ۔ میں ذرا حضرت جی کی طرف جا  
رہی ہوں۔“

وہ چلی گئی تو وہ لیٹ گیا۔ اس کا ٹی وی دیکھنے کو ہی  
نہیں چاہ رہا تھا۔ کتنے سارے دن ہو گئے تھے یہاں بند  
ہوئے۔ اس روز اسے تقریب کے بعد گھر جانا تھا جس  
میں رچی اور اس کے ساتھیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔  
اسامیل خان نے اسلام کے حوالے سے تقریر کی  
تھی۔ بڑی پراثر تقریر کی تھی۔ وہ متاثر سا بن رہا تھا،  
جب اسامیل خان نے کہا۔

”دنیا گمراہی کے اندھیرے میں گھر چکی ہے اور یہ  
قانون قدرت ہے کہ جب بھی گمراہی بہت زیادہ پھیل  
جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اصلاح کے لیے  
اپنے پیارے بندوں کو پیغمبر بنا کر بھیجتا ہے اور وہ بنی  
نوع انسان کو گمراہی کے اندھیرے سے نکال لیتا ہے۔  
اب ایک بار پیغمبر دنیا گمراہی کے اندھیروں میں ڈوب چکی  
ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کی اصلاح کے لیے  
بھیجا ہے کہ ہم انہیں سیدھا راستہ دکھائیں۔ صبح اور  
غلط میں فرق بتائیں اور۔۔۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ آپ نعوذ باللہ پیغمبر ہیں؟“  
کسی نے کہا تھا۔ احمد رضائے چونک کر کہنے والے کو  
دیکھا تھا۔

”نہیں۔“ وہ یکدم کھڑا ہوا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ  
وآلہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں اور ان کے بعد نبیوں  
اور پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔“

”بیٹھ جاؤ احمد رضا! پاس بیٹھے طیب خان نے اس  
کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا۔ اس طرح حضرت صاحب کی گفتگو  
کے دوران انہیں نوکناخلاف ادب ہے۔

”لیکن وہ شخص۔۔۔“ اس نے مڑ کر اس شخص کو دیکھا  
چلا تھا جس نے بات کی تھی لیکن وہ محفل میں اسے  
نظر نہیں آیا۔ اسامیل خان دونوں ہاتھ رخساروں پر  
ہولے ہولے مارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”توبہ۔ توبہ! کہاں میرے آقا و مولا حضرت محمد  
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام و مرتبہ کہاں مجھ جیسا  
ناچیز حقیر۔۔۔ ارے میں تو ان کے قدموں کی خاک ان

کی گلی کا کتا۔“

”کیا یہ سب بہرہ پیسے ہیں اور میں بہرہ پیسوں میں  
پھنس گیا ہوں؟“

احمد رضائے پہلی بار سوچا تھا اور تب ہی ایک دم ہال  
کا دروازہ زور سے کھلا۔ ایک شخص جو غالباً ”گاڑو“ تھا اور  
دروازے پر ڈیوٹی دے رہا تھا اندر آیا۔

”پولیس۔۔۔ وہ گلی میں داخل ہو رہے ہیں اور مکان  
کو گھیرے میں لینا چاہتے ہیں۔“ الوینا اور دوسری  
لڑکیاں جو اسامیل خان کے پیچھے کھڑی تھیں تیزی سے  
اسامیل خان کے ساتھ پردے کے پیچھے غائب ہو  
گئیں۔ طیب خان نے حیران بیٹھے احمد رضا کا ہاتھ پکڑا  
اور پھر وہ سب دوڑتے ہوئے مکان کے پچھلے حصے میں  
بنی ایک کوٹھری میں آگئے تھے جس میں سے ایک  
دروازہ باہر ایک تنگ سی گلی میں کھل رہا تھا۔ وہ ایک  
ایک کر کے اس گلی میں آگئے۔ یہ کل گیارہ افراد تھے۔  
باقی شریک محفل افراد وہیں ہال میں رہ گئے تھے۔  
”غیر سی سے اس سامنے والے مکان میں چلو۔“

طیب خان نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ مکان کا  
دروازہ ایک دستک سے کھل گیا تھا۔ یہی اس مکان کا  
پچھلا دروازہ تھا۔ پھر وہ اس مکان کی بیسمنٹ میں چلے  
گئے تھے کیونکہ اس وقت تک پولیس نے مکان کا  
گھیراؤ کر لیا تھا اور گلیوں میں پھیل گئے تھے۔ پھر وہ  
تین دن وہ اسی مکان کے تہ خانے میں رہنے کے بعد  
ایک رات یہاں اس مکان میں منتقل ہوئے تھے اور  
اب تک یہیں تھے۔

زندگی نے یہ کیسا کھیل کھیلا تھا اس کے ساتھ۔  
”کہیں کچھ غلط ہو رہا ہے میرے ساتھ۔“

وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔

بہت غلط لیکن اب وہ اس غلط کو صحیح کرنے پر قادر  
نہیں رہا تھا۔ کم از کم کیلئے وہ اس غلط کو صحیح نہیں کر  
سکتا تھا۔ اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی کسی اپنے  
کی۔ ابو سمیرا امی۔

یہی تین افراد تھے جن کے سارے وہ اس غلط کو  
صحیح کر سکتا تھا۔ وہ اس کے اپنے تھے۔ اسے ہر قیمت پر

گھر جانا تھا۔ وہ اٹھا اور چپل پہن کر باہر نکلا۔ اس تہہ  
خانے میں تین چار چھوٹے کمروں کے علاوہ ایک بڑا  
ہال بھی تھا۔ ان کمروں کے دروازے اس ہال میں کھلتے  
تھے۔ اوپر گراؤنڈ فلور پر جانے کے لیے سیڑھیاں اسی  
ہال سے گزرتی تھیں۔ ہال میں الوینا کھڑی تھی اس نے  
مڑ کر احمد رضائی کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔

”آؤ۔۔۔ گھر فون کرلو۔ میں نے رچی سے بات کی  
ہے۔ تسلی ہو جائے گی اور پتا بھی چل جائے گا کہ  
تمہارے گھر کی نگرانی ہو رہی ہے یا نہیں۔“

وہ الوینا کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ سیڑھیوں  
کے سرے پر دروازہ تھا۔ الوینا نے تین بار دروازے پر  
دستک دی تھی تب دروازہ کھلا۔ اس نے اندر قدم  
رکھا۔ یہ ایک چھوٹی سی لابی تھی اور لابی کے اختتام پر  
لاؤنج تھا۔ سامنے لی وی لگا تھا اور صوفوں پر رچی اور  
اس کے ساتھی بیٹھے ڈرنک کر رہے تھے۔ جب سے وہ  
اس مکان میں چھپے تھے۔ پہلی بار وہ اور آیا تھا۔ رچی کا  
اسلامی نام اگرچہ عبداللہ رکھا گیا تھا لیکن وہاں سب  
ابھی تک اسے رچی ہی بلاتے تھے اور اس نے بھی کبھی  
منع نہیں کیا تھا۔ رچی نے سر اٹھا کر اس کی طرف  
دیکھا۔

”ہیلو۔“ الوینا نے رچی کی طرف دیکھا۔  
”احمد کو فون کرنا ہے۔“

”کیوں نہیں۔۔۔ کیوں نہیں۔“ اس نے فون  
اسٹینڈ کی طرف اشارہ کیا، تیزی سے فون کی طرف  
پڑھا تھا۔ پھر اس کی انگلیاں بے باکی سے نمبر ملانے  
لگیں۔

دوسری طرف بیل جا رہی تھی لیکن کسی نے فون  
ریسپونڈ نہیں کیا تھا۔

”بھلا اس وقت کہاں جاسکتے ہیں۔ ابو بھی دفتر سے آ  
چکے ہوں گے۔ سمیرا امی۔“

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ پھر نمبر ملایا  
تھا۔ شاید امی اور سمیرا بچن وغیرہ میں ہوں۔

”شاید ان کا فون خراب ہے۔“  
الوینا نے اس کے چہرے پر پھیلی مایوسی کو دیکھ کر



تلی دی۔

پھر وقفہ وقفہ سے اس نے کئی بار نمبر ملایا۔ کبھی تیل ہوئی کبھی ایندھن کی تیل ہونے لگتی۔  
”فون ہی خراب ہے۔“

اس نے مایوس سے سوچا اور ایک بار پھر نمبر ملانے لگا لیکن اس بار وہ کمپلین کروا رہا تھا۔ رچی نے چونک کر اسے دیکھا۔

”جی فون خراب ہے۔ پتا نہیں کب سے۔۔۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں نے تو ابھی فون کیا ہے اس نمبر پر“ ایندھن نہیں ہو رہا۔ ”وہ تینوں چاروں اس کی طرف متوجہ تھے۔

”جی ٹھیک ہو کب تک ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ ریسور کریٹل پر ڈال کر مڑا اور الوینا کی طرف دیکھا۔  
”فون ہی خراب ہے۔ کہہ رہے ہیں جلد ٹھیک کر دیں گے۔ لیکن پتا نہیں کب کریں گے۔“  
رچی نے الوینا کو اشارہ کیا۔  
”ہو جائے گا کبہاؤ نہیں۔“ الوینا نے اسے تلی

دی۔

”رچی! تمہارا اگر کوئی جانے والا ہو تو تم فون کرو“ ورنہ یہ لوگ برائے کرتے ہیں۔ کمپلین کروا بھی دو تو ہفتہ ہفتہ نہیں آتے۔“ وہ پھر احمد کی طرف مڑی۔  
”چلو پھر پیچھے ہی چلتے ہیں۔ میں چیک کرتی رہوں گی۔ ٹھیک ہوا تو تمہیں بتا دوں گی۔“

وہ الوینا کے ساتھ واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ لیکن اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ باہر چلی فضا میں جانا چاہتا تھا۔

اپنا گھر اپنا محلہ اپنی گلیاں اپنی یونیورسٹی۔۔۔ سب یاد آ رہا تھا اسے لیکن وہ جانتا تھا کہ جب تک ان کی مرضی نہ ہوئی وہ یہاں سے نہیں جاسکتا۔ کوشش کرے تب بھی نہیں۔ سوائے انتظار کرنا تھا اس وقت کا جب یہ لوگ اسے اجازت دیں گے۔

ایک بار وہ یہاں سے چلا گیا تو پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ اس وقت آنے والے محلوں سے بے خبر وہ سوچ رہا تھا۔ پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا، فون ٹھیک نہیں ہو سکا

تھا۔ وہ دن میں ایک بار ضرور کوشش کرتا تھا۔ پورے ایک ہفتے کے بعد الوینا نے اسے کہا تھا کہ ”چلو آج تمہارے گھر چلتے ہیں۔“

وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔  
”میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔“  
”ٹھیک ہے۔۔۔ چلو۔“

اس نے پڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے اور جلدی سے جوتے پہن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا سوٹ کیس کھینچا۔

”یہ سامان بعد میں لے جائیگا۔ ابھی دیکھو وہاں کے حالات کیا ہیں۔ تمہارے ابو شرم سے بہت سخت ناراض تھے۔ انہوں نے تمہیں گھر سے نکال دیا تھا۔“

”ہاں لیکن ابو کا غصہ بہت جلد اتر بھی جاتا ہے۔ میں جب انہیں یقین دلاؤں گا کہ ایسا کچھ نہیں تھا، جو انہوں نے سمجھا تو وہ میری بات کا یقین کر لیں گے۔“  
”اس روز بھی تو تم نے انہیں یقین دلایا ہو گا۔“ الوینا دروازے کی پاس ہی کھڑی تھی۔

”نہیں! اس روز میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں تو بس حیران رہ گیا تھا۔ خیر اب تو امی اور میرا بھی ہوں گی تا میری سفارش کرنے کو۔“ وہ مسکرایا اور پھر ہاتھ اپنے پیچھے کیس کے ہینڈل پر رکھا۔  
”رہنے دو نا پھر لے جانا۔“

”میں اگر نہ آنا چاہوں تو؟“ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

”ایز یوش۔“ وہ بھی مسکرائی تھی۔ ”اب جلدی کرو۔“

”میں خود ہی چلا جاتا ٹیکسی کر کے۔“ میڈھیاں چڑھتے ہوئے اس نے کہا۔

”اب تلفف مت کرو۔“

الوینا اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہ بھی مسکرایا اور جب وہ پورچ میں آیا تھا تو ایک لمحہ کے لیے اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ یوں جیسے مدتوں بعد اس نے سورج کی روشنی دیکھی ہو اور جب تک گاڑی روڈ پر نہیں آئی تھی اسے یقین نہیں آیا تھا کہ

وہ اپنے گھر جا رہا ہے۔ اس کا دل بار بار تیزی سے دھڑکنے لگتا تھا۔  
ای ابو سمیرا۔۔۔ ان کی شکلیں بار بار اس کے تصور میں آ رہی تھیں۔

سمیرا دوڑ دوڑ کر دروازہ کھولے گی۔ اسے لکھ کر چیخ پڑے گی۔ بھاگ کر برآمدے میں جائے گی یا پھر وہیں سے ہی امی کو آواز دے گی۔

”سب کچھ ویسا ہی ہو گا۔ وہی گیٹ، وہی صحن، برآمدہ، وہی برآمدے میں پراخت۔ بھلا اتنے سارے دنوں میں کیا تبدیلی آ سکتی ہے اس نے سوچا تھا۔  
اس نے الوینا کو خدا حافظ کہا۔

”میں یہیں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ کچھ دیر رکوں گی۔ کیا پتا۔۔۔“

اس نے احمد رضا کی طرف دیکھا۔ ”تمہارے ابو راضی نہ ہوں۔ اور تمہیں واپس آنا پڑے۔“

اس نے الوینا کی طرف دیکھا۔ وہ اسے کہنا چاہتا تھا کہ ایسا نہیں ہو گا لیکن پھر کچھ کہنے ہوا آگے بڑھ گیا۔ اتفاق سے کئی میں کوئی بھی واقف کار نہیں ملا تھا۔ وہ سیدھا گیٹ تک آیا اور تیل پر انگلی رکھ دی تھی۔ اندر کہیں تیل ہوئی تھی۔ سمیرا کا تصور کر کے وہ مسکرایا۔  
اتنی دیر تک تیل ہونے پر وہ ضرور جھنجھلا رہی ہوگی پھر گیٹ کھلا اور ایک اجنبی صورت نظر آئی۔

”جی! کس سے ملنا ہے آپ کو؟“  
”حسن رضا صاحب سے۔“ وہ بوکھلا گیا۔

”وہ یہاں سے چلے گئے ہیں۔“  
”کہاں؟“ اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔

”یہ تو پتا نہ۔ ان کا پتا نہ تھا۔“  
”جی ہاں! فروخت کر دیا ہے انہوں نے۔ ہم نے خرید لیا ہے۔“ وہ شخص کہہ رہا تھا۔

”آپ کو ان کا ایڈریس پتا ہے کہاں گئے ہیں وہ؟“  
اس نے پُر امید نظروں سے اسے دیکھا۔

”نہیں۔۔۔ ہمیں تو علم نہیں ہے۔ کہیں کسی دوسرے شہر چلے گئے ہیں شاید۔“

وہ شخص گیٹ بند کر کے چلا گیا تھا لیکن وہ وہیں کھڑا

تھا۔ مایوس اور دل گرفتہ سا۔  
کچھ دیر وہیں کھڑا رہنے کے بعد وہ پلٹا۔ کسی بارے ہوئے جواہر کی طرح سر جھکائے وہ واپس جا رہا تھا۔  
جب حسن رضا صاحب نے کئی میں قدم رکھا اور اسے گیٹ کے پاس سے مڑتے دیکھا۔ اتنی دیر سے بھی انہوں نے پہچان لیا تھا۔ وہ احمد رضا تھا۔

”احمد رضا!“ ان کے لب طے تھے اور دل سینے کے اندر زور سے پھونپھونایا۔ لمحہ بھر کے لیے انہوں نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کسی مکان کی دیوار سے ٹیک لگائی اور پھر پوئنی دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

تمہاری اپنی لکھی ہوئی



فرحت اشتیاق

قیمت - 300 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ  
37، اردو بازار، کراچی  
فون نمبر: 32735021



ڈرائنگ روم کی ہر چیز کو کپڑے سے جھاڑ کر صاف کیا۔  
”توبہ! بارش کے اثرات بھی کیسے ان مٹ ہوتے

ہیں۔“  
رگزر گزر کر فرش پر پونچھا لگاتے وہ بڑبڑاتی۔

”صبح، صبح جینا۔“ ابھی پونچھا لگا کر فارغ ہوئی ہی تھی کہ نایا ابو کی آواز آنا شروع ہو گئی۔ اس نے جلدی جلدی منہ پر چھاپ کے مارے اور دوپٹے سے چہرہ پونچھتے ہوئے اندر بھاگی۔ وہ بستر سے اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ فوراً ”آگے بڑھی۔ سہارا دے کر انہیں بٹھانے کی کوشش کی اور ان کی کمر کے پیچھے ٹکیہ

ساری رات گھن گرج کے ساتھ بجلی چمکتی رہی اور پھر سینہ ایسے ٹوٹ کے برسا جیسے برسوں بعد اسے برسنے کا موقع ملا تھا اور اب وہ صبح سویرے نماز کے بعد صحن میں چل قدمی کرتے ہوئے رات ہونے والی بارش کے بعد کے اثرات کا جائزہ لے رہی تھی۔  
اسے ہمیشہ بارش کے بعد کے مناظر سے وحشت ہونے لگتی تھی۔ بارش کا موسم اکثر اس کے اندر کے کھریٹا تار دیتا تھا اور اس کے اندر کا درد آنسوؤں کی صورت اس کے چہرے پر بکھر جاتا تھا، کیسا دردناک تھا یہ موسم۔ اس موسم سے اس کی اچھی بری ہمت سی

## سمیٹا شریفی طور



درست کر کے سیدھی ہوئی۔

”اسد کہاں ہے؟“ دوسری چارپائی کو خالی پا کر انہوں نے پوچھا تو وہ کمرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے چوٹی۔  
”میں نماز پڑھ رہی تھی، جب نکلے تھے۔ روز اس ٹائم تک آجائے ہیں، مگر ابھی تک نہیں لوٹے۔“  
اسد کے پلنگ کی چادر اٹھا کر جھاڑ کر دوبارہ بچھا دی۔  
سائیڈ ٹیبل پر رکھی اس کی کتابیں ترتیب سے رکھ دیں۔

”تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں، آٹھ بج رہے ہیں۔“ اسے مسلسل کمرے میں مصروف دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔ ”کیا اسکول نہیں جانا؟“

یادیں وابستہ تھیں، جنہیں وہ کوشش کے باوجود فراموش نہیں کر پا رہی تھی۔

بارش کے بعد اسے سب سے زیادہ وحشت اس جس سے ہوتی تھی، جو اس کے اندر باہر اپنا بیڑا کر لیتا تھا۔ اب بھی ہر طرف بھرے پتے گرد اور مٹی سے اٹا مچھن۔ اسے سخت الجھن ہو رہی تھی۔  
”اسکول جانے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے، اتنی دیر میں باہر کی صفائی ہو جائے گی۔“

اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے سوچا اور جھاڑو لے کر صحن کی تفصیلی صفائی میں جت لگی۔ صحن کی اچھی طرح صفائی کر کے فارغ ہو کر برآمدے اور



”جی جاؤں گی، مگر ذرا دیر سے۔ رات کی آندھی اور بارش سے سارا گھر گرد و مٹی سے اٹا اور بکھرا ہوا ہے۔ ہر طرف اتنی گرد ہے، پھٹ پر بھی پانی جمع ہو گیا ہے شاید پرانے کے سوراخ میں کچھ پھرا نکلا گیا ہے، سارا پانی پیڑھوں سے بہتا رہا ہے رات بھر برآمدے کی ہر چیز کیل ہو گئی ہے۔ صحن کی بھی بڑی بڑی حالت ہو رہی تھی۔ اب فارغ ہوئی ہوں۔ ساڑھے نو بجے تک چلی جاؤں گی، گولن سی اتنی اہم نوکری ہے جو چلی گئی تو تم ہو گا۔ وقت گزارنے کے لیے کر رہی ہوں“ صرف آپ کی وجہ سے ورنہ دل نہیں کرتا۔

پوری تفصیل بتا کر آخر میں اس نے اسکول کی نوکری کی طرف سے ہمیشہ کیا جانے والا شکوہ ہرایا۔ وہ خاموشی سے اس کے بیچ چہرے کو دیکھ گئے پھرتی سے چلتے ہاتھ لمحوں میں سارے کمرے کی پریشانی کو ایک ترتیب میں لے آئے تھے۔ انہوں نے ایک گھڑا ساں لیا۔ ان سے بہت بھلا کون جانتا تھا کہ وقت گزارنے کس قدر کٹھن اور مشکل کام ہے۔ ”آپ کو واش روم لے جاؤں؟“ اس نے پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلا گئے۔

”نہیں، اسد آئے گا تو چلا جاؤں گا، مگر وہ کیا کہاں ہے؟ روز صبح نماز پڑھ کر فوراً آجائے گا۔“ ان کے پوچھنے پر اس نے صرف کندھے اچکا دیے پھر کمرے سے نکل آئی، اپنے کمرے کو سمیٹ کر وہ واش روم چلی گئی۔

تیار ہو کر بچن میں آئی تو کھانے کو کچھ بھی دستیاب نہ تھا۔ اسے ایک دم یاد آیا، کھانے پینے کا سامان ختم ہو چکا تھا رات کو اس نے اسد سے کہا تھا کہ وہ صبح کھانے پینے کو کچھ لائے گا تو ناشتا تیار ہو جائے گا، مگر اب اسدی غائب تھا۔

”نہ جانے یہ اسد کہاں رہ گیا ہے۔“ صبح سارا گھر صاف کرنے کے بعد اسے اب زوروں کی بھوک لگی ہوئی تھی۔ دودھ بھی نہیں تھا۔ رات کو اس نے آٹا کوندھ کر فریج میں رکھ دیا تھا۔ جلدی جلدی اس

نے پرائے بنائے ابھی پر اٹھا تو بے کے ساتھ نکل ہی رہی تھی کہ اسد چلا آیا۔ ”میں سوری۔۔۔ صبح دکانیں کھلی ہوئی نہیں تھیں۔ رات ہونے والی بارش سے ہمیں سڑکوں کی حالت کا اندازہ تو ہو گا۔ اگر تم شام کو ہی بتا دیتیں، میں رات کو لے آتا۔ ابھی تو اتنا ہی سامان لایا ہوں شام کو باقی بھی لادوں گا۔“

اس نے تمام شہر دکھانے والی ٹیبل پر رکھ دیے۔ دوسری طرف وہ پرائے اور قہوے کا ناشتا کر رہی تھی۔ ”تم ابھی تک اسکول نہیں گئیں؟“ اسد کو وقت گزرنے کا احساس ہوا تو پوچھنے لگا۔ وہ آخری لقمہ منہ میں ڈال کر قہوے کا ایک براسا کھونٹ لے کر اٹھ گئی۔ ”میں نے پرائے بنا دیے ہیں، انڈے ہوتے تو آلیٹ بھی بنا دیتی۔ رات والا سامان بھی گرم کر دیا ہے، میں نے لیٹ جانا تھا اس لیے ابھی تک ہوں۔ نایا ابو آپ کا پوچھ رہے تھے۔“

تک دھو کر وہ پٹی تو اسے اپنی طرف متوجہ پا کر سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ پھر بھی خاموشی سے دیکھ گیا تو اسے کوفت ہوئی۔

وہ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے پہلے اپنے کمرے میں آئی چادر اور بیگ لے کر وہ نایا ابو کے کمرے میں گئی۔

”اچھا۔ نایا ابو! میں جا رہی ہوں۔“ ”اچھا بیٹا! اللہ حافظ۔“ انہوں نے لینے لینے جواب دیا۔

ابھی وہ گیٹ سے نکل کر چند قدم ہی چلی تھی کہ اسد بھی گیٹ بند کر کے اس کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے قدم اٹھاتا چلنے لگا۔ صبح نے سر اٹھا کر ایک نظر اپنے ساتھ چلتے ہوئے اسد کو دیکھا اور پھر سر ہٹا دی چلی گئی۔

اسد کا یہ روزانہ کام معمول تھا۔ وہ اسے اسکول کے گیٹ تک چھوڑنے جاتا تھا اور وہ ہر روز اس کے ساتھ چلتے چلتے اچھ جاتی تھی۔ یہ چند منٹ کا سفر صبح

کے لیے بڑا دشوار ہوتا تھا۔ چلتے چلتے اچانک اسے یاد آیا تو سر اٹھا کر بولی۔

”نایا ابو کو آج ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے، آپ اسکول مت لے جائیے گا، میں اسکول سے آجاؤں تو پھر ساتھ چلیں گے۔“

اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا تھا مگر اسد کے ہونٹ ایک دم مسکرا اٹھے تھے۔ ”جی اچھا اور کچھ؟“

”جی نہیں۔“ بظاہر سادہ سی مسکراہٹ تھی مگر صبح کے دل پر بڑا برا اثر چھوڑا تھا۔ وہ جواب دے کر مزید تیز قدم اٹھانے لگی۔ تب ہی بے دھیانی میں چلتے اچانک اسے ٹھوکر لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ گرتی، ساتھ چلتے اسد نے بروقت اس کا ہاتھ تھام لیا۔ صبح کو لگا اس کے ہاتھ کو جیسے شعلہ سا چوم گیا ہو۔

”وہاں سے“ آگے پھریے، ابھی گر جاتیں تو۔“ اس نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے انداز میں ایسی سرد مری تھی کہ اسد ایک پل کو ساکت رہ گیا تھا۔

”صبح! ہمیں دو سال ہو گئے ہیں ایک گھر میں رہتے ہوئے، تمہارا میرے ساتھ یہ اجنبیوں والا رویہ کیوں ہے؟ اتنا عرصہ ساتھ رہنے سے ابھی نا آشنا لوگوں میں بھی انسیت اور محبت پیدا ہو جاتی ہے، ہم تو پھر بھی بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں، پھر اتنی بے اعتدالی کیوں؟“

وہ ہمیشہ صبح کے سر دیوے کو نظر انداز کر جاتا تھا مگر آج جیسے اس کا ضبط خراب کیا تھا۔ اسے صبح کے یوں تنفر سے ہاتھ کھینچ لینے سے تکلیف ہوئی تھی۔

صبح خاموشی سے لب بچھے بڑے بڑے قدم اٹھا رہی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا اسکول نزدیک تھا، وہ جلد از جلد اس ہم سفر سے جان چھڑا لینا چاہتی تھی۔ جیسے ہی اس کا اسکول آیا، وہ بغیر پلٹ کر دیکھے اندر داخل ہو گئی۔

اسد اس کے اس رد عمل پر شدید سا کھڑا رہ گیا۔



صبح کو دو سال ہو گئے تھے، نایا ابو کے ہاں آکر رہتے ہوئے اور ان دو سالوں میں اس کے اور اسد کے درمیان اس قدر مختصر گفتگو رہی تھی کہ وہ انگلیوں پر گن کر بتا سکتی تھی، اس کا اسد کے ساتھ رویہ ایسا ہی ہوتا تھا، بے چلک، سخت اور کھردرا۔

بہت کم ایسا ہوا تھا کہ اس نے اسے خود سے مخاطب کیا ہو۔ اگر کبھی وہ مخاطب کرتا تو اس کا رویہ ہمیشہ خراب ہوتا۔

اس کی امی کا انتقال دو سال پہلے ہوا تھا، جب طوفانی موسم میں انہیں ابو اور حماد کی اچانک ناگہانی موت کی خبر ملی تھی۔ ان کے اعصاب پر یہ خبر بجلی بن کر ٹوٹی تھی۔ وہ تو ہوش و حواس ہی کھو چکی تھیں اور پھر کئی ماہ تک اسپتالوں میں خوار ہونے کے بعد وہ اس زندگی سے ہمیشہ کے لیے نا توڑ گئی تھیں۔

اور حماد۔۔۔ حماد کے ساتھ اس کی زندگی کے خوش گوار دن صرف چند ماہ پر محیط تھے، مگر صبح کو لگا تھا کہ ان چند ماہ میں حماد کے ساتھ وہ اپنی ساری زندگی جی گئی تھی۔

حملہ نایا ابو کا بیٹا تھا۔ انتہائی ذمہ دار اور سلجھا ہوا۔ ڈھائی سال پہلے اس کی شادی حماد سے ہوئی تھی۔ وہ کراچی سے بیاہ کر لاء ہوا آئی تھی۔ بچپن سے ہی وہ نایا ابو اور ان کے گھر والوں سے بہت مانوس رہی تھی یہ ہی اسد تھا، جس کے ساتھ اس کی بڑی بے تکلفی تھی اور یہ سنجیدہ و ہمدرد شخص اس کی ہر اوت چٹانگ بات کا جواب انتہائی سلجھے ہوئے طریقے سے دیا کرتا تھا۔

اس کی چشیاں ہر سال نایا ابو کے ہاں لاہور میں گزرتی تھیں۔ نایا ابو اسے چاہتے بھی تو بہت تھے۔

اس کے امی ابو ہمیشہ ان سے شکوہ کرتے تھے کہ انہوں نے صبح کو بگاڑ دیا ہے، عہدی بنا دیا ہے، مگر وہ ہر ماہ اس کی ڈھال بن جاتے تھے۔

حماد سے اس کا تعلق بے تکلف ہونے کے ساتھ



ساتھ بڑا محبوبانہ ساتھ۔ دونوں ایک دوسرے کو بے پناہ چاہتے تھے اور دونوں ہی ایک دوسرے کو پا کر بے پناہ خوش تھے مگر یہ خوشی صرف چند ماہ تک رہی۔ شادی کے بعد پہلی بار وہ اور حماد کراچی گئے تھے امی ابو سے ملنے امی ابو بیٹی اور داماد کو خوش و خرم دیکھ کر بے حد خوش تھے۔ روز سہو تفریح کے پروگرام بنتے تھے۔ صبح ۱۱ بجے باب کی اگلی اولاد تھی سو وہ خوش تھے۔ مگر اس خوشی کو نہ جانے کسی کی نظر لگ گئی تھی۔ ابو اور حماد یوں ہی باہر گئے تھے کہوئے پھرنے پھرنے وہ دونوں اپنے قدموں پر چل کر واپس نہ آ سکے تھے۔ ایک شدید کار اکیسڈنٹ نے ان کا نانا زندگی سے ہمیشہ کے لیے توڑ دیا تھا۔

اگلے کئی ماہ تک وہ بے یقین رہی تھی۔ اوپر سے امی کا اچانک حواس کھو دینا اس سانحے نے ان کے دل پر بڑا برا اثر چھوڑا تھا۔ کئی ماہ تک آیا ابو اپنا گھریا چھوڑ کر اس کے پاس کراچی بھرے رہے تھے۔

راجہ بابی حماد کی جوان موت کی خبر سن کر پاکستان آگئی تھیں انہوں نے بڑی مشکلوں سے اس کو سنبھالا تھا۔

امی کی روز بروز بگڑتی حالت نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد تو اسے لگتا تھا جیسے اس کے پاس چھینے کا کوئی جواز ہی نہیں رہا۔ وہ گھنٹوں قدر خاموشی میں گزار دیتی تھی۔ پھر ہوش آتے ہی بلک بلک کر رونا شروع کر دیتی تھی۔ آیا ابو اسے اپنے ساتھ لاہور لے آئے تھے۔ راجہ بابی واپس چلی گئی تھیں۔ اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اسے صبر آنا چلا گیا تھا۔ آیا ابو کے کہنے پر اس نے اسکول میں ملازمت کر لی تھی۔ اسے بھی اسکول کی ملازمت میں اپنے غم سے چھینے کا ایک آسرا مل گیا تھا۔ ورنہ حماد کو بھول جانا اس کے اختیار میں نہ تھا۔

اسد کا مجتبیٰ حسن سے کوئی خونی رشتہ نہ تھا۔ تقریباً پچیس سال پہلے کی بات ہے مجتبیٰ حسن کا شمالی علاقہ جات جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ تفریح کے دوران

ایک جگہ انہیں انتہائی زخمی حالت میں تین چار سال کا ایک بچہ ملا، نبض دیکھنے پر اس کے اندر زندگی کے آثار نظر آئے تو وہ اسے فوراً قریبی اسپتال لے گئے۔ اس کی زندگی تھی جو وہ موت کی سرحد سے لوٹ آیا تھا۔ اسے خطرے سے باہر آنے اور صحت یاب ہونے میں چند دن لگ گئے تھے۔

نہ جانے کس بد بخت نے اس خوب صورت سے بچے کو پہاڑوں کے دامن میں کسی درندے کا لقمہ بننے کو بھیجتا دیا تھا۔ اس پر اس حادثے کا اس قدر اثر تھا کہ وہ اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا پاتا تھا۔ وہ خوف زدہ اور سما ہوا بچہ ہر کسی کو دیکھ کر رونے لگتا تھا۔ اس کے لبوں پر صرف بابا جان اور بی بی جان کے الفاظ تھے۔

انہوں نے اس کے وارثوں کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر کوئی امید افراہ دکھائی نہ دی۔ انہوں نے اپنے تمام ذرائع استعمال کر لیے۔ حتیٰ کہ اخبارات میں بھی بچے کی تصویر اور کشدگی کی اطلاع دی گئی، مسلسل کوشش کے باوجود بھی جب اسد کے اصل ورثا کا کوئی پتہ نہ چل سکا تو وہ پولیس تھانے میں اطلاع کر کے اور اپنا ایڈریس وغیرہ دے کر ان کی اجازت سے بچے کو اپنے ساتھ لاہور لے آئے تھے۔

چار سالہ اسد نفسیاتی طور پر اس قدر خوف زدہ ہو چکا تھا کہ جس کو دیکھا دہشت زدہ ہو جاتا تھا۔ مجتبیٰ حسن کی بیگم نے اسے بڑی محبت و شفقت سے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ آیا ابو کا خیال تھا کہ اسد کے والدین ایک دن ضرور ان تک آئیں گے، مگر دن بہ دن اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے تو وہ بھی ناامید ہو گئے۔ اسد کے وارثوں کا پتہ لگانے میں تمام کوششیں ناکام ہو گئی تھیں۔ شاید قدرت نے اسد کی پرورش مجتبیٰ حسن کے ہاتھوں لکھی تھی۔

بچے کا اصل نام معلوم نہیں کیا تھا، مگر انہوں نے اسے ”اسد مجتبیٰ حسن“ کی حیثیت سے پہچان دی، بلکہ اسے معاشرے کا ایک فعال اور توانا مرد بنانے کے

لیے اپنی تمام کوششیں بھی صرف کر دیں۔

مجتبیٰ حسن صاحب نے کبھی اس سے اس کی اصلیت میں چھپائی۔ وہ اچھی طرح باخبر تھا کہ وہ مجتبیٰ حسن کا حقیقی بیٹا نہیں، مگر اس نے ہر موقع پر حقیقی بیٹا ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ اور وہ بھی برملا کہا کرتے تھے ”میرے دو بیٹے ہیں، اسد اور حماد۔“ انہوں نے بھی ایک باپ ہونے کے تمام فرائض نبھائے تھے۔

انہوں نے اسد اور حماد میں بھی کوئی فرق نہ کیا۔ جب صبح حماد کے ہمراہ بیاہ کر اس گھر میں آتی تھی تو اسد سے بڑے خوش گوار تعلقات رہتے تھے مگر جب اجڑ کر دوبارہ اس گھر میں آتی تو اس نے بہت سی حدود اپنے اور اسد کے درمیان قائم کر لی تھیں۔

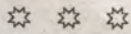
مجتبیٰ صاحب جب بھی اسے دیکھتے ان کے اندر اپنے بیٹے کی جدائی کا صدمہ اور گمراہیوں لگتا۔ اب وہ اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ اٹھنے بٹھنے میں اب انہیں دقت ہونے لگی تھی۔ چند قدم چلتے ہی پانکنا ہو جاتے تھے۔ یہ اعصابی و جسمانی تھکاوٹ انہیں دن بدن کمزور بناتی جا رہی تھی۔

صبح دوبارہ اس گھر میں آنے کے بعد ذہنی طور پر بہت مضطرب ہو چکی تھی۔ جب سی آیا ابو کے اصرار پر بلکہ مجبور کرنے پر اس نے قریبی اسکول میں ملازمت کر لی، اس کی توجہ کار نکالنے لگا تو اس کی ذہنی حالت بھی بہتر ہونے لگی۔ آدھا دن اسکول میں گزار کر آنے کے بعد گھر کی مصروفیات نے اسے بڑا سنبھالا دیا تھا۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات تھی کہ اسے اسد کی طرف سے عجیب سا احساس ہونے لگا تھا۔ اس کے محسوسات اسے اسد کی طرف سے مشکوک کر چکے تھے۔ شک اسد نے کبھی کوئی نازیبا حرکت تو ایک طرف کوئی ناپسندیدہ لفظ بھی نہ کہا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں وہ اپنے دل میں اس کے لیے اچھے جذبات برقرار نہ رکھ پاری تھی۔ وہ یہ یقین کرنے پر بھی راضی نہ تھی کہ اسد جو حماد کو گناہاتی سمجھتا تھا، اب اس کی بیوہ کے لیے بدل رہا ہے، پھر بھی وہ اس کی طرف سے خاصی

مخاطب ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر تلخ نہیں ہوتی تھی، مگر اسد کو دیکھتے ہی اس کو اپنے احساسات و جذبات پر قابو نہیں رہتا تھا۔

وہ کوشش کرتی تھی کہ کم سے کم اسد سے مخاطب ہو، مگر کبھی کبھار مخاطب کرنے پر اس کے لب و لہجے میں خود بخود تلخی سی سمٹ آتی تھی۔ جسے ابھی تک مجتبیٰ صاحب نے محسوس نہیں کیا تھا۔ مگر وہ نہ صرف بہت اچھی طرح محسوس کر گیا تھا، بلکہ اس کا پس منظر بھی جان گیا تھا اور شاید آج اس کا اس طرح سختی سے ٹوک دینا بھی اسی زمرے میں آتا تھا۔ مگر وہ خود کو پھر بھی حق بجانب سمجھ رہی تھی۔



”خان آگئے۔“ خان ذکاء اللہ خان نے جیسے ہی حویلی میں قدم رکھا، خبر یہاں سے وہاں تک پھیلی بی بی جان کے کمرے میں بھی پہنچی۔

”بی بی جان! بابا جان آگئے ہیں۔“

پیشینہ نے کمرے میں داخل ہو کر بستر پر وارز بی بی جان کو اطلاع دی تو ان کے چہرے پر ایک دم سکون سا سراپت کر گیا۔ خان بی بی جان کے لیے شہرے باہر گئے تو بی بی جان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ وہ بہت دیر ہی ہو گئی تھیں۔ کوئی ان کی نظروں سے ذرا بھی اوچھل ہوتا تو ان کو طرح طرح کے وہم ستانے لگتے تھے۔ بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ انہیں دے کا مرض بھی لاحق ہو گیا۔

”السلام علیکم!“ ذکاء اللہ خان نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا، بی بی جان اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”وعلیکم السلام!“ انہیں اپنے سامنے دیکھ کر وہ بالکل مطمئن ہو گئی تھیں۔

”طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟“ انہوں نے تشویش سے پوچھا۔

”نہیں بابا جان! رات سے بی بی جان کو پھر سانس کا پر اہم شروع ہو گیا تھا۔ بی بی جان دن بدن وہی ہوئی



# دین

ماہنامہ  
فروری 2013 کا شمارہ شائع ہو گیا

اداکارہ ”عروہ“ سے ملاقات

آواز کی دیناے FM-10 کے آر بے ”مدثر خٹک“ سے ملاقات

”میری بھئی سینیٹے“ میں شہر شاعر ارشد ملک کی باتیں

”ممبہ سے ملنے“ میں نکوہ جمال فیروز سے ملنے

”مقابل ہے آئینہ“ میں فدا بختیو کو دلچسپ جملات

”ماں“ نمونین حبیب کا اپنی والدہ سے اظہار محبت

”خواب جلی آنکھیں“ منقہ محمد بیگ کاکل ناول

”خاک دو جانیں گے“ مصباح نوشین کاکل ناول

”دست کو زہر“ فوزیہ یاسین کے سلسلے دار ناول

”درہ دل“ نیلا عزیز کے سلسلے دار ناول کا آخری حصہ

”وہ آگ بڑی ہے“ دوحفہ امجد بخاری کا شمار

دکھ ناول

رفعت سلطان، نیلا عزیز، شایب جمال قر اور نادیان گلش کے ناول

سید عزیز آفریدی، فرخین اختر، یونس صوف، حنا زہر و فرخین آفریدی

مدثر خٹک اور ملاقات جاوید کے افسانے اور مستقل سلسلے

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب

صحت کی حفاظت کے متعلق کرن کتاب

”آپ کی صحت“

کرن کے نمبر شمارے کے ساتھ مفت پیش خدمت ہے۔

گواؤ۔۔۔ آنسو صاف کر کے انہوں نے کہا۔  
”جی“ میں میراں سے کہتی ہوں۔ اثبات میں  
سر ملاتی وہ کمرے سے نکل گئی۔

کھانے کی میز پر وہ بیٹوں ہی تھے۔ پلوٹے اور  
زرمینے کی شادی کے بعد اب گھر میں صرف وہ ہی  
تھی۔ خان ذکاء اللہ خان دیگر خاتون کی طرح روایتی نہ  
تھے۔ انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادیاں  
شک خاندان میں ہی کی تھیں، مگر تعلیم انہیں وقت اور  
حالات کے تقاضوں کے مطابق دلوائی تھی۔ ان کی  
تین بیٹیاں یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ تھیں۔ پشینہ ایم  
اے کے امتحان دے کر چند ماہ قبل ہی فارغ ہوئی تھی۔

شام ہوتے ہی گل خانم اپنی شہری بہوراشدہ اور  
دونوں بیٹیوں کے ہمراہ چلی آئیں۔ آتے ہی انہوں نے  
حسب عادت پشینہ کو لیٹا کر پیار کیا۔ زوار سچا دل بھائی  
اور راشدہ بھابھی کے سامنے وہ پھوپھی بیگم کے اس  
مظاہرے پر سرخ سی ہو گئی تھی پھر اسے جھوڑ کر وہ  
بی بی جان سے ان کی طبیعت کا احوال دریافت کرنے  
لگیں۔

”گلیا کر رہی ہو آج کل۔“ ذکاء اللہ سچا دل اور زوار  
تینوں باہر بیٹھک میں چلے گئے تھے۔ وہ راشدہ بھابھی  
کے پاس بیٹھی تو اس نے ہنسی سے پوچھا۔

سچا دل لالہ کو یونیورسٹی میں دوران تعلیم راشدہ پسند  
آگئی تھی۔ سب کی بے پناہ مخالفت کے باوجود سچا دل  
لالہ نے راشدہ سے شادی کر لی۔ خوش قسمتی سے  
راشدہ ایک اچھی اور سلجھی ہوئی ہو ثابت ہوئی، سو  
سب کی مخالفت دم توڑ گئی، مگر گل خانم کمالاں نہیں جانتا  
تھا۔ وہ سچا دل کے لیے پشینہ کو سوچے بیٹھی تھیں مگر  
جب سچا دل نے راشدہ سے شادی کر لی تو انہوں نے  
نہار کو پکڑ لیا۔ وہ اپنے بھائی کی بیٹی کو کسی طور جھوڑنے  
پر راضی نہ تھیں اور اپنی اس چاہت کا وہ برا اظہار بھی  
کر رہی تھیں۔

”کچھ خاص نہیں، ایگزیز کے بعد فارغ ہی ہوں“  
اس رزلٹ کا اظہار ہے، اور بابا جان کا تو آپ کو علم ہے

طاقت تھا، میرا اکلوتا بیٹا تھا، سب کچھ آپ کے سامنے  
ہے، کیا کچھ نہ کیا میں نے۔ پولیس کی وی اخبار کو بھی  
ہر ذریعہ اختیار کیا مگر اس کا کوئی اتنا پتا نہ ملا۔“

وہ بی بی جان کے پاس صوفے پر بیٹھے سے گئے  
تھے۔ اب تو ان کی بھی ہمت ٹوٹنے لگی تھی۔ اپنے تمام  
بچوں کے درمیان اپنے صادم کو نہ پا کر ان کے دل سے  
ہوک اشقی تھی۔ دل غم سے بھر جاتا تھا۔ مگر صبر و ضبط  
سے سب مسہر جاتے تھے کہ یہ ہی رب کی مرضی  
تھی۔ مگر اس پاگل دیوانی ماں کو کیسے سمجھاتے جو آج  
بھی اس لگائے بیٹھی تھیں کہ وہ زندہ ہو گا اور انہیں  
ملے گا۔

”خان صاحب! پتا نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے وہ  
زندہ ہے۔ مجھے راتوں کو خواب آتے ہیں، وہ مجھے پکارتا  
ہے، بی بی جان! بی بی جان! اس کے تھے منے ہاتھ  
میرے قریب آتے ہیں اور جب میں اسے پکڑنے لگتی  
ہوں تو وہ غائب ہو جاتا ہے، وہ یقیناً زندہ ہے، کہیں  
موجود ہے۔ میرا صادم، میری زندگی، میری آنکھوں کا  
نور۔ وہ زندہ ہو گا۔“

اتنا وقت گزر گیا تھا مگر ان کی اس نہ ٹوٹی تھی۔ خان  
صاحب کی آنکھوں میں بھی نمی سی اتر آئی تھی۔

پشینہ شربت کا جگ اور گلاس ٹرے میں رکھے  
کمرے میں دستک دے کر داخل ہوئی تو بی بی جان کی  
سسکیاں اسے آرت دے گئیں۔ اس نے خاموشی  
سے گلاس بھر کر بی بی جان کو تھمایا۔

”جیتتی رہو۔“ انہوں نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا،  
بی بی جان کو بھی ایک گلاس تھما کر وہ ان کی دوسری طرف  
بیٹھ گئی۔

”بی بی جان! پھوپھی گل خانم کا فون آیا ہے، وہ لوگ  
شام کو آ رہے ہیں آپ کی عیادت کے لیے۔“ بی بی  
جان کی بیگمی آنکھوں سے اسے بڑی تکلیف ہو رہی  
تھی اور یہ تکلیف اس کے چہرے سے صاف ظاہر  
تھی۔

”اچھا، میراں سے کہو کھانے بننے کا اچھا سا انتظام  
کر لے میں بھی آتی ہوں اور ابھی دوپہر کا کھانا

جاری ہیں۔ نہ جانے کیوں ان کے دل میں یہ شک جز  
پکڑ چکا ہے کہ جو بھی گھر سے نکلے گا واپس نہیں آئے  
گا۔ زرمینہ اپنی اور بھائی جان رات کو آگئے تھے، ابھی  
گئے ہیں۔“

پشینہ نے اپنے بابا جان سے اوب سے سر جھکا کر  
پیار لیا اور فوراً بی بی جان کی شکایت کی تو وہ مسکرا دیں۔  
خان صاحب نے ایک سنجیدہ نگاہ اپنی شریک حیات  
پر ڈالی تو وہ حققت سے مسکرا کر سر جھکا گئیں۔

”پشینہ بیٹا! میراں سے کہو کھانا لگائے، تمہارے بابا  
جان سفر سے لوٹے ہیں، کچھ بننے کو بھی لاؤ۔“ بی بی جان  
نے پشینہ سے کہا تو وہ فوراً سر ملاتی کمرے سے نکل  
گئی۔

”تنتی دفعہ آپ سے کہا ہے کہ بھول جائیں اس  
واقعے کو، اپنے آپ کو مطمئن اور پرسکون رکھا کریں،  
مگر آپ۔“

”کیا آپ بھول گئے ہیں اس سانحے کو؟“ انہوں  
نے تڑپ کر کہا۔ اور خان ذکاء اللہ کو لگانے کے زخموں  
سے خون رسنے لگا ہو، وہ ایسا ہی گرا زخم تھا جو بھرتا ہی نہ  
تھا، بلکہ اب تو ناسور بن گیا تھا۔

”کوئی حادثہ ہو جا تا تو دل کو قرار بھی آ جاتا، مگر اس  
طرح نہیں خان صاحب! اس کی جبرالتی تو میرے دل کا  
ناسور بن گئی ہے۔ وہ بھولتا ہی نہیں، آج وہ ہوتا تو اس  
کی شادی ہو چکی ہوتی۔ بیوی بچے ہوتے۔ میرے اس  
پاس میری سب اولادیں ہیں، بچے ہیں، مگر وہ نہیں  
ہے۔ میرا دل روتا ہے خان صاحب! اپنے ہاتھوں سے  
تیار کر کے میں نے اسے باہر کھینے کو بھیجا تھا۔ پھوپھی  
واپس ہی نہیں آیا۔ میں تو اس کی صورت دیکھنے کو  
ترس گئی ہوں۔“

لوگ کہتے ہیں کوئی، بھیڑیا، کوئی جانور کھا گیا ہو گا،  
مگر۔۔۔ مگر کوئی نشان تو ملتا؟“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔ انہیں تو اپنے  
بیٹے کو یاد کر کے رونے کا بہانہ چاہیے ہوتا تھا۔

”بس کریں بیگم! بس کریں، میرا دل بھی خون خون  
ہو جاتا ہے، وہ میرا بازو تھا، میرے وجود کا حصہ، میری



ماسٹر انہوں نے کروا دیا ہے، مزید کچھ کرنے کی اجازت نہیں۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

”ذرمینے اور پلوٹے کیسی ہیں؟“ راشدہ بھابھی نے پوچھا۔

”سب ٹھیک ہیں، ذرمینے رات کو آئی تھی، دوسرے کو چلی گئی اور پلوٹے تو دو زون فون کرتی ہے، خوش ہے۔“ کھانا سب نے اکٹھے ہی کھایا۔

کھانے کے بعد وہ راشدہ کے ساتھ لان میں چلی آئی۔ چاندنی رات میں تالاب کے پاس بیٹھے ہوئے ماحول میں اک عجیب سا فوں طاری تھا، جس سے وہ دونوں محفوظ ہو رہی تھیں۔

”تم تو انگریز کے بعد ایسے غائب ہوئی ہو کہ تمہیں ڈھونڈنے کے لیے لگتا ہے شہر میں منادی کروانا پڑے گی۔“

اپنے عقب میں زوار کی بھاری دلکش آواز پر وہ فوراً پلٹی۔ راشدہ بھابھی مسکراتی ہوئی دونوں کو دیکھنے لگی۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ اس نے تیوریاں چڑھا کر زوار کو گھورا تو وہ مسکراتا ہوا راشدہ اور اس کے درمیان خالی جگہ پر ٹک گیا۔ دونوں تالاب کی دیوار پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

”تمہیں دیکھنے۔ بوے دن ہو گئے ہیں، تمہاری کنزروی کسبلی سنے۔“ اس نے جواباً اسے گھور کر جواب دیا۔

”دیکھ رہی ہیں بھابھی! یہ ہمیشہ لڑائی کی ابتدا کرتا ہے اور اگر میں کچھ کہتی ہوں تو بابا جان تک شکایات پہنچ جاتی ہے۔ میں تو دن رات شکرانے کے نفل پڑھتی ہوں کہ تم جیسے پاؤں گاڑو سے جان چھوٹی۔ یونیورسٹی میں برواشت کرنا تو بھوری تھی کہ بابا جان اکیلے آنے جانے نہیں دیتے تھے۔“ اس نے بھی فوراً حساب چکایا تھا۔

”تمہیں اتنا پینڈم، وجیہ اور خوب صورت لڑکا پاؤں گاڑ لیتا ہے۔“ اس نے فوراً اس کے الفاظ پر گرفت کی تھی۔

”میرے لیے تو پاؤں گاڑ ہی تھے۔ بابا جان نے تمہیں یہ ہی تو بتایا تھا۔“

”خیر پاؤں گاڑ کا بڑا خوب صورت مفہوم بھی لیا جاسکتا ہے، کیوں بھابھی جان!“

اس نے فوراً ”راشدہ کو ساتھ ملایا، اس نے فوراً مسکراتے ہوئے گردن ہلادی۔

”جو اس نہیں کرو، میں گل بلبل سے شکایت کروں گی۔“ وہ جل کر بولی۔

”بھد شوق! اس طرح تو میرا کام اور آسان ہو جائے گا۔“ سرخ سرخ چہرے والی پشینہ اسے شروع سے ہی بڑی پسند تھی۔

سجاول کی شادی کے بعد زوار کی راہ کھل گئی تھی۔ پہلے پشینہ سے متعلق وہ اپنی ہر سوچ چھپا کر رکھتا تھا، مگر اب کھلے عام اظہار کرتا تھا اور پشینہ اسی بات سے بدکھی تھی۔ اب بھی اسے گھورا تھا۔

”ظالم نظروں سے نم نہ مجھ کو دیکھو، مڑ جاؤں گا،“ او جان جاناں۔“ وہ بڑی شوخی سے لگتا تھا۔

”بھابھی!“ اس نے بے اختیار ہنستی ہوئی راشدہ کو پکارا۔

”بڑی بات زوار! تم خواخو ا بے چاری کو تنگ کر رہے ہو۔“

”خواخو؟“ اس نے ابو اچکائے۔

”میں تمہیں تالاب میں دھکا دے دوں گی، خبردار! اب تم ایک لفظ بھی بولے تو۔“ اس نے دھمکی دی تھی۔

زوار اور وہ یونیورسٹی میں اکٹھے ہی تھے۔ بابا جان نے ان سب بہنوں کے تعلیمی سلسلے میں کہیں بھی آنے جانے کی تمام تر ذمہ داری سجاول اور زوار پر ہی ڈالی ہوئی تھی۔ بلکہ صادم کی کشمکش کے بعد پچھو پچھو بیگم نے بی بی جان کی حالت دیکھتے ہوئے زوار کو پیشہ کے لیے اُدھر ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک طرح سے بابا جان کا منہ بولا بیٹا بنا ہوا تھا۔ اسی لیے اس کی سب کے ساتھ ایسی ہی بے تکلفی تھی۔ وہ تو اب گل بلبل نے رشتے کا جو شوشہ چھوڑا تھا، اس وجہ سے پشینہ اس سے

چپکائی لگی تھی، ورنہ ہم عمر ہونے اور ایک جیسے معاملہ رکھنے کی وجہ سے دونوں کی خوب بنتی تھی۔ جتنا لڑتے تھے، پیار بھی انتہائی تھا، مگر چوں ہی زوار کے تیور بدلے، وہ اس سے پہلو بچانے لگی تھی۔

”توبہ! لڑتے ہی رہتے ہو تم دونوں، میں اندر ممانی جان کے پاس جا رہی ہوں، لڑو آرام سے۔“ راشدہ دونوں کو ٹوک کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ بھی منہ پھلا کر اسے کینہ تو زلفوں سے گھورتے ہوئے جانے لگی تو زوار نے تیزی سے اس کا ہاتھ تھام کر روک لیا۔

”کہا ہے؟“ وہ کاٹ کھٹنے کو دوڑی۔

”بھئی پیار سے بھی پوچھ لیا کرو، ہر وقت لڑا کا طیارہ بنی رہتی ہو۔“ الفاظ کے برعکس زوار کی آنکھوں کے تیور ایسے تھے کہ وہ ایک دم سلیپ گئی۔

”ہاتھ تو چھوڑو۔“ اسے گھبراتے دیکھ کر وہ محفوظ ہوا تھا۔

”بی بی جان آج ماموں جان سے ہمارے رشتے کی باقاعدہ بات کرنے آئی ہیں۔“ اس نے بوے آرام سے انکشاف کیا تو وہ گھبرا گئی۔

”ماموں جان تم سے پوچھیں تو منہ پھاڑ کر اعتراض کرنے مت بیٹھ جانا۔“ اس نے ڈپٹ کر تنبیہ کی۔

”وہ مجھ سے پوچھیں گے تو میں صاف صاف منع کروں گی، تم میں تو کوئی خولی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملنے والی، تو کیا بابا جان اپنی لاڈلی بیٹی کی قسمت پھوڑ دیں گے؟“ وہ آنکھوں میں شرارت لے کر رہی تھی۔

”چھا! یہ بی بات ذرا میری آنکھوں میں دیکھ کر کہنا۔“ اس نے مصنوعی غصہ سے کہا، پھر اس کے گھبرا جانے پر ہنس دیا۔

”خبردار! اگر تم نے کوئی ایسی سیدھی بکواس کی؟“ تمہیں کیا بتا میری برسوں کی خواہش پوری ہونے جا رہی ہے، کتنی میں مرادیں ملانی ہوئی ہیں میں نے۔“ اسے بھانسنے کو برتوتے دیکھ کر اس نے دوبارہ تنبیہ کی تھی۔ پشینہ کے ہونٹوں پہ بڑی پیاری سی مسکان ابھری تھی۔

”سب جانتی ہوں میں۔“ جلدی سے کہہ کر وہ

ایک دم اندر کی طرف بھاگی تھی۔ زوار مسکرا کر اُدھر ہی دیکھے گیا۔

\*\*\*

وہ جو اسد سے کہہ کر گئی تھی کہ وہ اس کے ساتھ تیا ابو کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جائے، مگر اسد کا رویہ دیکھ کر گھر جلدی نہ آئی تھی۔ چھٹی کے بعد اسے گھر آتے ہوئے ڈھائی بج گئے تھے۔ دیکھا تو دروازہ مقفل تھا۔ اس کے پاس اضائی چابی تھی، گھر کی ایک چابی اسد کے پاس ہوئی تھی اور ایک اس کے پاس۔ دروازہ کھول کر وہ اندر آئی۔ کپڑے بدل کر نماز ادا کی، پھر کچن میں گھس گئی۔ اسد اس کی غیر موجودگی میں کچن کا باقی سامان بھی لے آیا تھا۔ فریق بھرا ہوا تھا۔

سائن بھی اتار تھا۔ صبح نے دیکھا ڈا آتھا تھا۔ اسد اکثر کوئی نہ کوئی سائن بنا کر رکھ دیتا تھا۔ صبح نے دل ہی دل میں اسد کے گھر پاپے اور ہاتھ کے ڈالنے کی داوڑی کھینچی۔

تالی بیگم کا انتقال کافی سال پہلے ہو گیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد راجیہ بابی نے گھر سنبھالا ہوا تھا۔ مگر تیا ابونے ان کی شادی بھی بڑی کم عمری میں کر دی تھی۔ راجیہ کے بعد ساری ذمہ داریاں ان بیٹیوں مردوں پر آئی تھی۔ حماد اور اسد کسی سلیقہ مند عورت کی طرح گھر کیلوا امور میں ماہر تھے۔ پھر بھی اس گھر کو ایک عورت کی ہر حال میں ضرورت تھی اور یہی صبا جان نے پوری کر دی تھی۔

کتنے دنوں سے ایک ایک کر کے کچن کا سامان ختم ہو رہا تھا، مگر وہ اپنی انا کی وجہ سے اسد کو تیا نہیں پاری تھی۔ اب فریق بھرا ہوا تھا۔ اسے اندر ہی اندر شرمندگی بھی ہو رہی تھی کہ خواخو اتنے دن چپ رہی، اس سے قبل تو اس کے کہنے سے پہلے ہی اسد سب سامان لا کر دے دیا کرتا تھا۔ پتا نہیں اس دفعہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا، شاید بھول گیا تھا یا شاید جان بوجھ کر۔

روٹیاں پکا کر وہ دونوں کا انتظار کرنے لگی۔ تقریباً



ساڑھے تین بجے دونوں لوٹے۔

”تی ریر کردی تیا ابو آپ نے مجھے فکر ہو رہی تھی۔“

دروازہ کھولتے ہی اسد کو نظر انداز کر کے اس نے فوراً تیا ابو سے کہا تھا۔ اسد اس کے یوں راستہ روکنے پر خفا ہوا تھا۔

”اندر تو آنے دو یہ باز پرس اندر جا کر بھی ہو سکتی ہے۔“

سجیدہ اور بے مروت انداز میں اس نے ٹوکا تو وہ فوراً سامنے سے ہٹ گئی۔

اسد تیا ابو کو ان کے کمرے میں لے گیا تو وہ بھی پیچھے پیچھے چلی آئی۔ اسد نے ان کو بستر پر لٹا دیا تھا۔

”کیا کہہ رہا تھا ڈاکٹر؟“ وہ بھی تیا ابو کے بستر پر ٹک گئی۔ وہ جتنے غزال لگ رہے تھے اسے تشویش لاحق ہو گئی تھی تاہم اسد جیسی رہا تھا۔

”اسد بیٹے سے ہی کچھ نہ کچھ کہتا رہا تھا۔ مجھے تو صرف انتہائی کم کم میں روزانہ کم از کم آدھا گھنٹہ ضرور ورزش کروں بلکہ واک کیا کروں دوائیاں اور پھل بھی استعمال کروں۔“ انہوں نے تکیے سے ٹیک لگالی۔

”میں کھانا لاتی ہوں۔“

”ابو کو کھلاؤ مجھے بھوک نہیں ہے مجھے آفس بھی پھینچنا ہے۔“

صلح کو کمرے سے نکلتے دیکھ کر اس نے کہا تو وہ پلٹ کر اسد کو دیکھنے لگی۔

سجیدہ انداز لے کر کافی روکھا پیکا سا لگ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ اس سے بڑی مروت سے مخاطب ہوتا تھا۔ آج شاید اس کے احساس کو کچھ زیادہ

ہی بے دردی سے اس نے چلا تھا کہ اس کے لمحے میں کچھ غمی در آئی تھی۔ وہ صبح کے دیکھنے پر اٹھ کھڑا ہوا۔

صلح خاموشی سے پلٹ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

کھانا نکال رہی تھی کہ آہٹ پر پلٹ کر دیکھا اسد دروازے کی دین پر کھڑا ہوا تھا۔

”یہ میڈیسن لے لو ڈاکٹر بہت تشویش کا اظہار

کر رہا تھا“ ابونے تو جیسے زندہ رہنے کی خواہش ہی اپنے اندر سے ختم کر لی ہے تم ان کو سمجھانے کی کوشش کرو ساری ہدایات اور میڈیسن کے اوقات اس پر چہ پردن ہیں۔ تم دیکھ لیتا۔“

اس کے قریب ہی میز پر دوائیاں رکھ کر وہ پلٹ گیا تھا۔

صلح ایک گہرا سانس لے کر کھانا اور دوائی لیے تیا ابو کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

رات کو اسد گھر لوٹا تو صبح تیا ابو کے کمرے میں تھی۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔

وہ سو رہے تھے چہرے پر ثقاہت و تکلیف کے آثار واضح تھے اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ ان کا ہاتھ تمام کربوں سے لگائے وہ جس اذیت سے گزر رہی تھی یہ صرف وہی جانتی تھی۔

”نیک اث ایزی صبح! ان شاء اللہ ابو جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔“

اسے یوں بے آواز روتے دیکھ کر اسد کا دل پھینچا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی تھی۔ وہ اور شدت سے سسکا اٹھی۔

اسے لگ رہا تھا کہ امی، ابو اور حماد کے بعد اب تیا ابو بھی اسے چھوڑ جائیں گے۔ پھر وہ کہاں رہے گی؟ کیا کرے گی؟ کون تھا اس کا؟ کسی طور بھی اسے سکون نہیں مل رہا تھا۔

تیا اس کے لیے ایک مضبوط تناور درخت کی مانند تھے اگر انہیں کچھ ہو جائے تو وہ کدھر جائے گی؟ جبکہ

راجہ بلی بھی پاکستان میں نہیں ہیں۔

”صبح پلیر! صحت و تندرستی زندگی و موت سب عمر کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اگر انسان یوں ایک دم حوصلہ ہارنے لگے تو زندگی گزارنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔“

اسد اسے سمجھا رہا تھا۔ اس نے بمشکل خود پر ضبط کیا۔

”تیا ابو ٹھیک تو ہو جائیں گے نا اسد!“

اس وقت اس کی کیفیت ایک چھوٹے سے بچے کی طرح ہو رہی تھی۔ اس و نراس میں ڈوبا وہ بچہ جس کا

ہو بے یار و مددگار رہ جانے کے خوف سے زبردہ گریا ہو رہا ہے۔ تین سی تھی۔ آنکھوں میں بے پناہ پیالی لیے

اس نے اسد کو دیکھا تھا۔ اس کے دل میں اس کے آنسوؤں نے ایک تلاطم برپا کیا تھا۔ وہ ان آنکھوں میں

کبھی بھی نمی نہ دیکھنے کی خواہش رکھتا تھا۔

”یعنی مضبوط رکھو ابو ٹھیک ہو جائیں گے۔ مگر ان کو ٹھیک کرنے کے لیے ہم دونوں کو نبی کوشش کرنا

ہوگی۔ اپنے آپ کو سنبھالنا ہوگا۔ اگر ہم ہی ہمت ہار گئے تو ان کو کون سنبھالے گا۔ یہ زندگی کی چاہ بھول گئے ہیں اور ہمیں مل کر ان کو زندگی کی طرف لانا ہے۔“

وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ صبح نے اپنے تمام آنسو سمیٹ کر سر ہلاتے ہوئے اسے دیکھا۔

اسد سے اس کا رویہ خود بخود بہتر ہو گیا تھا۔

گزرنے والے دنوں میں اسے بخوبی احساس ہو گیا تھا کہ تیا ابو کے علاوہ اسد کا وجود اس کے لیے ایک

مضبوط پناہ گاہ ہے۔ اس کی یہ سوچ دنیا داری کی حد تک تھی اس سے بڑھ کر اس نے نہ کچھ سوچا تھا اور نہ ہی وہ

سوچنا چاہتی تھی۔ اسد اور اس کے اندر ایک محسوس کیا جانے والا خلا اب بھی تھا۔ بے شک وہ اب اسے

برائے ضرورت مخاطب کرنے لگی تھی۔

وہ تیا ابو کا ہاتھ تھامے باہر لے آتی تھی۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ عصر کے بعد

کا وقت تھا۔ دھوپ ڈھل چکی تھی۔ مغرب کی طرف ہلکی سرخی کو بغور دیکھتے اس نے محسوس کیا کہ ہلکی ہلکی

ہوا اپنے کی بوجھ سے موسم خوش گوار ہو گیا تھا۔

”تیا ابو! موسم کتنا اچھا ہو گیا ہے نا۔“ یوں ہی ادھر ادھر دیکھتے اس نے پوچھا آسمان پر آہستہ آہستہ ہلکی ہلکی

دایاں چھا رہی تھی وہ مسکرائے۔

”ہول۔“ ان کے جھرویل زہ چہرے پر تھکی تھکی

سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تیا ابو! چھٹیوں میں جب بھی میں چھٹیوں گزارنے یہاں آتی تھی نا تو مجھے یہ گھر بہت مستانہ

کرتا تھا۔ اور ہر بار یہاں آنے کے بعد میرا دل پس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔“ وہ ماضی کو یاد کرتے ہوئے

ٹھوس گئی تھی۔

”اور پھر ہم تمہیں ہمیشہ کے لیے اس گھر میں لے آئے تھے مگر جس کے ساتھ لے کر آئے تھے وہ ہی

چھوڑ گیا ہمیشہ کے لیے۔“ ان کی آواز زندہ گئی تھی۔

اسے افسوس ہوا کہ اس نے یہ موضوع ہی کیوں پھینچا؟

تیا ابو نے اپنا رز تیا تھا اس کے سر پر رکھ دیا۔

”تم میری ایک بات مانو گی صبح!“ کچھ سوچے اس کا سر تھپتھپاتے انہوں نے کہا تو اس نے دوپٹے سے

اپنا چہرہ صاف کرتے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”آپ کیسے؟“ تیا ابو کے چہرے پر گہری سوچ اور

تفکر کا عکس واضح تھا وہ ابھی۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم اب شادی کرلو ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ صرف چوبیس سال، تمہاری عمر کی

لڑکیاں تو ہر غم، ہر مزہ داری سے بے نیاز آزاد ہیں اور تم۔“ ایک دفعہ پہلے بھی انہوں نے اس سے یہ ذکر

پھینچا تھا اور اب پھر وہ خاموش رہی۔

”میں آج ہوں کل نہیں، مجھے اپنی زندگی کا اب کوئی بھروسہ نہیں، مرتے مرتے زندگی نے ایک دفعہ پھر

مہلت دے دی ہے۔ حماد زندہ رہتا تو میری سے میرے گھر کی ساری روئیں تھیں۔ اب بھی تم میرے گھر کی

روشن ہو، مگر وہ نہیں تو مجھے بھی کوئی حق نہیں کہ میں تمہیں بٹھائے رکھوں، تمہارے ماں باپ زندہ ہوتے

تو یہ ان کی ذمہ داری تھی کہ تمہارے بارے میں کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ راجہ کو ابھی فون آیا تھا وہ بھی خاصی پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔“

وہ اسے بتا رہے تھے وہ اب بھی سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی رہی۔

”یہ مستقل بیماری۔ اب دل بہت گھبرا گیا ہے“

میں چاہتا ہوں کہ مرتے سے پہلے۔ جلد از جلد



تمہارے فرض سے بےکدوش ہو جاؤں۔“

”پلیز تایا ابو! میں اب دوبارہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ حماد زندہ تھا تو سب کچھ تھا اب وہ نہیں تو ایسی کوئی حسرت نہیں رہی، میں اس کی بیوی ہوں اور اسی کے نام پر ساری زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ مجھے دوبارہ شادی نہیں کرنا، آپ یہ ٹاپک میرے سامنے مت چھیڑا کر پس پلیز۔“ وہ بات کرتے کرتے رو دی۔

”دیکھو صبح بٹی! مجھ بوڑھے کو اب مزید مت لٹکاؤ۔ ورنہ مرتے دم تک یہ دکھ رہے گا کہ تمہیں کس کے سہارے چھوڑے جا رہا ہوں۔“ وہ دگر فیتے سے خاموش ہو گئے تھے۔ دونوں کے درمیان خاموشی کے یہ بل طویل ہوتے جا رہے تھے۔

”مندر چلیں۔“ اندھنی آنے والی ہے، کتنی تیز ہوا ہو گئی ہے۔“

آسمان پر بدلیاں گہری ہو گئی تھیں۔ مغرب میں ڈوبتا سورج مزید اوچھل ہو گیا تھا۔ ہوا کا زور تیز تر ہوا تو اس نے انہیں ہاتھ سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ انہوں نے بڑی اذیت و بے بسی سے اسے دیکھا تو وہ چپ چاپ سر جھکا گئی۔

انہیں کمرے میں پہنچا کر وہ کچن میں آگئی تھی۔ چیزوں کو ادھر ادھر کرتے ہوئے بھی ذہن لایا کی باتوں میں الجھا رہا تھا۔

”یہ ممکن نہیں تایا ابو۔ پلیز مجھے معاف کر دیں جو آپ چاہ رہے ہیں، ایسا اب ممکن نہیں، میں حماد کی سنگت میں ساری خوشیاں حاصل کر چکی ہوں، اب اس تار تار دل میں کسی اور کے لیے قطعی کوئی گنجائش نہیں۔“

اس خیال سے ہی کہ اس کی زندگی میں حماد کی جگہ کوئی اور بھی لے سکتا ہے، وہ بے پناہ اذیت کا شکار ہو گئی تھی۔

اسد آیا تو اسے کھانا دے کر وہ عشاء کی نماز پڑھنے کمرے میں چلی آئی۔ نماز پڑھ کے واپس کچن میں آئی تو اسد کھانا کھانے کے بعد برتن بھی دھو کر جا چکا تھا۔ اس کی آواز تایا ابو کے کمرے سے آرہی تھی۔ دونوں

کسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔ اس نے کچن سمیٹ کر چائے بنالی تھی۔

”میں نے اس سے پھر بات کی تھی، مگر وہ انکار کر رہی ہے۔“ چائے بنا کر وہ تایا ابو کے کمرے میں آئی تو دروازے پر ہی رک گئی۔ موضوع بحث شاید اس کی ذات تھی۔

”تو پھر اب آپ کیا چاہتے ہیں؟“ یہ اسد کی آواز تھی۔ وہ پوری طرح متوجہ ہوئی۔

”تم جاننے ہو کہ میں کیوں تم دونوں پر بار بار زور دے رہا ہوں۔“ تایا ابو کی نوٹھی آواز سنائی دی۔

”صبح ایسا کبھی نہیں چاہے گی۔“ اسد نے پرسکون انداز میں کہا تھا۔ صبح ابھی۔

”حماد کو گزرے دو سال ہو گئے ہیں، سنبھل گئی ہے وہ کافی۔ آہستہ آہستہ حالات سے سمجھوتا کر لے گی۔ تھوڑی جلدیاتی ہو رہی ہے اور کچھ نہیں۔“

”پھر بھی میرا خیال ہے وہ ایسا کبھی نہیں چاہے گی، میں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“

”اسد! میں سمجھوں کہ تمہارے نزدیک میری خواہش کی کوئی اہمیت نہیں؟“ تایا ابو کی بیگلی آواز پر اسد تڑپ اٹھا۔

”پلیز ابو جان! کیوں مجھے گناہ گار کرتے ہیں، ساری صورت حال آپ کے سامنے ہے۔ حماد اور صبح کی اپجمنٹ سے آپ بے خبر تو نہیں۔ حماد کو اللہ نے عمر ہی اتنی دی تھی ورنہ میں تو ایسا سوچتا بھی اپنے لیے گناہ تصور کرتا ہوں۔“

”اسد بیٹا! یہ میری خواہش ہے اور جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے، یہ شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ میں دل سے چاہتا ہوں تم صبح سے شادی کر لو، اسے تحفہ دو۔“ انہوں نے ذرا توقف کیا۔

”حماد کی اگر خواہش نہ ہوتی تو تب بھی میں نے سوچ رکھا تھا کہ صبح کو تمہارے لیے اس گھر میں لاؤں گا، مگر پھر حماد نے خواہش کا اظہار کر دیا، پھر صبح کا رجحان دیکھتے ہیں، میں بھی چپ سا دھلی، وہ اب نہیں مگر تم تو ہونا؟ تم سے بہتر صبح کو کوئی اور نہیں سمجھ



سکتا وہ خاموش طبع، سنجیدہ مزاج، جذباتی سی لڑکی ہے مجھے خوف آتا ہے کہ کہیں اسے ایسی ویسی جگہ بیاہ کر اس کے ساتھ زیادتی نہ کر بیٹھوں۔ میں اسے تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ وہ جملہ کو نہیں بھولی اب بھی ذکر کرتا ہوں تو رو دیتی ہے، مجھے تم پر بھروسہ ہے، تمہارے ساتھ بیاہتے ہوئے مجھے یہ تکلیف نہیں ہوگی کہ تم اسے اس کی پچھلی زندگی کا حوالہ دو گے۔ مجھے یقین ہے تم دونوں بہت خوش رہو گے۔ تم اسے اسی طرح عزت اور مان دو گے جیسے حماد دیتا تھا۔

”رے صابح کہ باتوں میں لرز گئی تھی۔ اسے لگا کسی نے اس کا ہل مٹھی میں پیچ لیا ہو۔“  
”تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں اسد! اگر ہے تو کہہ دو جو بھی دل میں ہے بتا دو۔“  
اس سے پہلے کہ اسد کچھ کہتا وہ واپس پلٹ گئی، ”رے بچن کی سلیب پر رکھ کر وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔“

حویلی بھتہ نورنی ہوئی تھی۔ سون کی طرح سچی حویلی دور سے ہی دیکھنے سے نمایاں ہو رہی تھی۔  
آج خان ذکاء اللہ خان کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی پشینہ خان کی مفتی زوار خان سے ہو رہی تھی۔  
بی بی جان مطمئن سی ادھر سے ادھر ملا زناؤں کو ہدایات دیتی خاصی مصروف تھیں۔ پلوٹے اور زرمینے تو ہفتے پہلے ہی حویلی میں ڈیرا جما چکی تھیں۔ ان کے ہاں شادی بیاہ کی رسمیں بڑی روایتی سی تھیں۔ خان ذکاء اللہ نے بے شک تینوں بیٹوں کو اعلا تعلیم سے آراستہ کیا تھا۔ مگر اپنی اقدار نہ بھولے تھے۔

”ماشاء اللہ بہت بھاری لگ رہی ہو۔“ زرمینے نے اسے مسکرا کر دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔  
”لگتا بھی چاہیے، آخر میرے پیارے جیلے بھیا کے نام کا سنگھار ہے۔“ زوار کی بہن لیلیٰ سے رہبانہ گئی۔  
بھاری خوب صورت لباس اور زیورات میں وہ کوئی

اپسرا ہی لگ رہی تھی۔

بی بی جان کی اجازت سے گل بیگم نے اسے خاندانی آٹو بھی پناہ کر رسم کا آغاز کیا تھا۔  
”تمہارے لیے ایک سربراہ ہے۔ ذرا دل تمام کے رکھنا۔“ لیلیٰ نے ہنس کر کہا تو اس نے نا سنجی سے اسے دیکھا۔ مگر کیسی ہنستے ہوئے نکل گئی۔ کچھ دیر بعد جب خان ذکاء اللہ نکاح خوال کو لیے ہوئے آئے تو وہ حیران ہی رہ گئی۔

پشینہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مفتی کے ساتھ نکاح بھی ہو جائے گا۔ اس نے لرزے پاٹھوں سے دستخط کیے تھے۔ لیلیٰ خوب چپقتی بھر رہی تھی۔  
”میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ دل تمام کے رکھنا، یہ تمہارے لیے سربراہ تھا۔ کو کیسا لگا ہمارا سربراہ؟“  
وہ ابھی تک حیرت زدہ تھی، محض مسکرا کر سر جھکا گئی تھی۔

کچھ دیر بعد مہمانوں کا رش کم ہوا تو پلوٹے اور لیلیٰ کی ہمرائی میں وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔  
”میں نے زوار بھیا سے وعدہ کیا تھا کہ تم دونوں کی ملاقات کا بندوبست کر دوں گی۔ تم بس کچھ دیر ایسے ہی رہنا، میں بھیا کو اطلاع کرتی ہوں۔“

وہ پریشان ہو اٹھی۔  
”میں لیلیٰ۔ سنو تو۔ کسی کو خبر ہو گئی تو؟“  
”جناب! میں نے انتظام کر رکھا ہے، تم آرام سے ادھر بیٹھو، پلوٹے اور بھیا بھی ہمارے ساتھ ہیں بس دو منٹ کی تو بات ہوگی۔“ وہ گھبرائی سی اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تو اس کا دل کٹا۔

”السلام علیکم! پر جوش، کھنکھاتی، جذبات سے بھر پور آواز پر وہ سمٹ سی گئی۔  
”کیا حال ہیں؟ ماشاء اللہ بڑی خوب صورت لگ رہی ہو۔ خیر ہے نا۔“ بڑے والہانہ انداز میں اس کے بے سنورے سر اے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے گھورنے کو سر اٹھایا، مگر اس کے تیور دیکھ کر گھبرا کر سر جھکا لیا۔

”کیسا لگا سربراہ؟“ پشینہ کو اپنے جذبات ریشم کی طرح نرم محسوس ہوئے، سر اٹھا کر اسے دیکھا جس کی آنکھوں میں جذلوں کا ایک جہاں آباد تھا۔  
”کیا کارستانی؟“ اس کی محبت کے اس انداز کو اس نے کارستانی کہا تو وہ چیخا۔  
”وہ ہنسنے لگی، اسے ہنساتے دیکھ کر وہ بے خود سا آگے بڑھا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی خوشنمائی حرکت کرتا پشینہ نے پکارا۔

”زوار! میں ہمیشہ اسی حویلی میں رہنا چاہتی ہوں۔ میں بی بی جان اور بیبا جان کو اکیلے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“

زوار نے اسے ایک بل بغور دیکھا۔  
”بی بی جان نے تمہیں اپنا بیٹا بنایا ہوا ہے۔ تم شروع سے ہی اس حویلی میں رہے ہو۔ بیبا جان اور بی بی جان نے تم سے بہت سی امیدیں باندھ رکھی ہیں۔ بیبا قبیلے کی وجہ سے ایسا نہیں سوچتے، مگر ہم ہمیشہ اس حویلی میں رہو، یہ ان کی بھی خواہش ہے۔“ اس نے بھجکتے ہوئے دل کی بات کہہ دی تھی۔

”دیسے ہے تو یہ مراد لگی کے خلاف کہ میں گھر واماو بن کر رہوں مگر گھر واماو سے پہلے میں اس حویلی کا بیٹا ہوں اور بیٹے ہمیشہ اپنے گھر میں ہی رہتے ہیں بیگم! اس کی سنجیدگی کو اس نے ہنسی میں اڑایا تو اس کے ہونٹوں پر بڑی خوب صورت سی مسکان سمٹ آئی تھی۔  
”زوار! تم۔ تم بہت اچھے ہو۔“

”بس! نا تم از اور بی بی جان اور دیگر لوگ ادھر آ رہے ہیں۔ زوار لالہ جلدی سے بھاگنے کی راہ لیں۔“  
اس سے پہلے کہ زوار جوابا، ”کوئی خوب صورت سی کارروائی کرنا لیلیٰ کی آمد نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔ زوار بیبا جان کا خیال کرتے ہوئے جلدی سے باہر کی طرف نکلا اور پشینہ نے سکھ کا سانس لیا کہ زوار نے اس کی اپنی بڑی خواہش کو اتنی آسانی سے پورا کر دیا۔ اگر وہ بھی بیاہ کر اس حویلی سے چلی جاتی تو بی بی جان اور بیبا جان کو صدمہ کی جدائی حزیں تڑپا نے لگتی۔

☆☆☆

اگلی صبح نو بجے تک بھی کمرے سے نہ نکلی تو اسد کو تشویش لاحق ہوئی۔

رات کو وہ جب چپتی حسن سے بات کر کے کمرے سے نکلا تو بچن میں پانی پینے کی غرض سے گیا تھا، مگر وہاں سلیب پر رے میں چائے کے تین کپ دیکھ کر چونک گیا۔ اس کے لیے یہ انکشاف ہی بڑا زنت ناگ تھا کہ وہ ان کی گفتگو سن چکی ہے اور اس کے بعد اس نے کیا کیا اندازہ لگایا ہو گا۔ وہ سوچ سوچ کر ابھٹا رہا۔ دل تو چاہا کہ ابھی جا کر صورت حال واضح کر دے۔ مگر پھر اس کے مزاج اور تیوروں کا خیال کر کے رک گیا تھا، لیکن اب نو بجے تو وہ صبر نہ کر سکا۔

”صابح۔“ اس نے دروازے پر دستک دی۔  
”صابح۔“ اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو وہ قدرے پریشان ہو گیا۔  
وہ مسلسل اسے آوازیں دیتے دروازہ بجاتا چلا گیا تھا۔

”صابح۔“ اس کا نام ہونٹوں میں ہی اٹک گیا۔  
جب ایک دم دروازہ کھل گیا تھا۔ اسد کا دستک کے لیے اٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا تھا۔

”دستک دینے کا یہ کون سا انداز ہے۔ بہری نہیں ہوں میں۔“ اس نے اسد کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا تھا۔ چہرے سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ابھی منہ دھو کر ہاتھ دھو کر نکلی ہے۔  
”تم ابھی تک کمرے سے باہر نہیں نکلیں تو۔“

اس کاٹھے سے سرخ چہرہ اور بدلتی ہوئی دیکھتے اسد نے وضاحت کرنا چاہی تھی مگر اس نے درستی سے بات کاٹ دی تھی۔  
”مگر نہیں نکلی تھی میں۔“

”ابو تمہیں بلا رہے ہیں۔“ وہ مزید کچھ کہے بغیر اس کے کیلے چہرے پر ایک نگاہ ڈالتے سامنے سے ہٹ گیا۔ صابح حلب پیچھے اس کی جوڑی پشت کھینچے گئی۔  
وہ تپا ابو کے پاس جانے کی بجائے گھر کی صفائی



ستھرائی میں لگ گئی۔ دو گھنٹے بعد جب بھوک لگی تو ہاتھ دھو کر وہ کچن میں آئی اسد کو چولہے کے سامنے کھڑے دیکھ کر رک گئی۔

تو ابھی تک اس نے اور تیا ابو نے ناشتا نہیں کیا تھا ایسا پہلے بھی ایک بار ہوا تھا۔ وہ پیار بھی تو اسد نے خود ہی ناشتا تیار کر لیا تھا اور پھر آج اسے رات کی تمام گفتگو یاد آئی تو پھر اس کا غصہ بڑھنے لگا۔

اسد روٹی بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ دونوں توش کھا لیتے تھے، مگر تیا ابو صرف روٹی کا ہی ناشتا کرتے تھے۔ صبح کو شرمندگی ہی محسوس ہوتی۔

”پیچھے نہیں میں بناتی ہوں۔“ وہ اپنے غصے کو پس پشت ڈالے آگے بڑھی تھی۔

اسد نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر روٹی تیل کرتوے پر ڈال دی۔ صبح کو بڑی سکی کا احساس ہوا، اگر تیا ابو کی بھوک کا خیال نہ ہوتا تو پلٹ جاتی مگر۔

”میں نے کہا نہ کہ پیچھے میں بناتی ہوں۔“ اسد کو دوبارہ آنے کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھ کر اس نے فوراً ”آئے والا برتن اٹھالیا۔ اسد نے ایک سنجیدہ نگاہ اس پر ڈالی۔

”رہنے دیں، آپ جا میں یہاں سے، ہمیں عادت ہے سب کرنے کی۔“ خواہ مخواہ ہماری عادتیں خراب مت کریں۔“ اس کے لہجے میں پل بھر میں اجنبیت ود آئی تھی۔

”تو پھر اپنے لیے بنالیں، میں اپنے اور تیا ابو کے لیے بنالوں گی۔“ اس نے بھی اجنبیت سے کہا تو وہ خاموشی سے روٹی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اپنے لیے روٹی بنا کر پلٹ میں رکھ کر چولہا بند کر کے تو ایک طرف رکھنے کے بعد وہ آلیٹ، جو وہ شاید پہلے ہی تیار کر چکا تھا، لے کر کھانے کی میز پر بیٹھ کر ناشتا کرنے لگ گیا۔

اس کا یہ روپ پہلی بار صبح کے سامنے آیا تھا وہ ایک بل کو حیران کھڑی رہ گئی تھی۔ اسے ناشتا کرتے دیکھ کر اس نے سر جھٹکا پھر دوبارہ چولہا جلا کر توڑ رکھا اپنے لیے پراٹھا اور تیا ابو کے لیے ساہو پھلکا بنالیا، پھر

ٹہلے کر تیا ابو کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ قرآنی تفسیر سے متعلق کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے اسے دیکھ کر سر اٹھالیا۔

”آج بہت سوئیں تم؟“ اس نے جیسے ہی میز پر ٹہلے رکھی تو انہوں نے کتاب بند کر کے تپائی پر رکھ دی۔

”بس، رات اچھی طرح نیند نہیں آئی، اس لیے صبح جلد آنکھ نہیں کھل سکی۔“ ان کے سامنے کھانا رکھتے اس نے بتایا تو وہ مسکرا دیے۔

”رات نیند کیوں نہیں آئی تھی؟“ وہ خوش دلی سے پوچھ رہے تھے جبکہ صبح کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

”بس پچھلی زندگی کی باتیں یاد آتی رہیں، ائی، ابو، حماد۔“

تیا ابو نے اب کے بغور دیکھا تو اس کی آنکھوں کے سوچے پوئے واضح دکھائی دیے۔

”کیا تم حاد کو بھول نہیں سکتیں؟“ ان کے لہجے میں آزدگی سی سمٹ آئی تھی۔

اس کے سامنے ناشتا رکھا ہوا تھا، مگر ابھی تک اس نے ایک لقمہ بھی نہ لیا تھا۔ تیا ابو اس کا چہرہ دیکھتے رہ گئے۔

”مگر میں تمہیں ساری زندگی یوں گزارنے کی حماقت بھی نہیں کرنے دوں گا۔“ انہوں نے ٹہلے کھاکر خاصی برہمی سے کہا تو وہ بے بسی سے انہیں دیکھنے لگی۔

”تیا ابو! یہ دل کے معاملات ہیں، آپ زبردستی مت کریں پلیز۔“ اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ مجتبیٰ حسن صاحب دھکے سے اسے دیکھ گئے۔

”صبح پیلیہ زبردستی نہیں ہے، تم ابھی کم عمر ہو، جذباتی ہو، تم نہیں سمجھ سکتیں کہ تمہیں مستقبل میں کن مسائل اور حالات کا سامنا کرنا ہو گا۔ یہ فیصلہ تمہاری زندگی گزارنے سے ہزار درجے بہتر ہے میں نے اسد سے بات کر لی ہے وہ راضی ہے میں نے سوچا ہے کہ اس سے پہلے کہ موت آچنچے میں تم دونوں کے

ذہن سے بیکدوش ہو جاؤں۔“ ان کا انداز لہجہ فیصلہ کن تھا۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھ گئی۔

”تمہارے ماں باپ زندہ ہوتے تو میں کبھی زبردستی نہ کرتا، راجیہ یہاں ہوتی تو بھی کوئی پریشانی نہ ہوتی کہ میرے بعد وہ تمہارا اچھا برا سوچنے والی ہے۔ اسد تمہارے لیے ایک غیر محرم ہے۔ وہ کب تک تمہیں چھٹا فراہم کر سکتا ہے۔ کل کو اس نے بھی شادی کرنا ہے اور آنے والی نہ جانے کیسی ہو، وہ تمہیں برداشت کرے یا نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ تمہیں کہیں اور پناہ ملے ہوئے مجھے خود بھی خوف آتا ہے۔ اسد اچھا انسان ہے۔ کوئی کمی خامی نہیں، میں نے راجیہ سے رات فون پر تفصیلی بات کی تھی، اسے میرے فیصلے سے خوش ہوتی ہے۔“ وہ لب پیچھے پیچی رہی۔

”صبح بیٹے یقین کرو اسد بہت اچھا انسان ہے، ان دو سالوں میں تم نے اسے اچھی طرح دیکھا ہے، اس کا مستقبل بہت روشن ہے۔ اگر تم اس وجہ سے خوف زدہ ہو کہ نہ جانے وہ کس خاندان کا خون ہے تو بیٹا اس چھوٹی سی بات کو ذہن میں جگہ مت دو۔ اس کے انداز و اطوار، مزاج و شہادت سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی عام گھرانے کا چشم و چراغ نہیں ہے۔ نہ جانے کیا حالات تھے کہ وہ مجھے اس حالت میں ملا۔ نہ جانے کس کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور کس کے دل کا کلوا ہے۔ خدا خواست غلط باتھوں میں بڑ جاتا تو کیا مستقبل ہوتا۔ میں نے اسے اپنا نام دیا۔ لکھایا، پڑھایا، معاشرے میں ایک مقام دیا۔ لوگ اسے میرا بیٹا ہی کہتے ہیں۔ وہ میرے لیے دوسرا حماد ہے۔ اور ایک باب اپنی بیٹی کے لیے ایسا ہی بڑ چاہتا ہے۔“

وہ نہ جانے اسے کیا کیا سمجھا رہے تھے وہ ایک دم خاموش ہو گیا اور ان کے کمرے سے نکل آئی تھی۔



اس کے اور تیا جان کے درمیان اک خاموشی سی جگمگ جاری تھی اسد کو صورت حال کا اندازہ تھا۔ مگر وہ خاموش تھا۔ مجتبیٰ حسن صاحب نے اپنا فیصلہ منوانے

کے لیے اس سے بات چیت بند کر دی تھی۔ انہیں لگتا تھا کہ اس طرح وہ صبح کو قاتل کریں گے۔ مگر اندر ہی اندر اس خاموش پالیسی پر تینوں ہی دگر تھے اور پریشان تھے۔

صبح عجب آزدگی کی کیفیت میں گھری ہوئی تھی۔ رات میں اسے نیند نہیں آ رہی تھی تو باہر نکل آئی تھی، کچھ دیر تو پر آمدے کی میز چڑھوں پر کم صم پیچی رہی، پھر اچانک تیا ابو کے کمرے سے دھڑام سے کوئی چیز گرنے اور ٹوٹنے کی آواز آئی تو وہ چونک گئی، اٹھ کر کمرے کی طرف بھاگی۔ دروازہ کھول کر اندر بھانکا تو اوسان خطا ہو گئے۔ تیا ابو شاید پانی پینے کے لیے اٹھے تھے، سنبھل نہ سکے اور گر پڑے۔ گلاس ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

اس نے دوسرے بستر کی طرف دیکھا، وہ خالی تھا، اسد بستر پر نہ تھا۔ تیا ابو کی طبیعت کی وجہ سے اسد زیادہ تر اسی کمرے میں سوتا تھا۔ مگر جس دن اس کے آس کا کام ہوتا تو وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا نہ کہ مجتبیٰ حسن دُشرب نہ ہوں۔

وہ دو ڈر کر ان کے قریب پہنچی اور پوری قوت لگا کر ان کو اٹھانے کی کوشش کی، مگر جب وہ انہیں سنبھال نہ پائی تو اسد کے کمرے کی طرف بھاگی۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ تیزی سے اندر داخل ہوتے ہی اس نے بستر پر دراز اسد کے اوپر سے چادر پھینکی۔

وہ ہڑبکا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ سمجھی بھی اس کے کمرے میں داخل نہیں ہوئی تھی اور اب رات کے اس پرہ؟ اس کی حیرت نشینی تھی۔

”وہ اسد! تیا ابو۔“ باقی کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ کام پٹنا کر لیٹا تھا۔ فوراً بستر سے اترتا اور تیا ابو کے کمرے کی طرف بھاگا۔

تیا ابو بے ہوش ہو چکے تھے۔ ”ابو۔“ اس نے سیدھا کیا، مگر کوئی حرکت نہ ہوئی تھی۔ ان کی حالت دیکھ کر وہ رو پڑی تھی۔ ”اسد پلیز ڈاکٹر کو بلاؤ، یا ان کو اسپتال لے



جائیں۔“ اس نے وحشت سے اسد کا بازو جھنجھوڑا  
تھا۔ اسد نے انہیں بستر پر لٹا دیا تھا۔  
”میں انکل امتیاز کی طرف جاتا ہوں۔ اس وقت  
ڈاکٹر ز کا تو ملنا مشکل ہی ہے۔ میں ان کے ساتھ ابو کو  
لے کر جاتا ہوں۔“  
وہ غلت میں کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد  
لوٹا تو اس کے ساتھ انکل امتیاز تھے۔  
وہ انکل امتیاز کے ساتھ جتنی حسن کو لے کر  
ہسپتال چلا گیا۔ ساری رات وہ پریشانی میں مبتلا رہی۔  
صبح اس نے ہسپتال سے صبح کو حیرت کا فون کر دیا۔  
دوپہر میں اسد اسے لینے گھر آیا تو کافی تھکا ہوا اور  
نڈھال لگ رہا تھا۔ ساری رات کی بھاگ دوڑ اور  
بے آرائی نے اسے کافی متاثر کیا تھا۔ اسد کو اس حالت  
میں دیکھ کر صبح شرمندہ سی ہو گئی۔  
”بہت تھک گئے ہیں۔ کھانا کھائیں گے۔“ اس  
نے بالوں میں انگلیاں چلاتے چلاتے رک کر اسے  
دیکھا۔ تھکے تھکے اعصاب لیے اس نے آنکھیں  
موند لیں۔  
”ہوں۔“ کچھ توقف کے بعد اس نے کہا تھا۔  
وہ کچن میں آگئی اس کے لیے کھانا بناتے ہوئے وہ  
عجب سے احساسات کا شکار ہوئی۔ کھانے کی ٹرے  
اس کے سامنے میز پر رکھی۔ آواز پر اسد نے آنکھیں  
کھولیں۔ ٹرے اپنی طرف کھسکاتے اس نے صبح  
سے بھی کھانے کو کہا تھا وہ خاموشی سے پیٹھ گئی۔  
”صبح۔! ابو جان کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔  
ڈاکٹر ز مکمل طور پر ناامید ہیں، کہہ رہے ہیں کہ اس  
انیک کے بعد ان کی حالت سنبھلنے کی بجائے مزید  
بگڑنے کا خدشہ ہے۔ دراصل وہ خود بھی اپنی دل پیاور  
ختم کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر ز کہہ رہے تھے کہ گھر میں ان پر  
خصوصی توجہ دیں۔ انہیں ایسا ماحول فراہم کریں کہ یہ  
نیشن سے دور رہیں۔“ انہیں انجانا کا دورہ پڑا تھا۔  
کھانا کھاتے دیکھے لب و لہجے میں اس نے ساری  
صورت حال بتائی۔ صبح کا ضبط بکھر کر گیا۔ پھوٹ  
پھوٹ کر رو پڑی۔

”رونے کا کوئی فائدہ نہیں صبح! آپ کو یہ ساری  
صورت حال اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ کا ان سے  
دُہرا رشتہ ہے۔ میرا بے شک ان سے خون کا کوئی  
رشتہ نہیں، مگر میں نے انہیں ہمیشہ باپ ہی تسلیم کیا  
ہے۔ جتنا آپ ان کے قریب رہی ہیں اتنا میں بھی  
نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں آپ ان سے بہت محبت  
کرتی ہیں، مگر پلےز آپ ان کو اس نیشن سے نکال  
دیں۔ اپنے لیے کوئی بہتر فیصلہ کر لیں۔ زندگی کبھی تنہا  
نہیں گزرتی، آپ کو زندگی میں ابھی نہیں تو آگے ضرور  
سارے کی ضرورت پڑے گی۔ میں اپنے لیے فورس  
نہیں کر رہا۔ آپ بے شک کسی اور کے لیے ہی سی  
رہاں کہہ دیں وہ اس دنیا سے جانے سے پہلے آپ کی  
فکر سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ آپ کو اپنے گھر میں پھر  
سے آباد کھنا چاہتے ہیں۔“  
دیکھے اور صبر سے بولے مجھے میں کہتے ہوئے اس  
نے ساری صورت حال واضح کر دی تھی۔ وہ گم گم سی  
ہنسی رہ گئی تھی۔ وہ جتنا مرضی جھٹلاتی لیکن تباہی ابو کے  
اس انیک کی وجہ وہ خود بھی تھی جس طرح وہ ان سے  
قطع تعلق کیے ہوئے تھے یہ صورت حال تو پیش آنا  
ہی تھی۔  
”آپ اچھی طرح سوچ لیں، آپ پر کوئی زبردستی  
کوئی دباؤ نہیں، خاص طور پر میری طرف سے تو قطعی  
نہیں۔ شادی بیاہ بچوں کا کھیل نہیں یہ عمر بھر کی بات  
ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ دل آباد نہ ہوں تو ایسا  
بندھن باندھنے کی بالکل ضرورت نہیں۔“  
اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اسد یوں اسے یہ  
سب سمجھا رہا ہوگا۔  
”میں ذرا پہنچ کر لوں، آپ بھی تیار ہو جائیں، پھر  
ہسپتال جاتے ہیں۔“  
وہ کھانا ختم کر چکا تھا۔ برتن سمیٹتے ہوئے آیا ابو کے  
لیے ریہی کھانا بناتے ہوئے عیار ہوتے ہوئے وہ  
عجب حشمت کا شکار تھی۔  
امتیاز انکل ہسپتال میں آیا ابو کے پاس ہی تھے۔  
اسد ان کی ہی گاڑی لے کر آیا تھا۔ صبح اس کے

ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی۔  
اسد نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے بغور دیکھا۔  
اس کی آنکھیں مزید سرخ ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا  
کہ وہ پھر خوب روئی ہے۔  
”اسد! آپ اچھی طرح جانتے ہیں، میری اور حماد  
کی ایجنٹ ایک دو دن کی بات نہ تھی۔ اس کی  
محبت توجہ اور پیار نے مجھے کبھی کچھ اور سوچنے کا موقع  
ہی نہیں دیا۔ میں حماد کے ساتھ بیاہ کر اس گھر میں آئی  
تھی اور حماد کے بعد کسی اور کا تصور۔ چاہے وہ کوئی  
بھی ہو۔“  
وہ جملہ اور اچھوڑ کر سبک اٹھی تھی۔ اسد لب  
ہینچے گاڑی چلا رہا تھا۔  
”آپ آیا ابو سے کہہ دیجیے کہ میں آپ سے نکاح  
کے لیے تیار ہوں۔“ روتے روتے اس نے ہاتھوں  
میں چروچھپالیا تھا اور اسد بس اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔  
\*\*\*  
مجھے حسن چند دن ہسپتال میں رہے تھے۔ ان کی  
طبیعت کچھ سنبھلی تو دو سچارج کر دیے گئے تھے۔ وہ گھر  
لوٹے تو بہت زیادہ لاغر ہو چکے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر  
صبح مزید وحشت زدہ ہو جاتی تھی۔ اسد کے کیا  
جذبات تھے۔ وہ بے خبر تھی، اس روز کے بعد  
بہر راست ان دنوں کی کوئی بات چیت نہیں ہو سکی تھی۔  
وہ رات کو انہیں دوا کھلانے آئی تھی۔ دوا کھلا کر  
اس نے تایا جان کے ہاتھ تھام لیے۔ آج ان کی  
طبیعت گزشتہ دنوں سے قدرے بہتر تھی۔  
”تایا ابو مجھے آپ کا فیصلہ قبول ہے میں اسد سے  
نکاح کے لیے راضی ہوں۔“ اوھر اوھر کی باتوں کے  
بعد اس نے کہا تو اس کی آواز زندہ گئی تھی۔  
پہلے تو وہ حیران ہوئے، پھر خوش ہو کر انہوں نے  
اسے والہانہ انداز میں اپنے سینے سے لگالیا تھا اور صبح  
کو نکالے دل کھول کر رونے کا موقع مل گیا ہے۔  
”تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا۔ تم میری ہی ہو  
رہی، چاہے حماد کی صورت یا اسد کی۔ لیکن رکھنا بیٹا!

اسد تمہیں بہت خوش رکھے گا۔ کوئی اور نہ جانے کیا  
ہوتا۔ میرا باہر دل ہی نہیں مانا۔ بہت عقل مندی کا  
فیصلہ کیا تم نے۔ اللہ تمہوں کو سدا خوش رکھے۔“ وہ  
اسے سینے سے لگائے مسلسل دعائیں دے رہے تھے۔  
اس کی خواہش تھی کہ نکل وغیرہ کی تقریب ساوگی  
سے ہو، خود اسد بھی شور مچانے کا قائل نہ تھا۔ مگر تایا  
ابو تو ہر طرح سے خوشی منانا چاہتے تھے دل کھول کر۔  
نہ نہ کرتے بھی اچھا خاصا انتظام کر لیا گیا تھا۔ وہ نکاح  
کے دن بہت خوش تھے۔ بغیر کسی سہارے کے وہ  
مہمانوں میں چل پھراٹھ بیٹھ رہے تھے۔ زندگی سے  
بھر پور موقعہ لگا رہے تھے۔  
نکاح کے بعد اسد پہلے مجتبیٰ حسن کے پاس ان کے  
کمرے میں آیا۔  
”تم ادھر؟“ اسد کو اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران  
ہوئے تو اسد جھینپ گیا۔  
”آج تو مجھ بوڑھے کو تنہا چھوڑ دو، جاؤ بیٹا! صبح  
انتظار کر رہی ہوگی۔ تم میری فکر نہ کرو، مجھے بس تم  
دونوں کی فکر تھی، بڑے عرصے بعد سکون محسوس کیا  
ہے اب اگر موت بھی آجائے تو کوئی غم نہیں۔ ایک  
خلیفہ تھی دل میں کہ میں دونوں بیٹوں میں انصاف  
نہیں کر پایا، تم بے شک منہ سے نہ کو مار باپ ہوں  
تمہارا، تمہارے دل کی خواہش مجھ پر آشکار نہ ہوتی تو  
کس پر ہوتی۔ آج میں سرخرو ہو گیا ہوں۔ جاؤ بیٹا! اپنی  
خوشیاں سمیٹو، میری ساری دعائیں تمہارے ساتھ  
ہیں۔“  
انہوں نے اسد کا چہرہ تھام کر پیشانی چومی، پھر اسے  
اپنے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا تو وہ باہر نکل آیا تھا۔  
اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اسد کے عجب  
سے احساسات ہو رہے تھے۔ گاڑی میں بیٹھی روئی  
صبح کی وہ ہاں اور الفاظ سدا بھولا تو نہ تھا۔ وہ اچھی  
طرح جانتا تھا کہ صبح نے صرف مجتبیٰ حسن کی خاطر  
ہاں کی ہے۔ اور کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا اس کی  
سرشت میں نہ تھا۔  
وہ کمرے میں داخل ہوا تو صبح کہیں بھی نظر نہ



آئی البتہ ہاتھ روم کا دروازہ بند تھا وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

صبح ہاتھ روم سے نکلی تو اس نے دیکھا وہ سادہ سوتی لباس میں بیٹوس تھی۔ اس نے نظریں چرائیں۔ اس نے صبح کو چند پل بغور دیکھا اور ایک گہری سانس خارج کی۔

”صبح! یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔ پہن لیتا۔“ اسد اس کے قریب آیا۔ پینٹ کی جیب سے ایک ڈبیہ نکال کر اس کی طرف بڑھائی تھی۔ ”کیا ہے؟“ ہاتھ بڑھا کر لینے کی بجائے اس نے صرف پوچھا تھا۔ اسد کے اندر سارے لطیف احساسات سرد سے ہو گئے تھے۔

”دیکھ لیں۔“ اسد نے ڈبیہ اس کے قریب رکھ دی۔ ”ابو ضرور پوچھیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ انہیں کسی بھی قسم کی تکلیف ہو۔ تمہارا دل نہ بھی چاہے تب بھی ضرور پہن لیتا۔ مجبوراً ہی سہی جہاں تک بات ہے تمہارے احساسات کی، میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں تکلیف نہ ہو۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ تم نے کن حالات میں اور کیونکر اس رشتے کے لیے رضامندی دی ہے۔ کم از کم میری طرف سے تمہیں کوئی شکایت نہ ہوگی۔“ اسے کہہ کر وہ الماری سے لباس لے کر ہاتھ روم میں گھس گیا اور وہ لباس اور زیور وغیرہ لیے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کچھ دیر بعد وہ اسد کے کمرے میں آئی تو وہ لیٹا ہوا تھا۔ ایک لمحہ گودوں کی نگاہ ملی وہ نظر جھکا گئی۔ خاموشی سے بستر پر آکر لیٹ گئی۔

\*\*\*

تایا ابو کا یوں چلے جانا اگرچہ اچانک نہیں تھا، مگر بہت برا صدمہ تھا۔ نئے دنوں تک تو صبح سنبھل ہی نہ سکی تھی۔ راجیہ باجی باپ کی وفات کی خبر سن کر فوراً پاکستان آ گئیں۔ چند ہفتے گھر میں مگر کب تک اپنا گھر مہر چھوڑ کر وہ یہاں ٹھہری رہیں۔ وہ صبح کو آنے والی زندگی سے متعلق ہزاروں نصیحتیں کرتے ہوئے

روانہ ہوئیں۔ صبح کے آسوں میں اہستہ اہستہ آنے لگی۔

اسد صبح کا خیال رکھنے کی پوری کوشش کرتا رہا۔ اس کے احساسات و جذبات کا خصوصی خیال رکھتا تھا۔ وہ غیر محسوس انداز میں اسد پر انحصار کرنے لگی تھی۔ اس کی موجودگی و حواس دہنی تھی اور جب اسد نے تایا کی وفات کے بعد دوبارہ سے اس جانا شروع کیا تو صبح تنہائی کے احساس میں گہری چلی گئی تھی۔ وہ جتنی دیر تک گھر سے باہر رہتا وہ مختلف اوبام و نظرات کا شکار ہو کر ہوتی رہتی جب وہ گھر آتا تو اسے لگتا کہ کسی مضبوط ساتھیان کے سائے میں آگئی ہے۔

وہ ایک ذمہ دار منصب پر فائز تھا اور اس کے ذمے آفس کی طرف سے ایک خاص پروجیکٹ تھا۔ جس کی کامیابی کی صورت میں اسے کراچی کمپنی کی برانچ کا انچارج بن کر بھیجے جانے کے بہت امکانات تھے۔ اس میں اسے کافی مراعات ملنے کی توقع تھی۔ اس کا پروجیکٹ پاس ہو گیا اور اسے کراچی شفٹ ہونے کے احکامات مل گئے۔

مجتبیٰ حسن کی وفات کے بعد یہ پہلی خوش خبری تھی وہ خاصاً مسرور سا گھر لوٹا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صبح سو گئی ہوگی، مگر جب وہ اندر آیا تو صبح کوئی لاؤنج میں بیٹھ کر دیکھ کر رک گیا۔ ”سلام علیکم!“ صبح نے خاموشی سے اسے دیکھ کر سر ہلادیا۔

پہلے پہل تو صبح اس کی آمد سے قطعاً بے پروا رہتی تھی، مگر تایا اب کی وفات کے بعد وہ ہمیشہ گھر آنے پر اسے اپنی منتظر مٹی تھی۔

”کھانا کھا لیں گے؟“ وہ کھڑی ہوئی۔ ”نہیں۔“ سواری میں صبح بیٹا بھول گیا تھا کہ آج میٹنگ تھی۔ اسی لیے لیٹ ہو گیا اور ڈرنر بھی وہیں کر لیا تھا۔ ”صبح کے چرے پر اک تاریک سا سایہ لہا گیا تھا۔

”مگر چائے مل جائے تو۔“ وہ خاموشی سے سر ہلا کر کچن کی طرف چلی آئی۔

اسد کے لیے چائے بناتے ہوئے وہیں کھڑے کمرے غلبت میں چند لمحے لینے لگی۔ چائے دم پر تھی، جب اس نے آخری لقمہ لیا تھا۔

”ہم نے کھانا نہیں کھایا تھا؟“ مائی گاڈ! رات کے بارہ بج رہے ہیں اور تم ابھی تک بھوک پیٹتی ہوئی تھیں۔“ وہ برتن تنگ میں رکھ رہی تھی کہ اسد کی آواز پر چونک کر لیٹ کر دیکھنے لگی۔ وہ نہ جانے کب آکھڑا ہوا تھا اور اب شرمندگی سے بول رہا تھا۔

”بس یوں ہی پہلے بھوک نہیں تھی، ابھی لگی تو کھا لیا۔“ وہ جس انداز میں کھڑا تشویش زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، وہ صرف یہ ہی کہہ سکی تھی۔ اسد کو اتنا لیٹ ہونے پر ملال ہوا تھا۔

”ایم سواری، مجھے تمہیں بتا دینا چاہیے تھا کہ میں لیٹ ہو جاؤں گا، بس! یاد نہیں رہا۔“ وہ خاموشی سے تنگ میں چائے ڈالنے لگی تو اسد کو اس کا انداز خاصاً مضطرب لگا۔

”کمرے میں ہی لے آؤ۔“ وہ کہہ کر لیٹ گیا تو وہ کمرے کے لیے کمرے میں چلی آئی۔ اسد کپڑے بدل کر استین کینڈیوں تک لپیٹتے ہوئے بستر پر آ بیٹھا۔

”مجھے اندازہ ہے کہ میں کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گیا ہوں۔ تمہیں زیادہ وقت نہیں دے پا رہا، ایم سواری! آئندہ ایسا نہیں ہوگا، میں کوشش کروں گا کہ وقت پر گھر آ جایا کروں۔“

”مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں۔ میں آپ کے فرائض اور حجاب کے مسائل سمجھ سکتی ہوں۔ بے فکر رہیں، میں مطمئن ہوں۔“ بظاہر صبح کے الفاظ سادہ تھے، مگر اسد کو ان میں خود اذیتی کی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔

”ایک خبر ہے، میرے لیے تو یہ ایک اہم نیوز ہے۔“ اسے کراچی کی نئی برانچ کے انچارج کے طور پر وہاں شفٹ کیا جا رہا ہے۔ ”کچھ توقف کے بعد اسد نے کہا تو وہ چونک کر اسد کو دیکھنے لگی۔ ایک دم تکلیف کے گہرے آثار صبح کے چرے پر واضح پڑے جاسکتے تھے وہ لب بلیغ تھی۔

”میں نے اس پروجیکٹ کے لیے بے پناہ کوشش کی ہے، دن رات کی تھیر کے بغیر تمام صلاحیتیں استعمال کی ہیں، اگر میں یہ کہوں کہ یہ میری زندگی کی ایک بہت بڑی کامیابی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ میں خود بھی کراچی شفٹ ہونا چاہتا تھا۔“

وہ بتا رہا تھا اور صبح کے اندر صدمے سے مدھال ہو جانے والی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ یعنی وہ اسے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ وہ کم کم سی خالی مک لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسد نے دردیدہ نظروں سے صبح کے چرے کے تاثرات جانچنا چاہے، مگر وہ اس کے ہاتھ سے بھی خالی مک لیے باہر نکل گئی تھی۔

اس کے جواب نہ دینے پر وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اس کے اور صبح کے درمیان اجنبیت کی دیوار رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد بھی بدستور قائم تھی۔

وہ کیسے اسے اپنے وجود کا پتہ ہونے کا احساس دلاتا؟ جبکہ اول روز سے صبح کا رویہ اس کے ساتھ ایک اجنبی کا سا تھا۔ اس نے اپنے اور اس کے درمیان اوپچی اوپچی دیواریں قائم کر رکھی تھیں۔ وہ اس کی ناراضی کی وجہ سمجھ رہا تھا۔ وہ بستر پر آکر لیٹتی تو اس نے مخاطب کیے بغیر کہا۔

”ٹھیک ہے میں نے لاپرواہی برتی، مگر تمہاری ذمہ داری سے کب انکار کیا ہے میں نے۔“ صبح بغیر جواب دیے کر وٹ بدلے رو رہی تھی، اس نے فرائض اور حجاب کے مسائل سمجھ سکتی ہوں۔ بے فکر رہیں، میں مطمئن ہوں۔“ بظاہر صبح کے الفاظ سادہ تھے، مگر اسد کو ان میں خود اذیتی کی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔

”صبح! اس کی پکار میں دل کے سارے جذبے بندھ آئے تھے۔“ وہیں بائیں ہاتھ رکھ کر وہ اس پر جھکا اور صبح کے آنسو اس کے رخساروں پر ہی گھس گئے تھے۔

”میں نے اگر بحالت مجبوری آپ کو قبول کیا تھا تو آپ نے بھی مجبوراً یہ نہ پڑا کیا۔“ بھرا تھا۔ ہم دونوں کے اپنے اپنے مفادات تھے۔ آپ تایا ابو کو خوش کرنا



چاہتے تھے اور مجھے بہر حال سرچھپانے کے لیے چھت چاہیے تھی۔ اگر آپ مجھے ہیں کہ میں نے اپنی غرض میں آپ کو قبول کیا ہے تو آپ کوئی حتمی فیصلہ کر لیں۔ چھوڑ دیں مجھے۔

وہ اس وقت جذباتیت کی انتہا پر تھی جو منہ میں آیا کہتی جا رہی تھی۔

”پلیز صبح اچپ ہو جاؤ، تمہیں اندازہ ہے؟ تم کیا کہہ رہی ہو؟ یہ رشتہ میں نے صرف ابو کی خواہش پر نہیں پابندھا دل کی پوری رضامندی سے تمہیں اپنایا ہے۔ تم میری اولین خواہش تھیں صبح۔“

وہ آج اس کے سامنے ہار گیا تھا۔ جو جذبے برسوں دل کے نہاں خانوں میں چھپا کر رکھے تھے آج اس پر آشکار کر دیے تھے۔ مگر دوسری طرف وہ متوجہ ہی نہیں تھی۔ اس قدر خوب صورت اظہار پر بھی اس کی طرف سے کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا۔

”صبح۔“ بڑی محبت و لگاؤ سے اسے پکارتے ہوئے اسد نے دونوں کے درمیان قائم خود ساختہ اتان کی دیوار کو گرانے میں پہل کرنا چاہی تھی۔ اس کے وجود کو اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لیا تھا۔

”آپ مجھے چھوڑ کے چلے جائیں گے؟“ اس نے بہت کرب سے پوچھا تھا اور جواب ”اسد حیران رہ گیا۔“ ہرگز نہیں میں بھلا تمہیں کیوں چھوڑ کر جاؤں گا، تم ہر جگہ میرے ساتھ رہو گی۔“ اس نے بے یقینی سے دیکھا۔

”وہاں مجھے رائش مل رہی ہے، تم بس پیکنگ کرو تم میرے ساتھ چلو گی۔“

اسد نے اسے بھرپور الفاظ اور انداز میں یقین دلانے کی کوشش کی، مگر اس نے کچھ نہ کہا بس تھوڑی دیر تک دیکھتی رہی، پھر کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں۔

\*\*\*

پشینہ اور زوار خان کی شادی ہو گئی تھی۔ بی بی جان مطمئن تھیں۔ پشینہ اور زوار ان کے پاس تھے۔

دونوں کو بے پناہ خوش دیکھ کر بی بی جان کے دل کے اندر اطمینان سرایت کرنا چاہا تھا۔ صدمہ کے دکھ کے بعد ان کی ساری امیدیں تینوں بیٹیوں کی خوشیوں سے ہی وابستہ تھیں۔

سب لوگ کہتے تھے کہ صدمہ اس دنیا میں نہیں مگر ان کا دل اس حقیقت کو نہیں مانتا تھا۔ حتیٰ کہ خان زکام اللہ خان بھی اس حقیقت کو مان چکے تھے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے، مگر ان کی ممتا کو ایک یقین تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں ضرور ہے۔ دنیا کے کسی گوشے، کسی کونے میں وہ سانس لے رہا ہے۔ وہ اس کے وجود کی حرکت ابھی بھی اپنے وجود میں محسوس کرتی تھیں۔

بی بی جان ملازمہ سے اپنی الماری کی صفائی کروا رہی تھیں۔ جب ان کی نگاہ سرخ مخملیں اہم پر پڑی۔

”میرا! یہ اہم نکال دو ذرا۔“ میراں نے اہم نکال دیا۔ وہ اسے لے کر بستر پر بیٹھ گئی تھیں۔ یہ ان کے بچوں کی تصاویر پر مشتمل پرانا اہم تھا۔ کئی تصویروں کو دیکھتے ہوئے ایک تصویر پر ان کی نظر جم گئی تھی۔

خان صاحب نے صدمہ کو گود میں اٹھایا ہوا تھا جبکہ پلوٹے ان کی گود میں تھی۔ زرمجنے بڑی تھی وہ ان کے پلوٹے میں کھڑی تھی۔ البتہ پشینہ بعد میں پیدا ہوئی تھی اس لیے وہ تصویر میں نہیں تھی۔

ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں تو انہوں نے اگلی تصویر پر نگاہ ڈالی۔ مولیٰ مولیٰ آنکھوں والا دوسرا صدمہ وا کر میں بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے بے اختیار تصویر کو ہونٹوں سے چھو لیا۔

”بی بی جان۔۔۔ زوار، سجاد لالہ کے پاس جا رہے ہیں، مجھے بھی ساتھ لے جا رہے ہیں۔“

پشینہ ایک دم کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ روانی میں کہتے ہوئے وہ اچانک رک گئی۔

”بی بی جان! آپ رو رہی تھیں؟“ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اس طرح اس کے دل تک رسائی تک پہنچ چکی تھی۔ اس وقت بھی وہ دوسرے کو لانا تو گھر پر نہیں تھی، آج اسے کوئی کام تھا جسے پناکار وہ دیکھا اس جانے کی بجائے گھر آیا تھا۔

”کتنی بار کہا ہے آپ کو، بی بی جان! کہ موت دیا کریں اور یہ اہم آپ کو گس نے نکال کر دیا ہے، میں

نے سب سے اوپر دراز میں چھپا کر رکھا تھا۔“

”دل بی جان کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔“ انہوں نے خود کو سنبھالا تھا۔

”زوار کا تیار ہی تھی۔ وہ سجاد لالہ کے ہاں ساتھ چلنے کی ضد کر رہے ہیں، کمرہ رہے ہیں چند دن کی بات ہے، آؤ ننگ ہو جائے گی۔“

”ضرور جاؤ، یہ ہی دن تو ہوتے ہیں گھونٹنے پھرنے کے۔“

”پھر میں زوار سے کہہ دیتی ہوں کہ وہ انتظامات کر لیں؟“ انہوں نے خاموشی سے سر ہلادیا تھا۔

”بی بی جان! یہ اہم میں اپنے کمرے میں لے کر جا رہی ہوں۔ اب آپ کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔“

خدا خوا آپ طبیعت خراب کر لیتی ہیں اپنی۔“ اس نے اہم اپنے قبضے میں کر لیا۔ بی بی جان نے کچھ کہنا چاہا، مگر پھر خاموش ہو گئیں۔

تصویروں نظر آتے ہیں۔ او جھل ہو سکتی تھیں، مگر جو تصویر دل پہ نقش تھی اس کو وہ کیونکر دور کر سکتی تھیں۔

\*\*\*

کراچی شفٹ ہونے کے بعد اسد نے صبح کا بھرپور خیال رکھنے کی کوشش کی تھی۔ آس کے بعد سارا وقت وہ گھر پر ہی گزارنا تھا۔ اس کا رویہ اسد کے ساتھ قدرے بہتر ہوا تھا۔ مگر درمیان میں ایک ان

دیکھی دیوار اب بھی حائل تھی جس نے اسے عبور کیا تھا اور نہ ہی اسد نے ایسی کوشش کی تھی۔ صبح کی ایک بار کی بے یقینی کے بعد اس نے آہستہ آہستہ صبح کے ساتھ اپنے سلوک کو اس قدر نرم کر لیا تھا کہ

صبر خود اس کی محبت اس کے احساسات و جذبات کو سمجھ جائے شاید اسی طرح اس کے دل تک رسائی ممکن ہو سکتی تھی۔ اس وقت بھی وہ دوسرے کو لانا تو گھر پر نہیں تھی، آج اسے کوئی کام تھا جسے پناکار وہ دیکھا اس جانے کی بجائے گھر آیا تھا۔

”پشینہ! یہ اسد ہیں میرے بہنوئی اور اسد! یہ پشینہ ہے۔ راشدہ کی دیواری اور راشدہ کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔“ صبح نے اسد کو اسی طرح کھڑے دیکھ کر

تعارف کروایا۔ اسد سلام کر کے وہاں سے نکل گیا۔

”بڑا پیارا گھر سجایا ہوا ہے۔“ پشینہ کی نگاہوں میں ستائش تھی۔ اسد کے چلے جانے کے بعد وہ آرام سے بیٹھ گئی تھی۔

”کہاں گئی ہیں بیگم صاحبہ؟“ اس نے ملازمہ سے دریافت کیا تھا، صبح کی تھمائی کا احساس کرتے ہوئے اس نے یہاں شفٹ ہونے کے فوراً بعد ایک کل وقتی ملازمہ کا انتظام کیا تھا کہ صبح کو اکیلے پن کا احساس نہ ہو۔

”وہ جی ساتھ والے بنگلے کی راشدہ باجی آئی تھیں، وہ انہیں اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔“

ملازمہ ہٹا کر چلی گئی تھی۔ اسد کو خوشی ہوئی کہ یہاں آکر گھر کی چار دیواری میں مقید ہونے کی بجائے صبح

نے باہر کی دنیا میں بھی دلچسپی لینا شروع کی تھی۔ وہ وقت گزاری کے لیے ٹی وی دیکھنے لگا تھا جب

صبح کے ہمراہ راشدہ (جسے اسد بابا اپنے گھر دیکھ چکا تھا) اور ایک اجنبی چہرے کو۔ داخل ہوتے دیکھ کر

وہ سیدھا ہوا۔

”السلام علیکم؟“ صبح اسے خلاف معمول گھر میں دیکھ کر چونکی۔

”وعلیکم السلام!“ راشدہ اور دوسری لڑکی دروازے پر ہی رک گئی تھیں۔

اسد اسراراً ”گھر آہو گیا تھا۔ پشینہ نے اپنی چادر اپنے چہرے پر درست کی۔ وہ کوئی باقاعدہ شرعی پردہ نہیں کرتی تھی۔ یونیورسٹی میں بھی اس نے پردہ نہیں کیا

تھا۔ مگر چادر اس نے ہمیشہ اس انداز میں لی تھی کہ اس کا آدھے سے زیادہ چہرہ چادر کی اوٹ میں آجاتا تھا۔ یہ

ہی ان کی بی بی جان کی تعلیم تھی۔

”راشدہ اور پشینہ آؤ پلیز بیٹھو نا۔“ صبح کے کہنے پر پشینہ اسد کی طرف دوسری نظر ڈالے بغیر صوفے پر

راشدہ کے ہمراہ ٹک گئی تھی۔

”پشینہ! یہ اسد ہیں میرے بہنوئی اور اسد! یہ پشینہ ہے۔ راشدہ کی دیواری اور راشدہ کو تو آپ جانتے ہی

ہیں۔“ صبح نے اسد کو اسی طرح کھڑے دیکھ کر تعارف کروایا۔ اسد سلام کر کے وہاں سے نکل گیا۔

”بڑا پیارا گھر سجایا ہوا ہے۔“ پشینہ کی نگاہوں میں ستائش تھی۔ اسد کے چلے جانے کے بعد وہ آرام سے بیٹھ گئی تھی۔



کراچی میں اسد کو راشدہ کے برابر میں گھر ملا تھا۔ پہلی بار راشدہ ان کے گھر آئی تھی وہ سری بارہ خود اگر صبح کو ساتھ لے گئی تھی۔ راشدہ سے صبح کی کافی دوستی ہو گئی تھی۔ اب اسے پشینہ بھی بہت پسند آئی تھی۔

پشینہ ستائشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہ ٹیلی فون اسٹینڈ پر رکھی بڑی سی تصویر پر ٹھہر گئی تھی۔

مجتبیٰ حسن کے ساتھ کھڑے دائیں بائیں بھرپور دلکش منظر اہٹ ہوئے۔ اسد اور حماد کا بڑا خوبصورت انداز تھا۔ اسد کو یہ تصویر بہت پسند تھی۔ لاہور میں بھی یہ تصویر اس کے کمرے میں سائڈ ٹیبل پر لگی ہوئی تھی اور اب یہاں بھی۔

”یہ کون ہیں؟“ پشینہ نے تصویر ہاتھ میں لے لی تھی۔ نہ جانے تصویر میں ایسی کون سی بات تھی کہ پوچھ بیٹھی۔

”یہ میرے تایا ابو ہیں، ساتھ میں یہ حماد اور یہ اسد ہیں۔ اسد سے تو تم ابھی ملی ہو۔“ تایا ابو اور حماد اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔“ وہ اب بھی اس ذکر پر آرزو سی ہو جاتی تھی۔ دکھ خود بخود آوازیں گل گیا تھا۔

”اوپر ایم سوری۔“ وہ شرمندہ سی ہو گئی، مگر نظریں تصویر پر جیسے جم گئی تھیں۔ تصویر میں اسد اور حماد دونوں تھے، مگر پشینہ کی نظریں اسد کے مسکراتے چہرے میں الجھ گئی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس نے پہلے بھی یہ چہرہ نہیں دیکھا ہے یہ چہرہ اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

”صبح! کیا تمہیں ایسا لگتا ہے کہ ہم پہلے بھی کہیں ملے ہیں؟“ اس نے صبح سے ہی پوچھ لیا تھا۔ ”ہو سکتا ہے میں یہیں کراچی میں ہی بی بی بومھی ہوں، شادی کے بعد لاہور شفٹ ہو گئی تھی۔ مگر اب اسد کی پھر یہاں شفٹ ہو گئی ہے۔“

”لیکن میں پہلی دفعہ کراچی آئی ہوں، تمہیں تو میں نے پہلی بار ہی دیکھا ہے، مگر لگتا ہے تمہارے شوہر کو کہیں دیکھا ہوا ہے، مگر کہاں؟ یاد نہیں آ رہا ہے۔“

صبح نے حیران ہو کر دیکھا۔ ”ہو سکتا ہے تمہیں وہم ہوا ہو؟ اسد اور صبح ابھی چند دن پہلے ہی یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔“ راشدہ نے ٹوکا تو اس نے مزید کچھ کہنے کی بجائے تصویر دوبارہ اسٹینڈ پر رکھ دی تھی۔ مگر اس کا ذہن الجھ چکا تھا۔

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد راشدہ اور پشینہ چلی گئیں وہ اسد کے پاس آئی۔

اسد کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ”اسد! کھانا لگاؤں؟“ راشدہ کے ہاں جانے سے قبل وہ کھانا تیار کر چکی تھی۔ اس نے کہا تو اسد نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسد کا انداز کچھ ایسا تھا کہ صبح کو لگا وہ اس ماحول سے بالکل نکتا ہوا ہے۔

”میں کھانے کا پوچھ رہی تھی؟“ اس کی کیفیت پر حیران ہوتے اس نے پھر سوال دہرایا تھا۔ پہلے تو نہیں، مگر اب وہ اسد پر توجہ دینے لگی تھی۔ وہ اس پر غور کرنے لگی تھی۔ جہاں اس کی شخصیت کے بہت سے راز اس پر عیاں ہوئے تھے۔ وہاں اسے یہ احساس بھی شدت سے ہونے لگا تھا کہ اکثر وہ سوچتے سوچتے کہیں کھو جاتا ہے۔ وہ اس کیفیت کا محرک نہیں جانتی تھی۔ سو الجھ جاتی تھی۔ اپنی کنفییاں مسئلے اس نے سر ملا دیا تھا۔

”کیا بات ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ ایک تو اس کا جلدی آجاتا اور اوپر سے یہ کم صم انداز وہ متشکری پوچھ رہی تھی۔

”ہاں۔ ٹھیک ہوں۔“ وہ ہی الجھا انداز۔ ”مگر مجھے لگتا ہے کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سارا دن آفس میں بڑی رہتے ہیں اسی لیے تنہا ہو جاتی ہے۔ اتنا کام کا لو کیوں ڈالتے ہیں خود؟ اس طرح تو آپ کی صحت خراب ہو جائے گی۔“

وہ بھی تھی کہ شاید کام کی زیادتی ہے۔ اس نے ہلکے سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اسد نے حیران ہو کر صبح کا متشکر انداز دیکھا۔ خاص طور پر یوں پیشانی چھوئے اس کے اندر خوش گوار سا احساس جاگ اٹھا۔ ایسے لگا جیسے جس زہ ماحول میں دل کو معطر کرنے والا ایک

جسٹس کے لیے ہوتی تھی، مگر اب یہ مہلا۔ ”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے دل کی خواہش پر اس کے سبک نرم ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں قحام لیے تھے۔

صبح کی گردن میں اپنا دیا گیا لاکٹ دیکھ کر اسد کے اندر عجب سر مستی سی چھائی تھی۔ شادی کے بعد اس نے بظاہر یہ لاکٹ پن لیا تھا، مگر تباہی کی وفات کے بعد اس نے انار دیا تھا اور اب پھر یہ اس کی گردن میں تھا۔

یعنی وہ بدل رہی تھی۔ یہ خوش گوار احساس تھا۔ اسد نے تو صرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ مگر صبح کو لگا وہ لمحوں کی قید میں جکڑی گئی ہے۔ اسد کی نظروں کا ار کاڑھا تھا اس کے ہاتھ کا کاس بجواس کی گردن پر لپٹے لاکٹ کو چھیڑ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ میں سیٹھی گئی۔

بیشہ کی طرح وہ اس کا ہاتھ جھگکنہ بنی تھی۔ اسد کی نظروں میں ایسی لپک تھی کہ اس کا دل اٹھل پھٹل ہونے لگا۔ اسد کی موجودگی میں اس پر ایسی کیفیت پہلے کبھی طاری نہ ہوئی تھی۔

”صبح!“ اس نے اس کے مقابل کھڑے ہوتے بڑی محبت سے پکارا۔ اس نے چہرہ موڑنا چاہا، مگر اسد نے ایسا نہ کرنے دیا۔

”پلیز صبح! تم نہیں جانتے تم میرے لیے کیا ہو؟ میں تمہیں دیکھتا ہوں تو زندگی کا مقصد یاد آنے لگتا ہے اور تم ایک پل کو نظر نہ آؤ تو لگتا ہے میں اندر سے خالی ہو گیا ہوں۔“

بے حد جذباتیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پورے استحقاق سے اسد نے اسے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ اسد کی نظروں کا وہ المانہ پن اور مسلسل تنگ ہوتی گرفت۔ ہر چیز پر چیخ کر اعتراف کر رہی تھی کہ وہ اس کے لیے کس قدر خاص ہے۔ وہ اس کی زندگی میں کیا مقام رکھتی ہے۔ صبح کو اپنا آپ چھلکا محسوس ہو رہا تھا۔ دل تھا کہ سینہ توڑ کر ہارنے کو بے تاب۔

اس نے کچھ کتنا چاہا۔ مزاحمت کرنا چاہی، مگر سارے حوصلے بھر بھری مٹی کی طرح ڈھس گئے۔

بے نام پوشان وجود ہوں۔ مگر حالات کیسے بھی ہوں پلیز مجھے کبھی تنہا نہ چھوڑنا۔ میری ذات کو نہ جھٹلاتا۔ مجھے کبھی خود سے دور نہ کرنا۔ میں جانتا ہوں کہ میں تمہاری محبت نہیں، ترجیح بھی نہیں ہوں، پھر بھی میرا ساتھ دینا، میں برسوں تپا ہوں۔ صرف تمہارے وجود کا سہارا ہے ورنہ۔“

اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ آواز رندہ گئی تھی، جبکہ بازوؤں کی گرفت لمحہ بہ لمحہ تنگ تر رہی تھی۔ اس کے حصار میں مقید صبح کو اپنا سانس بند ہونا محسوس ہوا۔ ”اسد! پلیز ہوش کرس، کوئی آجائے گا۔“ وہ روہا سی ہو گئی تھی۔ سانس تک لینا محال تھا۔ وہ بمشکل کہہ پائی تھی اسد چونک گیا۔ وہ دونوں وی لاؤن میں تھے۔ ایک دم اسے اپنے بازوؤں کے حصار سے الگ کیا۔ وہ اس قدر پرجوش اور بے باک پہلے کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔

”میں سوری صبح! ریلی سوری۔“ وہ رخ موڑ گیا تھا۔ صبح خود حیران تھی۔ ایک نگاہ اس کی چوڑی پشت پر ڈالی۔

”آپ بیٹھیں۔ میں کھانا لاتی ہوں۔“ انہی لوکھڑائی ٹانگوں سمیت لرزتی آواز میں کہہ کر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

\*\*\*

وہ کئی دنوں سے اس کی کیفیت نوٹ کر رہا تھا۔ جب سے وہ لوگ کراچی سے آئے تھے تب سے اسے لگ رہا تھا کہ پشینہ کچھ کتنا چاہتی ہے، مگر کہہ نہیں پاتی۔ اب بھی رات کے اس پہر وہ بظاہر کتاب پڑھ رہا تھا، مگر بستر پر دراز پشینہ کو ہی نوٹ کر رہا تھا۔

”پشینہ! کیا بات ہے، پریشان ہو؟“ پشینہ نے ایک نظر اس پر ڈالی، پھر سرفنی میں ہلا گئی۔ ”اگر راشدہ بھا بھی نے کوئی بات کہہ دی ہے تو مجھ سے کہو۔“

”کوئی بات نہیں ہے، آپ کو خواہ مخواہ ٹیل ہو رہا



ہے۔ اس نے پھر ٹال دیا تھا۔  
 ”مرضی ہے تمہاری۔ ویسے کہتے ہیں کہ کہنے سننے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔“  
 کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے مکمل توجہ سے پشینہ کو بازو کے حصار میں لے لیا تھا۔  
 ”کمانا، کوئی بات نہیں ہے، آپ کو تو بس موقع چاہیے۔“ اپنے بالوں میں چلتا زوار کا ہاتھ روکتے اس نے چڑکر کہا اور زوار خان ہنس پڑا۔  
 ”ہماری پیاری سی بیگم صاحبہ خواہ مخواہ شراب نہیں ہوئیں، کوئی بات ہوئی ضرور ہے، شاباش جو بھی مسئلہ ہے مجھ سے کہو۔“ پشینہ نے لب دانتوں میں دبا لیے، وہ بھلا زوار سے کیا کہتی اور کیونکر وہ تو خود بھی تو نہیں جانتی تھی کہ اسے کیا چیز الجھا رہی ہے۔  
 ”زوار! میں بہت الجھی ہوئی ہوں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ سے کس طرح شیر کړوں۔ وعدہ کریں مجھے غلط نہیں سمجھیں گے۔“  
 زوار نے بڑی سنجیدگی سے اسے دیکھا اور پھر گردن ہلا دی۔  
 ”اس کا نام اسد ہے، اسد مجتبیٰ حسن مکمل نام ہے۔ اس کی بیوی کا نام صباح ہے۔ بہت پیاری لڑکی ہے۔ راشدہ بھابی کے ساتھ والا گھر ہے ان کا۔ وہ اصل میں لاہور کا رہنے والا ہے، مگر کمپنی کی وجہ سے کراچی شفٹ ہو چکا ہے۔ میں نے پہلی بار اسے اس کے گھر میں دیکھا تھا۔ اور پھر میں جتنے دن وہاں رہی، لا شعوری طور پر میں اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ بہت پیارا اور اچھا انسان ہے۔ براہ راست گفتگو نہیں ہوئی، مگر میں ہر روز اس کے گھر خصوصاً اسے دیکھنے جاتی رہی۔ نہ جانے اس کے اندر کون سی کشش تھی کہ میرے قدم خود بخود اس کے گھر کی طرف اٹھتے لگتے تھے اور یہاں اگر مجھے لگ رہا ہے کہ نہ جانے میں کیا کچھ کھو آئی ہوں۔“  
 زوار کے چہرے کا رنگ بدل گیا پشینہ فوراً بولی۔  
 ”زوار! مجھے غلط نہ سمجھے گا، بس اس کو دیکھ کر لگتا تھا کہ کوئی چیز ہے جو مجھے اس کی طرف کھینچتی ہے۔ میں

بہت پریشان ہوں زوار! بہت۔“  
 وہ بتاتے بتاتے آخر میں ایک دم رو پڑی تھی۔ اس کے سینے پر سر رکھے آنسو بہاتے ہوئے وہ زوار خان کو پتھر کرتی تھی۔  
 ”پشینہ۔“ زوار کو اپنی آواز بھی اجنبی لگی تھی۔  
 ”زوار! میں صرف آپ سے محبت کرتی ہوں میں نے ہر پہلو سے سوچا کہ وہ میرے دل کو کیوں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مگر ہر بار خاموشی ملتی ہے۔ مگر اتنا جانتی ہوں یہ کشش بہت مقدس جذبات میں لپٹی ہوئی ہے۔  
 وہ بہت اچھا ہے، آپ اس سے ملیں گے تو آپ کو بھی اچھا لگے گا۔“ زوار کچھ نہ بولا۔ اگر میرے دل میں کوئی غلط بات ہوئی تو کبھی آپ سے شیر نہ کرتی۔“  
 وہ یقین دلادی تھی۔ زوار نے بمشکل خود پر قابو پایا۔  
 ”ہوتے ہیں بعض انسان ایسے جن کو دیکھ کر دل خود بخود ان کی طرف کھینچنے لگتا ہے۔ ڈونٹ وری یارا پریشان نہیں ہوتے۔“ وہ مسکرا کر اسے دلاس دے رہا تھا۔  
 ”گل بی بی کچھ دنوں کے لیے راشدہ بھابی کی طرف جا رہی ہیں۔ میں بھی ساتھ چلی جاؤں، بلکہ آپ بھی چلیے اس سے مل بیجیے گا۔“  
 ”کوہ۔ کوئی مضائقہ نہیں چلیں گے۔“  
 پشینہ عام طور پر یوں کسی سے متاثر ہونے والی نہیں تھی۔ وہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اس شخص میں ایسی کیا بات ہے جو پشینہ جیسی لڑکی گھائل ہو گئی ہے۔ وہ اس سے مل کر ہی کوئی حتمی رائے قائم کر سکتا تھا۔  
 ”اچھا! اب آرام سے سوئے کی کوشش کرو۔ صبح میں گل بی بی سے ساتھ چلنے کی بات کر لوں گا۔“ اس نے اسے بھرپور تسلی دی اور لائٹ بند کر دی۔  
 \* \* \*

گل بی بی سے بات کی تو انہوں نے فوراً ”ساتھ چلے کی ہاں بھری تھی۔ اس طرح پھر کراچی پہنچ گئے تھے۔

راشدہ بھابی دوبارہ پشینہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ وہ پھر کے کھانے کے بعد جب گل بی بی آرام کرنے لیٹ گئی تھیں وہ زوار کو لے کر صبح کے گھر چلی گئی۔  
 صبح بھی پشینہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اسے بھی پشینہ بہت اچھی لگی تھی۔ زوار کو دیکھنے کے بعد اسے ان کی جوڑی بہت بھائی تھی۔  
 ”معاف کیجیے گا زوار بھائی! اسد کراچی میں نہیں ہیں نہ صبح ہی لاہور کے لیے نکلے ہیں۔ کل رات تک واپس آجائیں گے۔“  
 زوار نے جب اسد سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو صبح نے بتایا۔  
 زوار کے ساتھ ساتھ پشینہ کے چہرے کی بھی جوت بگھ گئی تھی۔  
 ”میں چائے لے کر آئی ہوں۔“ وہ اٹھ کر چلی گئی تو پشینہ نے اسٹینڈ پر رکھی تصویر تمام کر زوار کو تھمائی۔  
 ”یہ ہیں صبح کے شوہر اسد مجتبیٰ حسن، یہ سر ہیں اور یہ اسد کے بھائی۔“  
 زوار نے اسد کی تصویر پر نگاہیں جمادیں۔ وہ کئی ٹائپے بغیر پیکر بھیجکا نہ دیکھے گیا۔  
 وہ کچھ در وہاں بیٹھ کر واپس آ گئے تھے۔  
 ”پشینہ! مجھے اس کو دیکھ کر ایسا لگا کہ میں اس سے پہلے کہیں مل چکا ہوں، دیکھ چکا ہوں۔ مگر کہاں یاد نہیں آ رہا۔“ اپنی کپٹیاں مسئلے وہ کہہ رہا تھا اور پشینہ ایک دوسرے پر جوش ہو گئی۔  
 ”بالکل میرے جیسی کیفیت ہے۔ صبح زوار! مجھے بھی یہی لگا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہوا ہے، ملی ہوئی ہوں۔ اس سے۔“  
 زوار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”پشینہ! مجھے اے لگتا ہے کہ جیسے اس شخص کی شکل ماموں جان سے ملتی جلتی ہے۔ شاید یہی انریشن ہے، جو ہمیں اس کی طرف کھینچتی ہے۔“ وہ چونک گئی تھی۔  
 ”مگر اس کے چہرے پر بھی داؤھی ہولوور چہرے پر کچھ بوجھتی عمر کا، عکس ہو تو بالکل ماموں جان کا چہرہ

راشدہ بھابی نے بڑے سجاوے سے گل بی بی کی کوساری بات بتائی۔ وہ فوراً ”صبح کے ہاں جانے کے لیے اٹھیں۔“  
 پشینہ گل بی بی کو ہمراہ لے کر صبح کے ہاں چل پڑی۔  
 صبح بڑے تاک سے گل بی بی سے ملی۔  
 اس نے انہیں نیوی لائونج میں بٹھایا تو پشینہ کے اشارہ کرنے پر انہوں نے موقع محل کا انتظار کیے بغیر فوراً ”تصویر اٹھالیں۔“  
 ”صاف۔“ اسد پر نگاہ پڑتے ہی وہ پکاریں۔ صبح نے نا سنجی سے انہیں دیکھا۔  
 ”یہ۔ یہ۔ کون ہے؟“ انہوں نے تصویر پر انگلی رکھی۔  
 ”میرے شوہر ہیں، اسد۔“ اس نے سادگی سے بتایا تو گل بی بی فوراً ”بول اٹھیں۔“  
 ”نہیں یہ صاف ہے۔ میرے لالہ کی جوانی۔ میں تو ایک نظر میں پہچان گئی ہوں۔ آج وہ ہمارے پاس ہوتا



تو بالکل ایسا ہی ہوتا۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ صارم ہے اس کے رخسار کا یہ لعل، چھوڑی کا یہ نشان۔ ہمارے صارم کا ہی تو ہے۔ چناؤ اس کے والدین کون ہیں کہاں ہیں۔“

ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور صبح حیران و شذر رسی کھڑی تھی۔

”اس کے والدین کون ہیں۔ کیا نام ہے اس کے باپ کا؟“ وہ پوچھ رہی تھیں اور صبح کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیا بتائے اپنے باپ کا نام تو اب شاید اسد کو بھی یاد نہ ہو۔ سب اسے مجتبیٰ حسن کے بیٹے کے نام سے ہی جانتے تھے۔

”اسد۔ اسد مجتبیٰ حسن۔“ اس کی زبان سے یہ سلا ”دراصل۔۔۔“ اس کے کچھ کہنے کو لب و لکھ

”نہیں۔ یہ صارم ہے۔ صارم کے والد کا نام خان ذکاء اللہ خان ہے۔ یہ پشینہ کا بھائی ہے۔ میرے لالہ علاقے کے سردار ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ ہمارا بچپن کا کھویا ہوا صارم ہے۔ بھابھی جان کو یقین ہے کہ صارم زندہ ہے۔ انہوں نے اس کے انتظار میں سالوں گزارے ہیں۔“

میں کیسے بان لوں کہ یہ اسد ہے۔ میں پہلی نگاہ ڈال کر ہی کہہ سکتی ہوں کہ یہ میرا صارم ہے۔ ادھر علاقے میں لے جا کر کھڑا کروں تو لوگ قسم کھا کر کہہ دیں گے کہ یہ صارم ہے۔ ہو بومیرے لالہ کی جوانی ہے۔“

وہ رو رہی تھیں اور صبح کا دماغ اس انکشاف پر سائیں سائیں کر رہا تھا۔

”اس کی ٹھوڑی کا یہ نشان تب پڑا تھا جب ایک دن لالہ صارم کو اپنے ساتھ گھوڑے کی سواری کروانے لے گئے تھے اور یہ گہرا تھا۔ ٹانگے لگے تھے وقت کے ساتھ ساتھ داغ مدھم ہو گیا ہے مگر نشان برقرار ہے۔“

وہ صبح کو بتاتے بتاتے آنکھیں صاف کر رہی تھیں۔

”ہمارا مخالف قبیلے سے شروع سے ہی جھگڑا چل رہا

تھا۔ اب تو یہ قصہ ہی ختم ہو گیا ہے مگر اس وقت دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ ہمارے ایک ہی لالہ تھے اور صارم ان کا ایک ہی تخت جگہ۔ انہوں نے سازش سے ہمارا صارم ہم سے چھین لیا۔ وہ ہمارے خاندانی ملازم کے ساتھ حویلی سے نکلا تھا۔ بھابھی جان نے اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے بھیجا تھا۔ پہاڑوں پہ دشمن نے حملہ کر دیا۔ ملازم کو مار ڈالا اور ہمارا صارم۔۔۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ پہاڑ سے نیچے جا گرا ہے۔

ہم نے بہت کوشش کی مگر ہمارا صارم نہ ملا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں نہیں مگر ہمیں یقین نہیں آتا تھا۔“

وہ صوفے پر بیٹھی سب بتا رہی تھیں۔ پشینہ کی آنکھیں بھی سرخ ہو چکی تھیں صبح بے دم بیٹھی تھی۔

”آئی! اسد آپ کا صارم ہی ہے۔“ اس کی زبان سے کیا نکلا پشینہ اور گل ملی ملی شدت سے رو دیں۔ ”تم سچ کہہ رہی ہونا ہے۔ صارم نے نامیرے لالہ کا بیٹا۔ اس کی آنکھوں کا نور۔ میزی بھابھی کے دل کی ٹھنڈک ہمارا صارم۔ یا اللہ تیرا کرم تیرا شکر۔“ وہ اب اونچی آواز میں روتے ہوئے اسد کی تصویر چوڑے جاری تھیں۔

”تم ہماری ہو ہو ہمارے صارم کی بیوی۔“ انہوں نے نوالہ منہ بن سے صبح کو خود سے لپٹا لیا۔ پشینہ نے آہستہ آہستہ صبح کو اسد کو پہلی نگاہ دیکھنے کے بعد سے اب تک تمام صورت حال بتائی۔

وہ چپ ہوئی تو صبح نے شروع سے لے کر آخر تک ساری حکایت بیان کر ڈالی۔

”اللہ غارت کرے ان لوگوں کو جنہوں نے میرے لالہ کی نسل ختم کرنا چاہی تھی مگر جے اللہ رکھے اسے کون چکھے اللہ نے کیسے میرے صارم کو بچانے کا وسیلہ بنایا۔ بڑے نیک صفت تھے تمہارے تایا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو ضرور عقیدت سے شریہ ادا کرتی انہوں نے ہماری امانت سنبھال کر

رکھی۔ اپنا نام دیا، بڑھایا لکھایا، شادی کی۔ ورنہ کسی بے نام و نشان کا سارا کون بنتا ہے۔“ وہ پھر آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

”بہت پیاری ہو تم۔ بھابھی جان کو بڑا ارمان تھا کہ ان کا صارم زندہ ہوتا تو وہ اسے دوہا بتائیں شادی کرتیں۔ اس کے بچوں کو گود میں کھاتیں۔ اب تم دیکھنا، کیسے ہم تمہیں ارمانوں سے اپنے گھر لے کر جاتے ہیں۔ اپنے سارے ارمان پور کر گئی ہیں۔“

اس کی پیشانی چومتے ہوئے بہت محبت سے کہا تو وہ مسکرا دی۔

”پشینہ! اپنا موبائل نکال کر زوار کو اطلاع دو۔ بڑا بے چین ہو گا پھر حویلی فون کرتی ہوں۔ لالہ اور بھابھی جان کو خوشخبری سنائی ہوں۔“

”مگر آئی وہ اسد! وہ نہیں جانتی تھی کہ اسد کا کیا رد عمل ہوتا ہے۔ اس نے فی الحال انہیں روکنا چاہا تھا۔“

”مجھے مت روکو ہو! اس خوش خبری کے لیے ہم نے مایوسی اور امید و ناامید کے درمیان ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ اب اس کے والدین کو بتانے دو۔ جب تک وہ اپنے کام سے لوٹے گا تب تک لالہ بھابھی اور باقی لوگ بھی ادھر آجائیں گے۔“

انہوں نے اس قدر بھی انداز میں کہا کہ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی تھی۔

\*\*\*

وہ یہاں پہنچا تو گھڑوں، بوڑی بوڑی گاڑیاں کھڑی دیکھ کر چونکا ملازمہ سے صبح کا پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ کچن میں ہے تو وہ سلمان رکھ کر کچن میں ہی چلا گیا۔ وہ دروازے کی طرف پشت کیے روٹی پکانے میں مصروف تھی۔ دوپٹہ قریب ہی اسٹینڈ پر تھا۔ شاید نہانی تھی اس لیے لمبے بالوں کا آبشار پشت پر بہہ رہا تھا۔ شخص ایک کچر کی دوسے لٹکا سا سینا ہوا تھا۔

”صبح۔“ وہ اس کے بالکل عقب میں آکھڑا ہوا وہ چونک کر بیٹی تو اس کے ساتھ لگا رہی۔ اسد کو اس کی

اس قدر گھبراہٹ پر ہنسی آئی۔

”آئی گھبراہٹ؟ آئی بری آواز تو نہیں میری کہ ڈر جاؤ۔“

اس کے ہاتھ سے بیلن لے کر سلیب پر رکھا اور دونوں کندھے سے کل سے وہ نظروں سے اوجھل تھی تو لگتا تھا کہ کچھ کھو گیا ہے اور اب سامنے آئی تھی تو لگتا ہے خود پر سارے اختیار ختم ہو گئے ہیں۔

صبح کے چہرے پر خوش گواری سی مسکین تھی جو یقیناً اسد کی آمد کی وجہ سے ہونٹوں پہ چمکی تھی۔ اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ اگر وہ اس پر استحقاق جتاتے ہوئے دونوں کے درمیان حائل دیوار کو گرانے کی کوشش کرے گا تو صبح ناراض نہیں ہوگی۔

”آپ نے تو رات میں آنا تھا؟ پھر اس وقت کیسے؟“ اس کی گہری بولتی آنکھوں کا سحر ایسا ہی تھا کہ وہ اس کے حصار میں آتے ہی سب کچھ بھول گئی تھی۔

”تمہارے بغیر دل ہی نہیں لگا۔ جلدی جلدی کام نپٹا کر بھاگ چلا آیا۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”تم نے مجھے یاد کیا تھا میری غیر موجودگی محسوس کی تھی؟“

وہ نچانے کیا سننا چاہتا تھا وہ دھیسے سے مسکرا دی، پھر شرارت سے بولی۔

”نہیں۔“

صبح کے ہونٹوں پر ٹھہری مسکراہٹ نے اسے بے خود سا کر دیا تھا۔

”سنو۔ میں دعا نہیں کرتا مگر میرا یقین کر لو۔ شک و ظن کا حلف سمجھ لو، میں تمہیں بہت چاہوں گا۔ بہت زیادہ۔۔۔ جماد کی جگہ نہیں لے سکتا مگر کوشش کروں گا کہ میری رفاقت میں تم خوش رہو۔“

وہ اس کا چہرہ ہاتھوں کے پالنے میں لیے جذب سے کہہ رہا تھا، صبح کا دل اس کے ہر ہر لفظ پر ایمان لاتا جا رہا تھا۔

”پلیز چھوڑیں۔ کوئی آجائے گا۔ ملازمہ باہر ہی ہے۔“



لیلی جان کی تھی۔ اسد چونکا۔

”یہ کون ہیں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”ہمو۔“ آواز دروازے سے آئی تو اسد نے حیرانی سے پلٹ کر دیکھا۔

دروازے میں جو خاتون کھڑی تھیں، ان میں ہلاکی، تھکنے اور وقار موجود تھا۔ اسد پر نگاہ پڑتے ہی وہ دروازے پر منجمد ہو گئی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اسد ان کے اس طرح دیکھنے سے پریشان ہونے لگا۔

”صارم۔۔۔ اتم صارم ہوتا؟“ انہوں نے اسد کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پالے میں بھر لیا تھا۔

”صبح۔۔۔“ اس نے حیرانی سے صبح کو پکارا۔

”اسد! یہ آپ کی لیلی جان ہیں۔ آپ کی ماں۔“

صبح رندھی ہوئی آواز میں اسے ساری صورت حال بتانے لگی۔ اسد کی آنکھیں سرخ ہوئی جارہی تھیں۔ تینوں نفوس اپنی اپنی جگہ کم صم، خاموش اور عجیب سے احساس میں گھرے کھڑے تھے۔ صبح نے بات ختم کر کے اسد کا کندھا ہلایا اور وہ جوتی دیر سے ضبط کیے کھڑا تھا، ایک دم ان سے پلٹ گیا، ہلے بیٹے کے ملن کا یہ منظر صبح کی روح میں اتر گیا تھا۔

وہ اسے دہانہ وار چوم رہی تھیں۔

”آپ اندر چلیں۔“ اسد سہارا دے کر انہیں لاؤنج میں لیے چلا آیا۔

کچھ دیر بعد صبح لاؤنج میں اور بھی بہت سے چہروں کو بلا لائی۔ وہ سب بظاہر اس کے لیے اجنبی تھے مگر اس کے اپنے تھے۔ بہت گہرا تعلق تھا اس کا ان سب سے۔ اس کی ہمیش، بہنوں، کزنز، خالائیں، پھوپھیاں، دیگر رشتہ دار، وہ سب سے ملا سب نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔

”یہ میرا بیٹا ہے، میرا خون، میری آن، میری شان، میرا بیٹا۔“

خان ذکاء اللہ کتنی دیر تک اسے خود سے لپٹائے کھڑے رہے تھے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔

اس کی تینوں ہمیش اس کے گرد تھیں بازوؤں کے

حصار میں لیے سب کو پیار کرتے اس نے تینوں کے آنسو صاف کیے تھے۔

”اب تم دونوں ہمارے ساتھ وادی چلو گے۔“ خان ذکاء اللہ نے دونوں کو ساتھ لگا کر خواہش ظاہر کی تھی۔

”بہت دھوم دھام سے اپنی بہو اور بیٹے کو لے کر جاؤں گا، سارا علاقہ دیکھے گا کہ خان ذکاء اللہ کا بیٹا زندہ ہے۔“ وہ بہت پر جوش ہو رہے تھے۔

”کھانے سے فراغت کے بعد وہ کمرے میں آئی تو اسد پہلے سے وہاں موجود تھا۔

”تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ گھر میں اتنے سارے لوگ موجود ہیں۔“

”آپ نے موقع ہی کب دیا تھا۔ آتے ہی تو شروع ہو گئے تھے۔“ اس نے اس کا سرخ چہرہ دیکھا، جو اندرونی درد خانی خوشیوں کا عکاس تھا۔

”صبح! اس دن کے لیے میں نے ساری زندگی انتظار کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں گزشتہ زندگی کے وہ چار سال بھول چکا تھا کہ میں کون ہوں، کیا ہوں؟ جو نام جو مقام ابو جان نے دیا، وہی معتبر جانا اور ان کی زندگی میں کبھی اپنوں کو تلاش کرنے کی کوشش نہ کی کہ کہیں وہ ہرٹ نہ ہو جائیں۔ یہاں آکر بھی میں الجھتا رہا کہ کہاں سے شروع کروں۔ اس سے پہلے کہ میں باقاعدہ کوئی قدم اٹھانا، یہ سب ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا صبح! کہ میں نے اپنوں کو پایا ہے۔ مجھے اپنی ذات کا آگ نشان مل گیا ہے۔“

وہ جذب سے کہہ رہا تھا اور صبح اس کی خوشیوں کے داعی ہونے کی دعا کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

یہ سب جس قدر غلت میں ہوا تھا، اسی قدر دلچسپ تھا۔ بہت روایتی اور خواب ناک۔ صبح کو لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی سلطنت کی مہارانی ہو۔ ایک ہفتہ پہلے وہ سب اس حویلی میں آئے تھے۔ بابا جان، لیلی جان اور تینوں ہمیش سب نے گویا انہیں ہاتھ کا چھلا

ہاتھ رکھا تھا۔ تینوں ہمیش اس کے آگے پیچھے یوں ہلکان ہو رہی تھیں جیسے وہ بڑی بہتی شے ہے۔

صارم خان ذکاء اللہ کا اکلوتا بیٹا جو برسوں نگاہوں سے اوچھل رہا تھا، یہاں لانے کے بعد انہوں نے اس کے ولیمہ کا اہتمام کر لیا تھا۔

نکاح کے وقت تو وہ خاص اہتمام سے تیار نہ ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی سنگھار کیا تھا۔ مگر اب ان لوگوں کے خاندانی رسم و رواج کے مطابق دونوں کو ایک دفعہ پھر پرے اہتمام سے تیار کیا گیا تھا۔ نہ جانے کیا کیا رہنمیں ہوئی تھیں، صبح کو تو بعض سمجھ میں بھی نہ آتی تھیں، مگر وہ خوش بہت تھی۔

تمام رسوں سے فارغ ہو کر انہوں نے صبح کو اس کے کمرے میں پہنچایا، اس کی کمرے کی گردنکے درست کر کے اسد کو بھیجے گا کہ کہہ کر وہ تینوں ہمیش باہر نکل گئیں۔

اسد آہستگی سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ صبح اس وقت مکمل دہلیوں والے انداز میں تھی۔ اسے اپنے لیے یوں اہتمام سے سج دیکھ کر دل و نظر ایک احساس تقاخر سے دوچار ہوا تھا۔

ملیں ہم کبھی تو ایسے کہ حجاب بھول جائے میں سوال بھول جاؤں، وہ جواب بھول جائے

وہ کسی خیال میں ہو اور اسی خیال میں ہی کبھی میرے راستے میں وہ گلاب بھول جائے

تیری سوچ پر ہو حاوی میری یاد اس طرح سے کہ تو اپنی زندگی کا یہ نصاب بھول جائے

”صبح!“ اس کے ماتھے کی بندیا درست کرتے ہوئے اس نے بہت جاذبیت سے پکارا تھا۔

اس کی کلائی کے زوڑات کو چھینتے، وہ بچپن سے لے کر اب تک کے تمام واقعات یاد کرنے لگا۔ ہر لمحہ یادگار تھا، مگر اب لگتا تھا کہ اس نے بے نام و نشان کا جو بھی اور گزرا تھا، اس کا انعام حویلی محبت کرنے والے

مال باب، جان چھڑکنے والی بہنوں اور صبح کی دلنشین رفاقت کی صورت مل گیا تھا۔

”انتنا انتظار کیا ہے اس وقت کا، اب تو رحم کرلو تھوڑا۔“

وہ اس کے کان میں شرارت بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اسد کی بوچھل آواز صبح کو اپنے حواس بے خود ہوتے محسوس ہوئے۔ وہ مکمل طور پر مڑو میں تھا۔

بے باک نگاہوں کے تقاضے نظر انداز کیے جانے والے تو نہ تھے، اس کی قوت میں اسے اپنا آپ فراموش ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ محبت بھری جسا، توں پر وہ گھبرا جاتی تھی۔

”تم نہیں جانتیں، صبح! اتم میرے لیے کیا ہو۔ مجھے اپنی محبت کا اظہار کرنے سے مت روکا کرو، اتنے جتن سے تو میں نے تمہیں پایا ہے۔“

اس کے ہاتھوں کو اپنے ہونٹوں کا لمس بخشنے وہ اسے اپنے دل کی تمام وارداتوں کی کہانیاں سن رہا تھا اور وہ خود کو اس کے سپرد کیے، اس کی الفت و محبت کی روداد سننے اک احساس تقاخر سے دوچار ہوئی جارہی تھی اور دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر ادا کیے جارہی تھی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے

فائرہ اختار کے 4 خوبصورت ناول

آئینوں کا شہر قیمت - 500/- روپے

بھول بھلیاں تیری کیاں قیمت - 500/- روپے

یہ کیاں یہ چو بارے قیمت - 300/- روپے

پچھلاں دے رنگ ہزار قیمت - 250/- روپے

ناول بھگانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ - 45/- روپے

سنگھانے کا پتہ:

کتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021



# مستقل

توصیف احمد اور یاسمین کا ایک بیٹا حماد اور دو بیٹیاں سارہ اور اریبہ ہیں۔ یاسمین کی مستقل بد مزاجی اور بد زبانی سے تنگ آ کر توصیف احمد نے اپنے بڑے بھائی کی سالی خالہ سے دوسری شادی کر لی۔ اس بات پر یاسمین اپنے جیٹھ جھانی سے بھی شاک ہے۔ اریبہ ماں سے قریب ہے جبکہ سارہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔ اریبہ کی منگنی اس کے تایا زاد اجلال رازی سے ہو چکی ہے جو اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ گیا ہوا ہے۔ یاسمین اریبہ کو باپ اور دو حبیباں رشتے داروں کے خلاف بھڑکانی رہتی ہے۔ اریبہ کو جب باپ کی دوسری شادی کا پتا چلتا ہے تو وہ اپنے تایا اور مائی سے بھی بدظن ہو جاتی ہے اور اجلال سے منگنی بھی توڑ دیتی ہے۔ اجلال تعلیم مکمل کر کے واپس آتا ہے تو اسے منگنی ٹوٹنے کا پتا چلتا ہے۔ وہ اریبہ سے محبت کرتا ہے اور یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔

اجلال رازی اس بارے میں اریبہ سے بات کرتا ہے، مگر وہ خاصی روکھائی سے پیش آتی ہے، تاہم وہ تحمل سے کام لیتا ہے کیونکہ وہ یہ مسئلہ برادری کے ساتھ حل کرنا چاہتا ہے۔ اریبہ بے حد خود سر ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ماں کی شہ پر سب کی مرضی کے خلاف موٹر سائیکل لے لیتی ہے۔ سارہ کا کزن سمیر اس سے اظہار محبت کرتا ہے۔ سارہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔ مگر سارہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتی۔

شمشیر علی شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ اسے گاؤں میں مقیم اپنی بہن تاجور کی فکر رہتی ہے۔ کیونکہ وہ وہاں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم اور باپ کی عدم توجہ کا شکار ہے۔ وہ تاپاں کو پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو فون کرتا ہے کہ تاپاں کے باپ سے رشتے کی بات کرے تاکہ وہ شادی کے بعد تاجور کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔





تایاں کا بادل میں اپنے لیے تاجور کا رشتہ ٹانگ لیتا ہے۔ شمشیر غصہ میں تاپاں سے اپنا راستہ الگ کر لیتا ہے۔ شمشیر تاجور کو اپنے ساتھ ٹھہرے آتا ہے۔ تاجور کوئی بی ہوتی ہے۔ وہ اسے اسپتال داخل کروا دیتا ہے۔

اربابہ یا سمین کو شہباز درانی کے ساتھ گاڑی میں دیکھ لیتی ہے۔ اسے ناگوار لگتا ہے مگر یا سمین جھوٹی کمانی سا کراہے مطمئن کر دیتی ہے۔ بی بی کے مریض کی کہیں سٹری تیار کرنے کے سلسلے میں اربابہ کی ملاقات تاجور سے ہوتی ہے۔ اجلال رازی اربابہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ سارہ کو کھڑکی میں مگن کھڑے دیکھ کر شرارت سے ڈرا دیتا ہے۔ وہ اپنا توازن کھو کر گرنے لگتی ہے تو اجلال اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔

یا سمین اور شہباز درانی کی نازبا انگلیوں کن کر اربابہ غصے میں پائینگ لے کر نکل جاتی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ شمشیر علی بروقت اسپتال پہنچا کر اس کی جان بچا لیتا ہے۔ اسی اسپتال میں تاجور بھی داخل ہے۔ اربابہ ہوش میں آئے کے بعد اپنے رویے اور سوچ پر نادم ہوتی ہے۔ شمشیر علی تو صیف احمد کے آفس میں کام کرتا ہے۔ تو صیف احمد اسے ریک سے ایک ضروری فائل نکال کر جیلانی صاحب کو دینے کے لیے کہتے ہیں۔ بعد میں انہیں پتا چلتا ہے کہ سیف میں سے فائل کے ساتھ سبز لکڑی روپے بھی غائب ہیں۔

وہ شمشیر پر رقم پوری کا الزام لگاتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اربابہ ماں کی اصلیت جان کر بالکل بدل جاتی ہے اور مضطرب رہنے لگتی ہے۔

رازی اربابہ سے ملنے جاتا ہے تو اربابہ اس کی باتیں سن کر کچھ الجھی جاتی ہے۔ تاجور کو اسپتال سے باہر روکتے دیکھ کر اربابہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آتی ہے۔

توصیف احمد کے سابقہ چوکیدار الیاس کی نشاندہی پر شمشیر کی بے گناہی ثابت ہو جاتی ہے۔ وہ رہا ہو کر دل گرفتہ سا اسپتال جاکر تاجور کا معلوم کرتا ہے۔ مگر اسے صحیح معلومات نہیں مل پاتیں۔ اسپتال کا چوکیدار فضل کرم اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ وہاں سے شمشیر اپنے گاؤں جاتا ہے۔ مگر اپنا تاجور کی گمشدگی کے بارے میں نہیں بتاتا۔ تاپاں کی شادی ہو جاتی ہے۔ تاپاں کو دیکھ کر شمشیر چپچھتا تا ہے اور ان کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے اپنے ساتھ چلنے کا کہتا ہے۔ مگر تاپاں منع کرتی ہے۔

یا سمین اربابہ کی جلد از جلد شادی کرنے کی فکر میں رہ جاتی ہے۔ مگر اربابہ دو ٹوک انداز میں منع کر دیتی ہے۔ یا سمین چالاک سے اپنے گھر تمام رشتے داروں کو دعوت پر مدعویت کرتی ہے۔ اجلال مضطرب سادعوت میں شریک ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر اربابہ مزید الجھن کا شکار ہوتی ہے۔

بلال اسٹری کے لیے امریکہ چلا جاتا ہے۔ اجلال اربابہ سے محبت کا اظہار کرتے کرتے اپنا چاک گریزاں ہو جاتا ہے۔ اجلال بے حد نادم ہوتا ہے۔ سارہ اسے سب کچھ بھولنے کا کہتی ہے۔ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں سیر سے بات کرتی ہے۔ مگر اس کی طرف سے سخت جواب ملتا ہے۔ شمشیر کو اسپتال میں اربابہ نظر آ جاتی ہے۔ وہ اس سے شدید نفرت محسوس کرتا ہے اور کالج سے واپسی پر اسے اغوا کر لیتا ہے۔

اربابہ کے اغوا ہو جانے پر سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ اجلاس ساجدہ بیگم سے کہہ دیتا ہے کہ اب وہ اربابہ سے شادی نہیں کرے گا۔ شمشیر اربابہ سے میز پر پیش آتا ہے۔ کچھ دن بعد اربابہ کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے شمشیر کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

شمشیر علی کو اربابہ اچھی لگنے لگتی ہے۔ وہ اربابہ سے گریز کرنے لگا۔ شمشیر علی اربابہ کو اپنا سیل فون دے دیتا ہے کہ وہ جس سے جا بے رابطہ کر لے۔

اربابہ نئے نمبر سے شمشیر علی سے رابطہ کرتی ہے اور تاجور کو اس سے ملوادی ہے مگر فی الحال شمشیر اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاتا کیونکہ اس کے پاس نہ گھر ہے نہ نوکری۔ راستے میں اسے تو صیف احمد ملتے ہیں۔ اربابہ کے حوالے سے وہ دوبارہ شمشیر علی کے نمون ہو چکے ہیں۔ وہ شمشیر کو نئی برانچ کے لیے اچھی پوسٹ پر آفر دیتے ہیں۔ شمشیر ان کی پیش کش قبول کر لیتا ہے۔ آفس کی طرف سے اسے گھر مل جاتا ہے تو وہ تاجور کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

”میں ہوش میں تو رہا رازی اپنا بھی ہے کیا کہہ رہے ہو۔ جس گھر کی ایک بی بی نے۔“

”ای بی بی۔“ اس میں شاید یہ سب سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ ایک دم ٹوک کر بہت تیزی سے وہ کمرے سے نکل گیا۔ لیکن ہمیشہ مضبوط کا مظاہرہ کرنے والی ساجدہ بیگم بالکل ہی آپے سے باہر ہو چکی تھیں۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ میں مگر کبھی دوبارہ اس دروازے پر نہیں جاؤں گی۔ تم کسی بھول میں مت رہنا۔“ ساجدہ بیگم رازی کو کونسلنے کی غرض سے چلا چلا کر بول رہی تھیں۔ جب ہی ٹابھائی آئی۔

”کیا ہوا امی! کیا ہو گیا ہے اتنا چلا کیوں رہی ہیں؟“

”پوچھو اس سے جا کر جو میری عمر بھر کی سنبھالی عزت خاک میں ملائے رہا ہے۔ ارے پہلے کیا کم ذلت اٹھانی پڑی ہے جواب مزید۔“ ساجدہ بیگم کی آواز پھٹ گئی تھی۔ نیچے میں وہ یہ بھی بھول گئیں کہ کس سے بات کر رہی ہیں۔ شاہجے گھریلو معاملات میں بولنے کی وہ اجازت نہیں دیتی تھیں ہمیشہ اس کی آواز دبا دیتیں۔ اب اسی سے کہہ رہی تھیں۔

”مجھے پتا تھا یا سمین ضرور کوئی چکر چلائے گی۔ اور دیکھو! کیا چکر چلایا ہے۔ اربابہ نہیں تو سارہ۔ وہ عورت ہر صورت مجھے اپنے در پر چھکانا چاہتی ہے۔“

”بات کیا ہے امی! مجھے اصل بات تو بتائیں۔“ ساجدہ بیگم کے غصے سے متوحش تھی۔

”افسوس تو اپنی اولاد پر ہے۔“ ساجدہ بیگم اپنا بولے لگیں۔ ”سب جانتے ہوئے بھی اس کے چکر میں آ گیا۔ یہ بھی نہیں سوچا لوگ کیا کہیں گے۔“

”او فوہ امی! ہوا کیا ہے۔“ ساجدہ بیگم نے دانت پیس کر تپا تو شہباز بھی اچھل پڑی۔

”تمہارا بھائی کہہ گیا ہے سارہ سے شادی کرے گا۔“ ساجدہ بیگم نے دانت پیس کر تپا تو شہباز بھی اچھل پڑی۔

”کیا سارہ۔ نہیں امی! رازی بھائی ایسا نہیں کہہ سکتے۔ ضرور آپ کے سننے میں غلطی ہوئی ہوگی۔“

”بہری نہیں ہوں میں۔ جا کر کہہ دو اس سے میرے جیتے جی یہ ممکن نہیں ہے۔“

”اچھا آپ غصہ نہ کریں۔ آپ کا بلڈ پریشر بڑھ چکا ہے۔ میں آپ کو ٹیبلٹ دیتی ہوں۔“

”شاکے اپنے اندر تنفر آئیں کھانسی چل گئی تھی لیکن اس نے پہلے ساجدہ بیگم کو سنبھالا۔ انہیں سکون کی دوائی دے کر کتنی ہی دیر ان کا سر دباتی رہی اور جب وہ سو گئیں تو لاسٹ بند کر کے کمرے سے نکل آئی اور کیونکہ ابھی رات کا کھانا نہیں کھایا گیا تھا سو اسی بہانے وہ کھانے کی ٹرے لے کر رازی کے کمرے میں آ گئی۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ رازی اس کے ہاتھوں میں ٹرے دیکھتے ہی بولا تھا۔

”تھوڑا سا کھالیں بھائی! امی بھی بخیر کھائے پیے سو گئی ہیں۔“ ساجدہ بیگم کا بھوکا سونا جتا تھا۔

”میں بھی سو رہا ہوں۔ تم جاؤ۔“ رازی کے نزدیک سے وہ مزید اصرار کی ہمت نہیں کر سکی۔ مایوس ہو کر پلٹ تو آئی لیکن اسے چپن نہیں آیا۔ اسی وقت امینہ کے گھر فون کر ڈالا اور جب سمیر کی آواز سنی تو اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

”چسپے۔ چہ تمہارے لیے بری خبر ہے۔“

”تم سے کسی اچھی خبری تو توقع ہی نہیں جا سکتی۔ خیر بری خبر سناؤ۔“ سمیر نے اس کی فصاحت جتا کر کہا۔

”سن سکو گے؟“ ساجدہ بیگم نے رازی سے کہا۔

”سمیر خاموش رہا تو خود ہی کہنے لگی۔

”اچھا ہاں تمام کر سناؤ۔ تم جس کے پیچھے بھاگتے ہو اس نے رازی بھائی کو پھانس لیا ہے۔“

سمیر ابھی بھی کچھ نہیں بولا۔ غالباً اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔



”ہیلو۔ ایک ونک تو نہیں ہو گیا تمہیں۔ خود کو سنبھالو کرن! یا سمین! آنٹی کی بیٹیاں ایسی ہی ہیں۔ پہلے اریبہ اب سارہ۔ اور تمہیں چکر دے رہی تھی، دوسرے رازی بھائی پر ڈورے ڈال رہی تھی۔“ متبادل جلائے والے انداز میں بول رہی تھی کہ میری چیخ۔

”کواس بند کرو۔ شرم نہیں آتی تمہیں۔ کم از کم اپنے بھائی کا ہی خیال کرو۔“  
”برا لگانا! ایسی چیخ ہے میرا اور اس چیخ نے امی پر کیا قیامت توڑی ہے تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ پہلی بار۔۔۔ زندگی میں پہلی بار میں نے امی کو چلاتے ہوئے دیکھا ہے۔ رازی بھائی پر چلا رہی تھیں جو کہ گئے ہیں سارہ سے شادی کریں گے۔ سن رہے ہوں! رازی بھائی نے یوں ہی تو نہیں کہہ دیا ہو گا۔ جا کر پوچھو اپنی سارہ سے کیا جلاو کیا ہے اس نے میرے بھائی پر اور تم مجھ سے کہہ رہے ہو شرم نہیں آتی۔ ارے شرم دلانی ہے تو پہلے اپنی سارہ کو لاؤ۔“ گھٹے کے پھپھو لے پھو ڈکرفان بن گیا تھا۔



اریبہ مسلسل شمشیر علی کے منبجہ نظر انداز کر رہی تھی جو اسے ملنے پر اصرار کر رہا تھا۔ کتنے دنوں سے اس کی ایک ہی رٹ تھی۔ ”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“ اریبہ تنک آگئی تھی اور اب تو اس کا سنج پڑھتی بھی نہیں تھی۔ نام دیکھتے ہی ڈیٹ کر دیتی۔ ایک بار بھی اس نے یہ نہیں سوچا کہ آخر وہ کبوں ملنا چاہتا ہے شاید اس لیے کہ شمشیر علی کو جب کوئی بات کہنی ہوئی تھی وہ خود ہی اسے استمال میں ڈھونڈتے ہوئے آ جاتا تھا۔ اریبہ کے لاشعور میں یہی بات تھی کہ کوئی ضروری بات ہوگی تو اسی طرح آجائے گا لیکن اس بار جانے کیا بات تھی کہ وہ آنے کے بجائے اسے بلارہا تھا۔ اریبہ کی طرف سے جواب نہ ملنے پر بھی اس کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے شاید کوئی دھمکی دی تھی جس سے اریبہ مرعوب تو نہیں ہوئی البتہ طیش میں ضرور آگئی تھی اور اس کا مزاج ٹھکانے لگانے کا سوچ کر ہی جہاں اس نے بلایا وہیں پہنچ گئی۔ ”تم کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہو شام! کیا چاہتے ہو؟“ اس نے غصیلے لہجے میں پوچھا تو جواباً ”وہ انتہائی عاجزی سے بولا تھا۔

”تمہاری مدد۔ پلیز میری مدد کرو میں بہت مشکل میں ہوں۔“  
”تکس۔ کیا ہوا ہے۔ اب کیا مشکل آن پڑی ہے۔“ اریبہ یک لخت جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔  
”میں۔۔۔ میں خود کو معاف نہیں کر پا رہا۔ مجھے یہ احساس ہے کہ انتقامی آگ میں اندھا ہو کر میں نے ایک لڑکی کی زندگی تباہ کر دی۔“ وہ ہونز عاجز تھا لیکن اریبہ پھر سلگ گئی تھی۔  
”تو اس سلسلے میں میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔“ دیکھا جھٹکا تھا۔

”تم شاید میری بات کو مذاق سمجھ رہی ہو۔ یہ مذاق نہیں ہے اریبہ! میں چیخ کہہ رہا ہوں۔ مجھے کسی بل چین نہیں ہے اور تب تک چین نہیں ملے گا جب تک مجھے یہ یقین نہ مل جائے کہ وہ شخص جو تمہاری زندگی کا سناٹا بننے جا رہا ہے اس کی نظروں اور دل میں تمہارا آج بھی وہی مقام ہے جو پیشے تھا۔“

شمشیر علی جانے ایسا ہی محسوس کر رہا تھا یا اس کے منہ سے کچھ سنا چاہتا تھا۔ اریبہ چند لمحے اسے جھپتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی پھر چرو موڑ کر گلاس والے باہر دیکھنے لگی۔ جانے کون سی جگہ کون سا مقام تھا کہ نہ زمین نظر آرہی تھی نہ آسمان۔ اسے لگا جیسے وہ چیخ درمیان میں کہیں متعلق ہو گئی ہو۔ شمشیر علی اس کے چہرے پر نظریں جمائے اپنی بات کا جواب تلاش کرتے ہوئے الجھ گیا۔

”دیکھو شام!“ کتنی دیر بعد وہ اسے دیکھ کر کہنے لگی۔ ”جب میرے دل کی عدالت نے تمہیں بری کر دیا تھا تو تمہیں اسی وقت مطمئن ہو جانا چاہیے تھا۔ اس کے بعد میرے ساتھ جو بھی ہوئی ہے تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ تم آخر کیوں زبردستی خود کو انوار کے نیچے پریشان کر رہے ہو جبکہ میں یہ بھی کہہ چکی ہوں کہ اگر میرے ساتھ کوئی مسئلہ ہو بھی تو میں خود نمٹ سکتی ہوں۔ تم خدا کے لیے میرے بارے میں مت سوچو۔“

”یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میرا دل میرا ذہن تمہاری طرف سے ہٹا ہی نہیں ہے۔ میں کوئی بھی کام کر رہا ہوں تو میں تم میرے ساتھ ہوتی ہو۔ کبھی بے اختیار میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روکتی ہو۔ کبھی قنبہ بھی نظروں سے گھورتی ہو۔ کبھی مسکرا کر سراہتی ہو اور کبھی جب میں کسی کام میں خود کو زبردستی مصروف رکھتا ہوں تو چوری چوری دیکھتی ہو۔ ستاؤ! میں کہاں کہاں تم سے نظریں چرواؤں؟“ وہ جذبات میں بہہ رہا تھا۔

اریبہ کو خود احساس نہیں تھا کہ وہ اس پر سے نظریں ہٹانا بھول گئی ہے۔  
”اور تمہیں صرف اپنی کسی باتیں یاد رہتی ہیں۔ میری کسی بات کی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ میں نے کہا تھا، جہاں تمہاری منزل ہوگی وہاں سے میرا سفر شروع ہو گا اور میں اپنی بات سے پھر آ نہیں بھی نہیں۔ میرا یقین کرو! میں تمہیں پریشان نہیں کر رہا بلکہ میں تمہیں ہر پریشانی سے نکالنا چاہتا ہوں۔ ٹھیک ہے میں تمہارا کچھ نہیں لگتا لیکن کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ ہم کسی اجنبی کے سامنے بھی اپنا دل کھول کر رکھ دیتے ہیں۔“ وہ سانس لینے کو رکھا کہ اریبہ نے دھیرے سے پوچھ لیا۔

”کیا سننا چاہتے ہو تم!“ شمشیر علی ابھی الفاظ ڈھونڈ رہا تھا کہ وہ کہنے لگی۔  
”میں تمہارے سامنے روؤں۔ مظلومیت کی تصویر بن جاؤں۔ یہی چاہتے ہو تا تم تو سنبھالو! ممکن نہیں ہے شمشیر علی! روٹی تو میں اس شخص کے سامنے بھی نہیں جیسے میری زندگی کا سناٹا بننا تھا۔“  
”تھا؟“ شمشیر علی کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔

”شاید وہ بھی۔“ جی چاہتا تھا کہ میں اس کے سامنے رو کر اپنی پارسائی کی قسمیں کھاؤں پھر التجا کروں کہ مجھے اپنالے۔ کوئی فرق نہیں اس میں اور تم میں۔ تم سب ایک جیسے ہو۔ تمہیں میری بربادی کا احساس نہیں بلکہ تم مجھے روتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہو اس کے بعد مجھے تسلی دے کر تم مطمئن ہو جاؤ گے۔ بس یہ ہے تمہارا مسئلہ۔“  
اس کی تاسف بھری نظریں جن میں ملامت بھی تھی شمشیر علی کے دل میں ترازو ہو گئیں۔ وہ اپنی صفائی دے کر مزید خود کو گراتا نہیں چاہتا تھا۔ جب یہ کچھ توقف کے بعد کہنے لگا۔

”آئی ایم سوری۔ مجھے اس موضوع کو چھیڑنا ہی نہیں چاہیے۔ تم اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہو جبکہ میں غلطی پر غلطی کیے جا رہا ہوں۔ یہ جوں ہے ناں۔“ وہ اپنے دل کے مقام پر شہادت کی انگلی مار کر بولا۔ ”یہ بڑی نامراد ہے۔ رسوا کر کے ڈیل کر کے رکھ دیتا ہے۔ ہر حال میں تمہاری کسی بات کو جھٹلاؤں گا نہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔“

اریبہ اب کچھ نہیں کہنا چاہتی تھی۔ اس لیے پرس میں سے سیل فون نکال کر چیک کرنے لگی۔  
”ہاں وہ ایک بات کہنی تھی تم سے۔“ شمشیر علی نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے اچانک کچھ یاد آیا ہو۔ اریبہ سیل فون سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھنے لگی۔

”تمہیں بتا ہے تاہم کتنی سارہ ہے۔ شاید تم نے یا تمہاری بہن نے اس سے کہا ہو گا کہ تم اس کے پاس آتی رہو گی تو اسے بہت انتظار رہتا ہے تم دونوں کا۔ حالانکہ میں اسے سمجھتا ہوں کہ کسی کے پاس فالو وقت نہیں ہے لیکن وہ مانتی نہیں۔ لانا کتنی نے آپ کو نہیں بتا اریبہ! باجی اور سارہ باجی مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔“  
”ٹھیک ہتی ہے تاہم۔“ وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں چلتی ہوں اور ہاں! تم تاہم کو ہم سے بدگمان کرنے کی



فضول کو شش ترک کرو۔“  
”اچھی بات۔“ وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن اریبہ تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔

\*\*\*

سمیر کو جب سے ثنائے فون پر یہ بتایا تھا کہ رازی نے سارہ سے شادی کرنے کا کہا ہے تب سے وہ بے حد پریشان تھا اور چاہتا تھا کہ جا کر سارہ سے پوچھے یہ سب کیا ہو رہا ہے لیکن جس انداز میں یاسمین نے اسے تنبیہ کی تھی اس کے بعد تو صیغف ولا جانا تو دور یہ بات اس کی فون تک کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پھر سارہ نے پڑھائی بھی چھوڑ دی تھی جو وہ اس سے کان میں مل سکتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں رہا کیا کرے۔ امینہ سے وہ یوں بات نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اسے ثناء پر اعتبار بھی نہیں تھا۔ اکثر یہ خیال آتا کہ ہو سکتا ہے ثنائے جلاپے میں یہ شو شاپھوڑا ہو لیکن اس خیال پر بھی وہ زیادہ دیر قائم نہیں رہتا۔ یہی سوچتا کہ ثنائی بڑی بات نہیں کہہ سکتی۔ اس وقت وہ متضا۔ چوں میں گھر سارہ کو کوس رہا تھا جس نے یاسمین کے غیر اخلاقی رویے کے بعد اس سے معذرت کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے سارہ کو وہ ایسی تو نہیں تھی۔“ اس کی ہر سوچ کا اختتام اسی بات پر ہوتا تھا۔  
ابھی بھی وہ سارہ کی بے حسی پر کڑھ رہا تھا۔ پھر آخر ہمت کر کے اسے فون کر ڈالا کہ اکثر سارہ ہی فون اٹھاتی تھی پھر بھی وہ خائف تھا اور جب تک اس کی آواز نہیں سن لی اس کی سانسیں بحال نہیں ہوئی تھیں۔

”سمیر بات کر رہا ہوں۔“ وہ بہت مختار انداز میں بولا تھا۔  
”کیسے ہو سمیر! پھینچو کیسی ہیں؟“ سارہ کا لہجہ ہر احساس سے عاری تھا۔  
”یاسمین آئی کہاں ہیں؟“ اس نے سارہ کی بات کا جواب ہی نہیں دیا۔  
”اپنے کمرے میں ہیں۔ تمہیں ان سے بات کرنی ہے؟“ سارہ نے پوچھا تو وہ سلگا ضرور لیکن ضبط سے بولا۔  
”نہیں تم سے۔“

”اب کیا بات ہے؟“ سارہ کے نزدیک گویا ہر بات ختم ہو چکی تھی۔  
”رازی بھائی کا کیا معاملہ ہے؟“ اس نے فوراً پوچھا۔  
”رازی بھائی کا کون سا معاملہ؟“ سارہ نے نہ سمجھتے ہوئے پوچھا تھا۔  
”ثنائے اب رازی بھائی تم سے شادی کرنے کا کہہ رہے ہیں۔“ سمیر کا سارا دھیان سارہ کی طرف تھا اور ادھر وہ خاموش ہو گئی تھی۔

”بناؤ سارہ! اس بات میں کتنی سچائی ہے؟“ سارہ کی خاموشی نے اس کے اندر آگ لگادی تھی۔ ”بناؤ سارہ! تم چپ کیوں ہو گئیں۔ اگر یہ سچ ہے تو بناؤ کیا تم رازی بھائی سے شادی کر لو گی؟“  
”نہیں! میں رازی بھائی تو کیا کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی اور تمہیں یہ بات کسی کس نے؟“ سارہ نے غصے سے پوچھا۔

”ثنائے۔ لیکن مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔“  
”جیسی مجھ سے تصدیق کر رہے ہو؟“ سارہ کے چہرے پر طنز اسے بھی غصہ آ گیا۔  
”تم مجھے کبہا اپنے آپ کو۔ شکر کرو تم سے پوچھ رہا ہوں۔ اگر رازی بھائی سے پوچھتا اور وہ تصدیق کر دیتے تو پھر بناؤ تم کیا جواب دیتیں۔“  
”رازی بھائی کے کسی بھی معاملے میں جواب دہ نہیں ہوں۔ سمجھے تم!“

سارہ نے کہہ کر فون پٹخ دیا تھا اور سمیر کو بھی مزید کچھ نہیں کہنا تھا لیکن اس کی تشفی اب بھی نہیں ہوئی تھی جب ہی کچھ سوچ کر امینہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

\*\*\*

ساجدہ بیگم اس دن کے بعد سے رازی سے بات نہیں کر رہی تھیں اور اپنی ناراضی کا واضح اظہار وہ اپنے کمرے تک محدود ہو کر کر رہی تھیں۔ ناشتے کھانے کے وقت بھی وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلتی تھیں۔ کتنے دن ہو گئے تھے۔ اس دن کے بعد سے انہوں نے ثنائے بھی اس موضوع پر بات نہیں کی تھی۔ رازی کی بے حسی مزید تکلیف دے رہی تھی۔ کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ان کی ناراضی پر وہ کمر بیٹھ رہتا۔ فوراً ان کے آگے پیچھے پھرنے لگتا تھا اور جب تک انہیں منانہ لیتا چمچیں سے نہیں بیٹھتا تھا۔ اب جانے اس نے اپنے دل میں کیا ٹھان لی تھی کہ ان کے کمرے میں جھانک بھی نہیں رہتا تھا۔ صبح ناشتے کے بغیر آفس چلا جاتا اور واپسی میں سپدھا اپنے کمرے کا رخ کرتا۔ شاید وہ بھی اس طرح اپنی بات منوانا چاہتا تھا۔ ساجدہ بیگم سمجھ رہی تھیں جب ہی انہیں زیادہ تکلیف ہو رہی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ رازی نے سارہ سے شادی کا کیسے سوچ لیا اور اس پر اتنا اہل کیسے ہو گیا کہ اپنی ماں کی ناراضی کی بھی پروا نہیں رہی۔ کم از کم انہیں رازی سے ایسی توقع نہیں تھی۔

اسی وقت امینہ آئیں تو ساجدہ بیگم انہیں رازی کا یا شو شاپھاتے ہوئے رو پڑیں۔  
”بناؤ امینہ! کیا یہ جان بوجھ کر خود کو ذلیل کروانے والی بات نہیں ہے؟ کیا یاسمین کو تو صیغف بھی برا نہیں لگے اور یہ نہیں کہ رازی یہ باتیں نہیں سمجھتا ہوگا۔ سب سمجھتے ہوئے بھی اس نے منہ پھاڑ کر سارہ کا نام لے دیا۔“

”وہی قسم! میں بھی کہوں بھابھی! رازی کی مت ماری گئی ہے کیا۔ چار سال اریبہ سے منگنی رہی اس کی محبت کا دم بھرتا رہا اور اب اسی کی بہن کو بیاہ لانا احقنا ہی نہیں گھٹیا پن بھی ہے۔ آپ نے یہ بات کسی نہیں رازی سے؟“

”ارے اس نے میری بات سنی کہاں۔ بس اپنی کہہ کر چلا گیا اور اس دن سے میرا سامنا بھی نہیں کر رہا۔ کمرے گا بھی تو میں کیا کر لوں گی۔ ابھی آئے تو تم پوچھنا اس سے۔ آخر اس نے ایسا سوچا کیسے اور یہ بھی کہہ دینا میں مر جاؤں گی لیکن سارہ کے لیے اس گھر میں نہیں جاؤں گی۔“ ساجدہ بیگم کا ڈپریشن ان کی آواز سے ظاہر ہو رہا تھا۔  
”اچھا آپ زیادہ دل پر نہ لیں بھابھی! میں بات کرتی ہوں رازی سے اور سمجھاؤں گی بھی۔“ امینہ نے انہیں تسلی دی۔

”ہاں امینہ! مجھ میں اب برواشت کی طاقت نہیں ہے۔ سوچ سوچ کر لگتا ہے میرا ہارت فیل ہو جائے گا۔“  
ساجدہ بیگم پھر رو ہانسی ہو گئیں۔

”اللہ نہ کرے بھابھی! اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ اپنے بچوں کی خوشیاں دکھائے۔“ امینہ ساجدہ بیگم کی پریشانی اپنے دل پہ محسوس کر رہی تھیں۔ انہیں گلے لگانا چاہتی تھیں کہ رازی کے آنے پر اس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

”السلام علیکم چھپو!“ رازی امینہ کو دیکھ کر یوں رکا تھا جیسے ان کا جواب سننے ہی آگے بڑھ جائے گا۔  
”خوش رہو“ ٹھیک تو ہو۔ تم تو آتے ہی نہیں۔ کبھی یاد بھی نہیں آتی میری۔“ امینہ نے رازی کی غلت دیکھتے ہوئے بات بدھائی تھی۔

”اوس گا چھپو!“ رازی کہہ کر آگے بڑھا تھا کہ امینہ نے فوراً ”ٹوک دیا۔“



”جا کہاں رہے ہو بیٹھو۔ میں تم سے ملنے آئی ہوں۔“  
 ”جی! رازی اپنی حرکت پر نادم ہو کر بیٹھ گیا۔ ”کس کے ساتھ آئی ہیں پھوپھو؟“  
 ”سیمر چھوڑ کر گیا ہے لیکن جاؤں گی تمہارے ساتھ۔ کوئی بہانہ مت کرنا۔“ امینہ نے پہلے سے جتا دیا۔  
 ”لیجئے پہلے کب بہانہ کیا ہے پھوپھو!“

”اچھا پھوٹو۔ یہ بتاؤ۔ تم نے ماں کو کیوں پریشان کر رکھا ہے؟“ امینہ تو خیر سوچ کر بیٹھی تھیں لیکن رازی کے لیے یہ بات غیر متوقع تھی کیونکہ ساجدہ بیگم گھر کی باتیں کبھی کسی کے سامنے نہیں کرتی تھیں۔ اس لیے وہ جڑ بڑ ہو کر ایک نظر انہیں دیکھ کر رولا۔

”میں کہاں پریشان کر رہا ہوں پھوپھو!“

”تو اور کون کر رہا ہے۔ سارہ سے شادی کی بات کس نے کی ہے؟“ امینہ نے بغیر گھمائے پھر اے صاف لفظوں میں پوچھا تو رازی سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”کوئی گناہ تو نہیں کیا میں نے پھوپھو! مجھ سے امی نے میری پسند و چھٹی تھی اور میں نے بتادی۔ اب آگے ان کی مرضی۔ یہ میری پسند کا خیال کریں نہ کریں۔ میں زیروستی نہیں کر رہا اس لیے انہیں بھی زیروستی نہیں کرنی چاہیے۔ ٹھیک ہے امی کو سارہ پسند نہیں ہے تو نہ سہی۔ لیکن پھر میری شادی کا خیال بھی چھوڑ دیں۔“  
 یہ تم کیا کہہ رہے ہو بیٹا! بات پسند نا پسند کی نہیں ہے۔ سارہ گھر کی بچی ہے پسند کیوں نہیں ہوگی۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں ہے۔“ امینہ نے سٹیٹا کی بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

”کیوں ممکن نہیں ہے۔ پھوپھو! بنا آگے بات کیے آپ لوگوں نے کیسے سوچ لیا کہ یہ ممکن نہیں ہوگا۔“  
 ”آگے بات کرنا آسان نہیں ہے۔ چلو اگر ہم آگے بات کریں اور وہاں سے توصیف بھائی اور یاسمین نے منع کر دیا پھر؟“ امینہ نے پوچھتے ہوئے ساجدہ بیگم کا ہاتھ دبا کر گویا انہیں بھی پوری بات سننے پر آمادہ کیا۔  
 ”میرا خیال ہے چچا جان اور یاسمین آئی بھی سارہ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کریں گے۔“ رازی کے جواب نے ساجدہ بیگم کو ششدر کر دیا۔

”تمہارا مطلب ہے سارہ بھی یہی چاہتی ہے؟“ امینہ اپنی جگہ حیران اور غیر یقین تھیں۔

”جی نہیں۔ مجھے سارہ کا نہیں پتا۔“ وہ تنگ آ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”امی! آپ خواہ مخواہ میرا تماشا بنوا رہی ہیں۔ مجھے نہیں کرنی شادی۔“ اس نے خفگی سے کہا اور فوراً کمرے سے نکل گیا۔

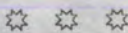
”سن لیا۔ ساری باتیں طے ہو جاتی ہیں اور ہمیں خبر ہی نہیں ہوتی۔“ ساجدہ بیگم نے رازی کے جاتے ہی کہا۔

”ہوں!“ امینہ سوچنے انداز میں بولیں۔ ”مجھے تو یہ بھی یاسمین کی چال لگ رہی ہے بھابی!“

”اب بتاؤ۔ میں کیا کروں۔“ ساجدہ بیگم حد درجہ فکر مند تھیں۔

”ابھی کچھ نہ کریں۔ آپ بس خاموش رہیں۔ میرا مطلب ہے ابھی رازی پر شادی کا دباؤ نہ ڈالیں۔ آپ جتنا

کہیں گی وہ اس قدر ضد میں آئے گا۔ اس لیے ابھی یہ شادی بیاہ کی باتیں نہ رہیں۔“  
 امینہ کی بات پر ساجدہ بیگم خاموش ہو گئیں۔



اربیہ اس وقت اسپتال سے جلدی فارغ ہو گئی تھی تو اکیڈمی جانے کا سوچ کر اس نے گاڑی اسی راستے پر ڈال دی لیکن پھر اچانک اس کا موڈ بدل گیا یا شاید سامنے بے اپار سنسن کی پیشانی پر جانا پچانا نام دیکھ کر اسے کچھ خیال



آگیا اور اس نے گاڑی وہیں پارک کر دی اور سینٹر فلور پر آکر پہلے اطراف کا جائزہ لیا پھر مطلوبہ دروازے پر نیل کا شٹن دیا۔ اندر سے تاجور کی آواز آئی تھی۔

”کون؟“  
”اربیہ!“ اس نے اپنا نام بتایا تو دروازہ فوراً ہی کھلا اور اگلے پل تاجور مارے خوشی کے اس سے لپٹ گئی۔  
”اربیہ باجی! مجھے یقین تھا آپ ضرور آئیں گی۔“  
”اچھا اندر تو آئے دو۔“ تاجور کی محبت نے اسے مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔  
”ہاں آئیں ناں۔ میں تو روز آپ کا انتظار کرتی ہوں۔ سارہ باجی نہیں آئیں۔“ تاجور نے اس کے عقب میں دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں میں اسپتال سے آرہی ہوں۔“ وہ تاجور کے ساتھ اندر آگئی۔  
”اچھا پھر میں آپ کے لیے کھانا لے کر آتی ہوں۔ بھوک لگی ہوگی نا آپ کو۔“ تاجور کہہ کر تیزی سے جانے لگی تھی کہ اربیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔  
”نہیں تاجور! میں ابھی کھانا نہیں کھاؤں گی۔“  
”کیوں نہیں باجی! مجھے پتا ہے آپ کالج سے آکر کھانا کھاتی ہیں۔ آپ بیٹھیں۔ میں بس ابھی گرم کر کے لاتی ہوں۔“ تاجور نے اتنے مان سے کہا کہ پھر وہ منع نہیں کر سکی۔

”اچھا بس زیادہ کچھ مت لانا۔“ وہ کہہ کر بیٹھ گئی۔  
تاجور بچن میں چلی گئی تو وہ سارے کاجائزہ لینے لگی۔ یہاں بھی غیر ضروری سامان کی بھرا نہیں تھی۔ جب ہی دو کمروں اور لاؤنچ پر مشتمل اپارٹمنٹ خاصا کشادہ لگ رہا تھا۔ اس کی نظریں بھٹکتی ہوئی اس بورڈ پر جا نہیں جس پر شمشیر علی اسٹیج بنا تھا۔ ابھی بھی اس پر وہندلا سا خاکہ نظر آ رہا تھا۔ وہ بلا ارادہ اٹھ کر بورڈ کے پاس آن کھڑی ہوئی اور اس خاکے کو غور سے دیکھنے لگی لیکن سمجھ میں نہیں آیا۔ پس اٹھا کر وہ کچھ کرنا چاہ رہی تھی کہ موبائل کی ٹون نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ وہ پسٹل رکھ کر دوبارہ اسی جگہ آئی جہاں آئی تھی اور بیک سے موبائل فون نکال لیا۔ اسکرین پر سمیر کا نام تھا اس نے لیس کیا۔

”ہاں سمیر!“  
”تم کہاں ہو اربیہ؟“ سمیر نے چھوٹے ہی پوچھا۔  
”میں گھر پر نہیں ہوں۔ تم کو کیا بات ہے؟“ اسے سمیر کا انداز مشکوک لگا۔  
”بات بہت اہم ہے اربیہ! فون پر نہیں کر سکتا۔“ سمیر نے کہا تو وہ ٹھکی لیکن رسلان سے بولی۔  
”اچھا ٹھیک ہے تم گھر پہنچو میں بھی تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی۔“  
”سوری اربیہ! میں تمہارے گھر نہیں آ سکتا۔ تم پلیز نائنڈ مٹ کرنا ہم کہیں باہر مل لیتے ہیں۔“

سمیر نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ اگر منع کرتی تو مزید الجھتی رہتی۔ اس لیے ہائی بھر کر موبائل آف کر دیا اور ٹیبل پر رکھی کھانے کی ٹے دیکھنے لگی۔ حقیقتاً اب اس کا کھانے کو بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن تاجور کا دل بھی رکھنا تھا۔ پلیٹ میں تھوڑے سے چاول نکالے اور ان پر شوربہ ڈال کر کھاتے ہوئے تاجور سے پوچھنے لگی۔

”کیا کرتی ہو سارا دل؟“  
”گھر کے کام۔ کھانا پکاتی ہوں، صفائی کرتی ہوں، کپڑے دھوتی ہوں، بھائی کے آنے سے پہلے سارے کام کر لیتی ہوں۔“ تاجور شوق سے بتانے لگی۔

”جی بات ہے۔“ اگر سمیر کا فون نہ آتا تو وہ مزید کچھ دیر تاجور کے ساتھ ضرور رہتی۔ اس کی معصوم آنکھیں کچھ مشورے بھی دیتی لیکن اب اس کا ذہن بالکل کام نہیں کر رہا تھا اس لیے جلدی سے پلیٹ کے چاول کھانے اور تاجور سے معذرت کے ساتھ دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے نکل آئی تھی۔  
سمیر کو اس نے پارک ٹاور آنے کا مہیہ سچ کیا اور تقریباً بیس منٹ بعد وہ پارک ٹاور کے فوڈ کارنر میں سمیر کے سامنے بھی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی جس کے چہرے پر پریشانی ہو رہی تھی۔  
”آئی ایم سوری! میں نے تمہیں زحمت دی۔“ سمیر نے کہا تو اس نے فوراً ٹوک دیا۔  
”تم اصل بات کہو۔“

”اصل بات۔“ سمیر بہت پریشان نظر آنے لگا جیسے اسے الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ پھر بمشکل رک رک کر گویا بول۔  
”اصل بات کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے کہ میں سارہ کو پسند کرتا ہوں بلکہ دل سے چاہتا ہوں اسے اور بار بار اس کے سامنے اعتراف بھی کر چکا ہوں۔“  
”پھر؟“ اربیہ کے لیے جیسے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔  
”پھر یہ کہ۔“ سمیر کچھ کہتے کہتے رک پھر اسے دیکھ کر بولا۔ ”تم۔“ میرا مطلب ہے۔ تم بھی تو جانتی ہوگی کہ ابھی نئی بات کیا ہوئی ہے۔“

”نئی بات؟“ اس نے سوچا پھر نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ”نہیں مجھے کسی نئی بات کا علم نہیں ہے تم بتاؤ۔“  
”میں۔“ مجھے بتاتے ہوئے عجیب سا لگ رہا ہے۔ تم سارہ سے پوچھو اس کا اور رازی بھائی کا کیا چکر ہے۔“ سمیر نے کہا تو اس کے دل پر گھونسا پڑا تھا۔

”سارہ اور رازی؟“  
”ہاں۔“ رازی بھائی کا کہنا ہے کہ وہ شادی کر سگئے تو صرف سارہ سے ورنہ کسی سے نہیں اور کبھی نہیں۔“ سمیر اس کی کیفیت اچھی طرح سمجھ رہا تھا، پھر بھی خود کو یہ کہنے سے روک نہ پایا۔ اور وہ جیسے قوت گویائی کھو چکی تھی۔  
”یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا اربیہ! سارہ میری محبت ہے اور رازی بھائی کو کسی کی محبت پر ڈاکا ڈالنے کا کوئی حق نہیں۔ ہم سب ان کا احترام کرتے ہیں تو انہیں بھی اپنے مرتبے کا خیال کرنا چاہیے۔“ سمیر اب غصے میں بول رہا تھا۔

اربیہ کو پتا بھی نہیں چلا کہ اب اس کی آنکھ سے آنسو پڑکا تھا جسے دیکھ کر سمیر ایک دم خاموش ہو گیا، پھر قدرے رک کر کہنے لگا۔  
”بہت گرمی ہوئی حرکت کر رہے ہیں رازی بھائی۔ چار سال تمہاری محبت کا دم بھرتے رہے اور تمہارے ساتھ ایسا کیا ہوا کہ انہوں نے نظریں تو پچھیں ہی ہی مزید تمہیں زک پہنچانے کی خاطر تمہاری بہن کو بھڑکایا۔ خدا کی قسم ایسا تو کوئی اپنے دشمن کے ساتھ بھی نہیں کرنا ہوگا۔“

”اور سارہ۔“ سارہ کو تم کیا کہو گے؟ وہ جیسے درد کے صحرائ میں تنہا کھڑی تھی۔  
”سارہ نادان ہے۔ وہ رازی بھائی کی چکنی چڑی باتوں میں آگئی ہوگی۔“ سمیر نے کہا تو وہ دکھ سے مسکرائی، پھر نفی میں سر ہلا کر بولی۔

”نادان سارہ نہیں تم ہو۔ خیر اس بحث میں بڑنے کے بجائے یہ بتاؤ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“  
”تم سارہ کو سمجھاؤ پلیز۔ وہ رازی بھائی کی باتوں میں نہ آئے۔“ سمیر نے کہا تو وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر محض اس کا دل رکھنے کی خاطر بولی تھی۔



”کوشش کروں گی۔“

سارہ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ کوریڈور سے آتی اربہ کی آواز سن کر رک  
تی۔ اربہ یا سمین سے کہہ رہی تھی۔  
”مما! مجھ سے مت چپکائیں۔ مجھے بتائیں جب تائی امی اور امینہ بچھو آئی تھیں تو انہوں نے آپ سے سارہ  
کی بات کی تھی؟“  
”سارہ کی بات؟“ یا سمین کا انداز نا سمجھنے والا تھا جبکہ اوہر سارہ کو اپنے پیروں تلے سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی  
تھی۔

”ہاں سارہ کی بات۔ تائی امی نے سارہ کے لیے رازی کا پروزل دیا تھا نا؟“ اربہ بیٹیں سے پوچھ رہی تھی۔ سارہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا، پھر بھی وہ تیزی سے پلٹ کر بے آواز قدموں سے بھاگتے ہوئے کمرے میں آئی، پھر واروم میں بند ہو گئی۔ اس کے سینے میں سانس اٹک گئی تھی۔ ہندروازے کے ساتھ ٹپک لگنے لگے، وہ کتنی دیر سہمی ہوئی کھڑی رہی۔ اتنی جلدی یوم حساب آگیا تھا اور یہ تو آٹھ ماہ تھا۔ وہ کب سے اس دن کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی اور کبھی بھی تو اسے لگتا تھا جیسے وہ آنکھ بند کر کے پل صراط سے گزر جائے گی، لیکن اب پل صراط کے قریب ہی اس پر ہیبت طاری ہو گئی تھی۔

”ایا اللہ میں نے کچھ میں کیا۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ تو سب جانتا ہے۔ میری لان رکھ میرے رب۔“  
 آسو ایک تو اتارے اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ اس نے شدت سے آرزو کی آندھی عوفان کی بجواسے  
 کہیں دور اڑا لے جا۔ نہی زمین ہی پھٹ جائے کچھ تھوہ۔ وہ اپنی ماں بھائی کا سامنا کیسے کرے گی۔

”ارسیبہ!“ اس کے ہونٹوں پر سسکی ابھری۔ پھر اس نے واٹس مین کا ٹل پورا کھول کر پانی کے ساتھ سارے آنسو بہا ڈالے، پھر بھی دل ٹھہر کے نہیں دیا۔ لیکن اب جو ہو سو ہو۔ وہ ہاتھوں سے چہرہ چھتھپاتے ہوئے واٹس روم سے نکل آئی۔ ارسیبہ ابھی کمرے میں نہیں آئی تھی۔ وہ جانتی تھی اس کے اور یا سمیمن کے درمیان کیا باتیں ہو رہی ہوں گی۔ اس نے سوچا تکیے میں منہ چھپا کر سو جائے۔ لیکن کب تک چھپے گی۔

”کل جو ہونا ہے وہ آج کہی ہو جائے“ اس نے اپنے دل کو یاد کرتا یا پھر بند کے سرہانے کمر کا کر بیٹھ گئی اور اپنے سامنے میز پر کھول لیا۔ وہ یہ بات یاد دینا چاہتی تھی جیسے وہ بہت دیر سے اسی طرح بیٹھی ہے۔ کچھ دیر بعد روانہ کھانے کی آواز بھی وہ نظر میں متوجہ نہیں ہوئی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کا پورا وجود آنکھ بن گیا تھا اور وہ اریبہ کی ایک ایک حرکت دیکھ رہی تھی۔

ارسیہ اپنی رائٹنگ ٹیبل پر ادھر ادھر مارتی تھی۔ دراز کھولے بند کیے پھر اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ تب اس نے تڑپتی نظروں سے ارسیہ کو دیکھتے ہوئے پکار کر پوچھا۔  
 ”ارسیہ! ابھی تم ماما سے کیا کہہ رہی تھیں؟“

اے یہ کہ جیسے کرنٹ لگا تھا۔ اچھل کر اس کی طرف گھومی۔

”کیا واقعی تائی امی میرا پروپوزل لائی تھیں؟“ اس نے سہمے دل کے ساتھ پوچھا۔

اسیہ ابھی بھی کچھ نہیں بولی۔ چبھتی نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

”اپے کیوں دیکھ رہی ہو؟“ وہ مزید خائف ہو گئی۔

”دیکھ رہی ہوں تمہارے کتنے اوپ ہیں۔“ اربہ کے سلگتے لہجے میں طنز کے ساتھ اچانک استہزاء شامل ہو گیا۔ ”واہ سارہ! تم نے تو مکمل کر دیا۔ مجھے رازی کی محبت کا یقین دلانے والے خود یقین کر۔“ انھیں تو پھر رازی

شمشیر علی ہاتھ منہ دھو کر دسترخوان پر آکر بیٹھایا تھا کہ تاجور خوش ہو کر بولی۔  
 ”پتا ہے بھائی! آج اس بے باجی آئی تھیں۔“

”اے سبہ نئی تھی؟“ وہ حیران ہوا۔  
 ”جی۔ میں نے کہا تھا نا اے سبہ! پاجی ضرور آئیں گی اور انہوں نے پھر آنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ سچ بھائی! انہیں دیکھ کر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں بتا نہیں سکتی۔“  
 تاجور کی خوشی اپنی جگہ شمشیر علی خود بھی خوش گوار احساس میں گھر گیا تھا۔  
 ”کب آئی تھی اے سبہ۔“

”دوبہ میں اسپتال سے ادھر ہی آگئی تھیں۔“  
 ”اچھا۔ پھر تم نے کیا خاطر مدارت کی اس کی؟“ شمشیر علی کا بظاہر سرسری انداز تھا ورنہ اصل میں تو وہ سب کچھ جانتا چاہتا تھا اور یہ بھی کہ اب بس اسی کا ذکر ہوتا رہے۔  
 ”کھانا کھلایا تھا لیکن انہوں نے بہت تھوڑا سا کھایا، اصل میں کوئی فون آگیا تھا اس لیے انہیں جلدی جانا پڑا۔  
 ورنہ میں انہیں رات تک روکتی۔“ تاجور کو اب اربیبہ کے جلدی جانے کا افسوس ہو رہا تھا۔  
 ”کس کا فون تھا؟“ وہ بلا ارادہ پوچھ گیا۔

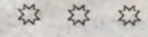
”جی نہیں کہہ رہی تھیں، ضروری جانا ہے پھر آؤں گی۔“  
 ”چلو کچھ دیر کو سی وہ آئی تو۔“ وہ ان بات کہہ کر سٹا کر اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”کیا ہوا بھائی! کھانا تو کھالیں۔“ اس کے اٹھنے پر تاجور کا ردیاس اس کی بات سے ہٹ گیا تھا۔  
 ”بس کھالیا۔ چائے پیوں گا۔“ وہ کہہ کر اپنے کمرے میں گیا۔ اس کا دل چاہا اریہ کو ٹھیکس کا مہینہ  
 کرے اور اس نے موبائل فون اٹھا بھی لیکن پھر رک گیا۔ اسے ان بات یاد آئی تھی۔

”میں غلطی پر غلطی کر رہا ہوں۔“ اور واقعی اسے احساس ہوا تھا کہ اسے اتنی جلدی اربیبہ کے سامنے اپنی محبت کا اعتراف نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جانے اسے کن حالات کا سامنا تھا۔ بے اعتباری کی فضا میں سانس لینا وہ ابھی کہاں کسی کا اعتبار کرے گی۔ اسے اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی خواہوں کی کڑچیاں تحلیل ہو جائیں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اربیبہ کا دھیان بٹے اور وہ بجائے اس کا دھیان بٹانے کے اپنا اس سے ایسی باتیں کرنا تھا جس سے یقیناً ”اس کے زخموں پر مزید ضرب پڑنی ہوگی“ جب ہی تو وہ تھلا جاتی تھی۔ بہر حال اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا تو پھر اس نے تمہہ کر لیا تھا کہ وہ اب اسے نہیں تنگ کرے گا۔ گو کہ اب خود سے کیے اس عہد پر قائم رہنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ کیونکہ اربیبہ بری طرح اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی۔ ہر نئے دن کے آغاز پر اسے لگتا اربیبہ کو دیکھے بغیر اس کا دن نہیں کٹ سکتا اور ہر رات اس رات میں ڈھل جاتی جب وہ اس کے تخت پر بے خبر سو رہی تھی۔ حقیقتاً ”اس کا اب کہیں کسی بات میں دل نہیں لگتا تھا۔ ایسی بے قراری تو اس وقت بھی نہیں تھی“ جب وہ تباہ کو سوچتا تھا۔ تباہ سے ملنے کے لیے تو باقاعدہ منصوبہ بندی کرنی پڑتی تھی کہ مسٹر سے فارغ ہو جائے گا تب جانے گا اور اب پہلی ترجیح اربیبہ تھی۔ باقی ساری باتیں اس کے بعد آتی تھیں اسی قدر اب وہ مجبور بھی ہو گیا تھا۔ لیکن مایوس نہیں تھا۔ پھر آج اربیبہ کی آمد نے اس کی امدادوں کوئی جلا جلا دی تھی۔ منزل دور ضرور تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ راستے میں تھک کر بیٹھ جاتا۔



میرے قابل نہیں رہا یہی کہا تھا تا تم نے کہ رازی تمہارے قابل نہیں ہے؟  
 ”ہاں! میں نے کہا تھا تو اس کا یہ مطلب کیسے لیا تم نے کہ میں۔۔۔“  
 ”تو پھر کیا مطلب تھا تمہارا۔۔۔ بتاؤ۔۔۔“ اربہہ کو خود پر کنٹرول نہیں رہا تھا۔ ”رازی تم سے شادی کرنا چاہتا ہے، کیوں؟“

”مجھے کیا پتا۔ رازی بھائی سے پوچھو۔“ سارہ نظر سر چرائی۔  
 ”اس سے بھی پوچھ لوں گی۔ پہلے تمہارا! تم کیا چاہتی ہو۔ تم بھی رازی سے شادی کرنا چاہتی ہو؟“  
 ”نہیں۔۔۔ نہیں۔“ سارہ چیخ پڑی۔ ”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ میں ایسا کیوں چاہوں گی۔ رازی نے اگر ایسا کوئی شوشا چھوڑا ہے تو تم مجھے کیوں گھسیٹ رہی ہو؟ میں نے بھی رازی کو ایسی نظر سے نہیں دیکھا نہ کبھی سوچا۔ ہمیشہ تمہاری نسبت سے اسے جانا۔ وہ اگر تمہارا نہیں ہوا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھے الزام دو۔ میں لعنت سمجھتی ہوں رازی پر۔“  
 بارہا اس میں چھوچھپا کر رو پڑی۔ فوری طور پر اربہہ کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ وہ سارہ کا یقین کر بھی رہی تھی۔ اربہہ نے بھی۔  
 ”کہہ دو ماما! اگر تائی! بی نے اس سلسلے میں کوئی پیش رفت کی ہے تو صاف منع کروں انہیں۔ میں مرنے والی ہوں۔ لیکن رازی سے شادی نہیں کروں گی۔ انہوں نے ایسا سوچا کیسے۔“ سارہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔  
 اربہہ نے اس وقت مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اسے روتے ہوئے چھوڑ کر کمرے سے نکل گئی۔  
 سارہ کا رونا بند نہیں ہوا۔ اسے اب رازی پر غصہ آ رہا تھا۔



کتنے دن ہو گئے تھے۔ اربہہ اور سارہ کے درمیان بات چیت بند تھی۔ سارہ نے اپنا کمر بھی الگ کر لیا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کیا سوچتی تھیں اور دونوں میں کون صحیح تھا کون غلط یہ تو یا سمین بھی نہیں جانتی تھی۔ لیکن وہ دونوں بیٹیوں کے درمیان کشیدگی کو بری طرح محسوس کر رہی تھی۔ اس نے الگ الگ دونوں کو سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ جب سادہ پیچ کی طرف سے ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہیں تو وہ کیوں ناراض ہو رہی ہیں۔ اس وقت وہ اربہہ سے یہ ہی کہہ رہی تھی جس پر وہ خنجر سے بولی۔  
 ”تائی! میں نے نہیں کہا، لیکن رازی تو کہہ رہا ہے نا۔“  
 ”تو بیٹا! اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟“

”کیا ہوتا ہے۔۔۔ ماما! آپ کے نزدیک یہ کوئی بات ہی نہیں ہے۔ ایک شخص چار سال مجھ سے منسوب رہا اور اب وہ آپ کی دوسری بیٹی کا نام لے رہا ہے۔ آپ کو تو چاہیے اس کا منہ توڑ دیں کیونکہ اس کا مقصد مجھے ٹارچر کرنا ہے۔ اربہہ کا ہتھ سے اکھڑنا فطری تھا۔“  
 ”میں سمجھتی ہوں بیٹا! اور یہی تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں کہ تم رازی کو اس کے مقصد میں کامیاب مت ہونے دو۔ اور رہی اس کا منہ توڑنے کی بات تو میں اس سے بھی زیادہ کر سکتی ہوں۔ لیکن مجھے پہلے اپنے گھر کو دیکھنا ہے۔ میرا گھر مضبوط ہوگا۔ سب میں ہی دشمنوں کا منہ توڑ سکوں گی۔“ یا سمین میں جانے اتنا ضبط کہاں سے آگیا تھا وہیں سے بول رہی تھی۔  
 ”پھر تم یہ کیوں نہیں سوچ رہیں بیٹا! کہ رازی کی اس بکواس سے سارہ کا کیا تعلق۔ تم سارہ سے کیوں ناراض ہو۔“

”مجھے نہیں پتا۔ بس مجھے لگتا ہے سارہ اور رازی کے درمیان کچھ ہے۔ اور میں آپ کو بتا رہی ہوں اگر میرا شک صحیح نکلا تو پھر میں خود یہاں سے چلی جاؤں گی، بیشک کے لیے۔“ اربہہ شخص دھمکی نہیں دیتی تھی، جب ہی یا سمین پریشان ہو گئی۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو بیٹا! تم اپنی بہن پر شک کر رہی ہو؟“  
 ”بہن کو شرم نہ آئی میری محبت پر ڈاکا ڈالتے ہوئے؟“ اربہہ تنک کر بولی۔  
 ”نہیں بیٹا! تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ کم از کم میں سارہ کے بارے میں ایسی کسی بات کا یقین نہیں کر سکتی۔ وہ تو اتنے چھوٹے دل کی ہے کہ۔۔۔“  
 ”چھوٹے دل والے ہی ایسی سچ کر سکتے ہیں ماما!“ اربہہ نے یا سمین کی پوری بات سنی ہی نہیں۔  
 ”سارے جہاں کا درد سارہ کے دل میں ہے یہ تو آپ جانتی ہیں نا۔ ہر ایک کی ہمدرد بن جاتی ہے پھر ہمدردی کیا گل کھلاتی ہے یہ بھی آپ جانتی ہوں گی۔“  
 ”بس کرو بیٹا! تم بہت بد گمان ہو رہی ہو۔ غصے اور بد گمانی میں ایسی باتیں کر رہی ہو جو تمہیں زیب نہیں دیتیں۔“ یا سمین نے ٹوک کر افسوس سے کہا۔  
 ”میں انسان ہوں ماما! مجھے کسی ایسی مسند پر مت بٹھائیں، جہاں میں پتھر کی مورت بن جاؤں اور میں آپ کو بتاؤں یہ اب کی بات نہیں ہے۔ سارہ جانے کب سے ہماری آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے۔“ اربہہ کسی طرح قابو میں ہی نہیں آ رہی تھی۔  
 ”جھا! تم۔۔۔“ یا سمین کچھ کہتے کہتے نہ صرف چونکی بلکہ ٹھٹھکی بھی تھی۔ پھر ایک دم اٹھ کر تیزی سے آگے بڑھی اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگی۔ اربہہ کچھ سمجھ نہیں پاتی۔  
 ”کیا ہوا ماما۔۔۔؟“

”کچھ نہیں۔“ یا سمین کھڑکی بند کر کے واپس پلٹے ہوئے بولی۔ ”مجھے لگا یہاں کوئی تھا۔“  
 ”نہانی ہو گا۔“ اربہہ نے نیازی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”ہاں! شاید وہ ہی تھا۔“ یا سمین نے اپنا خدشہ ظاہر نہیں کیا اور سرسری انداز میں کہہ کر وارڈروب کھول لی۔ صرف اس لیے کہ اربہہ پھر نہ سارہ کی بات لے بیٹھے۔ اس کی بد گمانی دیکھتے ہوئے یا سمین اب اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔  
 ”جھا ماما! میں ذرا ڈیڈی کے پاس جا رہی ہوں۔“ اربہہ نے جاتے ہوئے کہا تو یا سمین ایک دم پریشان ہو گئی۔  
 ”اربہہ۔۔۔“

”فکر مت کریں۔ ڈیڈی سے سارہ کی بات نہیں کروں گی۔“ اربہہ اس کی پکار سے سمجھ کر کہتے ہوئے چلی گئی۔  
 یا سمین نے بمشکل خود کو روکے رکھا اور جب اربہہ کی گاڑی جانے اور گیٹ بند ہونے کی آواز سن لی تب اس نے وارڈروب بند کی اور اپنے خدشے کی تصدیق کے لیے سارہ کے کمرے میں آکر اسے دیکھنے لگی۔  
 سارہ خامسے مگن انداز میں کچھ گنگناتے ہوئے اپنا سوٹ پریس کر رہی تھی۔  
 ”سارہ!“ یا سمین کے پکارنے پر سارہ چونک کر بولی۔  
 ”جی ماما۔۔۔“  
 ”بیٹا! تم ابھی لان میں گئی تھیں؟“ یا سمین نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔  
 ”نہیں ماما! کیوں کیا ہوا؟“  
 ”کچھ نہیں، بس مجھے فیل ہوا تھا جیسے تم وہاں ہو۔“ یا سمین کا انداز ہنوز تھا۔



”اچھا!“ سارہ محظوظ ہوئی۔ ”آپ مجھے ڈراتی تو نہیں رہیں ماما!“  
 یاسمین نے مسکراتے پر اکتفا کیا تھا۔

\*\*\*

اریبہ نے گیٹ پر رازی کی گاڑی دیکھ کر چاہا کہ واپس پلٹ جائے، لیکن پھر کچھ سوچ کر اندر آئی تو رازی توصیف احمد کے ساتھ بیٹھا نظر آیا۔  
 ”السلام علیکم!“ اس نے سلام کیا تو آواز پر رازی چونکا ضرور لیکن اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا، جبکہ توصیف احمد خوش ہو گئے۔

”وعلیکم السلام! کیسا ہے میرا بیٹا؟“  
 ”بالکل ٹھیک!“ وہ کوشش سے کھکھلائی اور رازی کو نظر انداز کر کے توصیف احمد کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی۔ ”میں آپ کی بزنس مینٹنگ میں غل تو نہیں ہوئی ڈیڈی؟“  
 ”نہیں بیٹا! آپ بتاؤ گھر میں سب ٹھیک ہیں؟“ توصیف احمد نے اس کے کندھے پر ہاتھ پھیلا کر اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

”جی! بس سارہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے رازی کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ شاید سارہ کے نام پر اس کے چہرے پر کوئی داستان رقم ہو جائے، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔  
 ”دیکھا ہوا یوں ہی بخار ہے یا کوئی اور تکلیف؟“ توصیف احمد نے پوچھا تو اس کی نظریں پھر رازی کی طرف اٹھ گئیں۔

”بخار تو نہیں ہے ڈیڈی! شاید کوئی اور تکلیف ہے۔“  
 ”تو بیٹا! ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھایا؟“  
 ”میں خود ڈاکٹر ہوں ڈیڈی! لیکن سارہ اپنی تکلیف بتائے تب تا۔ وہ تو کچھ بتاتی ہی نہیں ہے۔ ویسے ماما لگی تھیں اسے ڈاکٹر کے پاس۔“ اس نے رازی پر جتا کر توصیف احمد کو تسلی بھی دے ڈالی۔  
 ”پھر کیا بتایا ڈاکٹر نے؟“

”ڈاکٹر نے کہا سوچتی زیادہ ہے۔ اسے مصروف رہنے کی ضرورت ہے۔ مجھے بھی یہی لگتا ہے ڈیڈی۔ آپ اسے سمجھائیں، پھر سے کالج جو ان کر لے۔ گھر بیٹھ بیٹھ کر جیٹی ہو گئی ہے۔“  
 ”ہوں! یہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا! سارہ کو پڑھائی نہیں چھوڑنی چاہیے۔ میں سمجھاؤں گا اسے۔“ توصیف احمد نے اس کی تائید کی تو وہ بے اختیار بولی۔  
 ”نہ سمجھے تو آپ فوراً اس کی شادی کر دیں۔“ پھر اسی طرح بے اختیار رازی کو مخاطب کر گئی۔ ”کیوں رازی! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟“

رازی ایک نظر اس پر ڈال کر توصیف احمد کو دیکھنے لگا تو اس کی پیشانی پر پسینے کی منھنی بوندیں دیکھ کر وہ ہنس پڑی۔  
 ”اے تم تو یوں بوکھلا گئے رازی! جیسے میں تمہاری شادی کی بات کر رہی ہوں۔ ویسے اڑتے اڑتے مجھے تمکیہ خیر پنچ پکی ہے کہ تم۔“  
 ”چچا جان!“ رازی نے گہرا کر توصیف احمد کو مخاطب کر لیا۔ ”وہ میں نے آپ کو ثنا کے رشتے کا بتایا تھا نا تو انی نے وہاں ہامی بھری ہے۔“

”اچھا! یہ تو اچھی بات ہے۔“ توصیف احمد نے خوشی کا اظہار کیا، پھر اریبہ کو وہاں سے اٹھانے کی غرض سے

”بیٹا! اپنی آنٹی سے چائے کا کہہ دو۔“

”وہ سوری! میں آنٹی سے ملنا تو بھول گئی۔“ وہ کہتے ہوئے فوراً اٹھ کر اندر خالدہ کے پاس آ گئی۔

”السلام علیکم آنٹی! کیسی ہیں آپ؟“

”اللہ کا شکر ہے۔ تم سناؤ بڑے دنوں بعد آئیں۔“ خالدہ اس کی آمد پر کچھ نہ کچھ قیاس کرنے لگی تھیں۔

”ہاں! بس۔ پڑھائی کا جو نقصان ہوا ہے وہ ہی پورا کرنے میں لگی ہوئی ہوں۔“

”ہاں! تمہارا تو سال ضائع ہو گیا ہے۔“ خالدہ بے ساختہ کہہ گئیں۔

”شکر ہے آنٹی! صرف ایک سال ضائع ہوا ہے۔ آگے زندگی ضائع ہونے سے بچ گئی۔“ اس کا اشارہ رازی کی طرف تھا اور خود اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس کے لیے یہ ہی ٹھیک ہے۔ وہ کیوں دل کے اڑنے کا نام کر رہی ہے۔

”اے! تم بیٹھو نا۔“ خالدہ نے کہا تو وہ چونک کر بولی۔

”بس آنٹی! میں چلتی ہوں اور ہاں! ڈیڈی چائے کا کہہ رہے ہیں۔ بھجوا دیجیے۔“

”تم بھی بیٹھو نا۔ چائے تو پی لو۔“ خالدہ نے اخلاقا ”اے روکنا چاہا۔“

”پھر آؤں گی آنٹی! خدا حافظ۔“ وہ کھڑے کھڑے وہیں سے یا ہر نکل آئی۔ اچانک دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

”مما ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ مجھے رازی کو اس کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دینا چاہیے۔ وہ مجھے نارج کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اپنی ذات میں الجھائے رکھنا چاہتا ہے۔ نان سمنس۔ میں بتاؤں گی اسے کہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑا اور سارہ۔“ اس کی سوچوں کو بریک لگ گئی۔ ساتھ ہی اس نے گاڑی کو بھی بریک لگا دیے تھے۔

پھر شاپنگ مال کی میڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے بہت کچھ سوچ ڈالا۔ اس کے بعد روشنیوں کی چکاچوند میں اس کا نہ صرف وہ بیان بٹا بلکہ وہ شوق سے خصوصاً ”سارہ کے لیے شاپنگ میں مصروف ہو گئی۔“

”دیکھا ہوا بخار سارہ کی رازی کے ساتھ اندر اسٹینڈنگ ہو گئی ہے۔ اگر سارہ خوش ہے تو مجھے اس کی خوشی کا خیال کرنا چاہیے۔“

وہ خود کو یہی یاد اور کراتے ہوئے سارہ کی پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے سوٹ، میک اپ کی کچھ چیزیں اس کے بعد بیچنگ چیلری دیکھ رہی تھی کہ اسے لگا جیسے وہ کسی کی نظروں کے حصار میں آ گئی ہو۔ اچانک دل دھڑکا تھا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا، لیکن ایسا کوئی نظر نہیں آیا، جو اس پر نظریں جمائے کھڑا ہو۔ تب وہ سر جھٹک کر پھر چیلری کی طرف متوجہ ہوئی تھی کہ سماعتوں پر دستک ہونے لگی۔

”اور بھی جب میں زبردستی خود کو کسی کام میں مصروف رکھتا ہوں تو چوری چوری دیکھتی ہوں۔“

”اسٹوڈنٹ! وہ دھیرے سے بڑبڑاتی پھر چیلری بیک کروا کر وہاں سے نکلی ہی تھی کہ شمشیر علی سامنے آ گیا۔“

”ہیلو!“ ”اے! اریبہ! جو! ہیلو!“ ”بھئی نہیں کہہ سکی۔ وہ حیران تھی کہ ابھی تو اس کی خیال آیا تھا اور وہ کن موجود

”کیسی ہو۔“ ”مجھے دیکھ کر حیران ہو رہی ہو؟“ شمشیر علی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“ ”اس نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔“

”کیوں؟“

”پلیز! یہاں کھڑے کھڑے سوال جواب مت شروع کرو۔ میں وہاں چائے پینے جا رہی ہوں۔ تمہیں بتینی ہو تو

”آہواز۔“ وہ کہہ کر اسے شارز سنبھالتی تیز قدموں سے فوڈ کارنر آ گئی۔

اور یہ کیسے ممکن تھا کہ شمشیر علی اس کی بات رو کر دیتا۔ وہ نہ جانتی تب بھی اسے آنا ہی تھا۔





عینۃ الخدیجہ



نے بول دیا۔  
”بات شروع کیسے کرتا۔ سوچا جھوٹ کا سرور لے لوں۔ مگر نہیں لے سکا۔“  
وہ مسکرائی۔ ”شکر ہے۔ کوئی تو ہے۔ اس دنیا میں میری طرح کا۔“  
میرا بھی مسکرا دیا۔ ”اس کا مطلب آپ جھوٹ

تجربہ ہی اس کی شخصیت تھی نام تھا اس کا کلی خان دیکھنے میں بھی وہ گلاب کی کلی جیسی ہی تھی مگر اس کا ہاتھ زہر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔  
وہ یونیورسٹی میں آئی تو اپنی زبان کی تعلیم کی وجہ سے سب کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ مگر اس نے کسی کو گھاس نہ ڈالا۔ اپنی تعریف سن کر ساتویں آسمان پر نہ جا بیٹھتی۔  
بہت مضبوط ذہن کی مالک تھیں۔ پھر اسے متے درے تھے کہ وہ کسی پر اعتبار نہیں کر سکتی۔  
ایک دن سر منظر کے لیکچر پر۔ مجھے اس کے ساتھ جگہ مل گئی۔ میرا دل دور سے دھڑکا۔  
میرا بطن سجد ہے اور آپ؟ میں نے پوچھا۔  
جبکہ میں اس کا نام جانتا تھا۔  
”چھا تو آپ میرا نام نہیں جانتے؟“ وہ ہنسی میں شرمندہ سا ہو گیا اور مزید جھوٹ بولنے کے بجائے میں

”تھنک یو ایجھے بڑا اچھا لگا۔“ وہ چائے آرڈر کر کے اس کے سامنے بیٹھتی ہی بولا۔  
”تھنک گئی۔“ وہ اس کی بات ان سنی کر گئی۔

”حیرت ہے۔ میرا مطلب ہے میں نے تو سنا ہے ٹوکیاں شاپنگ کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکتیں۔ تم اتنی سی شاپنگ تھک گئیں؟“ شمشیر علی نے اس کے تین چار شاپرز کی طرف اشارہ کیا۔  
”سنو! مجھے سکون سے چائے پینے دو۔“ اس نے چائے کا کپ اٹھایا۔ پھر گھونٹ لے کر پوچھنے لگی۔

”تم یہاں کیا کرتے پھر رہے ہو؟“  
”کچھ نہیں! امیری گاڑی یہاں سامنے بند ہو گئی تھی۔ مڈینک کے حوالے کر کے خود یہاں چلا آیا۔ شاید اسی طرح تم سے ملاقات ہوئی تھی۔“ وہ ہتا کر مسکرایا۔

”چلو! اب یہاں تک آئی گئے ہو تو تاجور کے لیے کچھ لے لو۔“ اس نے کہا تو وہ تائیدی انداز میں سر ہلا کر بولا۔  
”ہاں! سوچ رہا ہوں کیا لوں۔ تم نے کیا لیا ہے؟“  
”میں نے یہ ساری شاپنگ اپنی بہن سارہ کے لیے کی ہے۔“

”اچھا! سارہ خود نہیں آئی؟“ شمشیر علی نے اشتیاقی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔  
”نہیں! وہ ناراض ہے اور یہ سارے جتن اسے مٹانے کے ہیں۔“ وہ اُنجانے میں اس مانوس اجڑی کے ساتھ کچھ باتیں شیئر کرنے لگی تھی اور جب وہاں سے اٹھی تو اسے لگا جیسے جاپے کب سے نامعلوم شہنشاہ میں جکڑا اس کا دل آزاد ہو گیا ہو۔

”ٹھیک ہے! شام پھر ملیں گے۔“ اسے پتا بھی نہیں چلا وہ اس کی دور خود اس کے ہاتھ میں تھا آئی تھی۔  
واپسی میں اسے ہر جگہ ٹریفک جام ملا۔ یوں بمشکل چندرہ منٹ کا فاصلہ ایک گھنٹے میں طے ہوا۔ وہ واقعی چکر لگاتی تھی۔ جب یہی اسے گیٹ پر کھڑی ایمبولینس نظر نہیں آئی۔ وہ چوکیدار کو متوجہ کرنے کے لیے بارن بجانا چاہتی تھی کہ بیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں یا یمنین انتہائی پریشانی کے عالم میں گیٹ سے نکل کر ایمبولینس کی طرف بھاگی تھی۔

”مما!“ وہ پہلے سمجھی نہیں، لیکن جب یا سمین کے بیٹھے ہی ایمبولینس کو جاتے دیکھا تب وہ بھی پریشان ہو کر گاڑی سے اترتی اور پہلے ایمبولینس کے پیچھے بھاگنا چاہا، پھر ایک دم پلٹ کر بھاگتے ہوئے اندر آئی۔  
”مما! سارہ! سارہ!“ وہ اونچی آواز میں پکار رہی تھی کہ بی بی نے اگر اس کے کندھے تھام لیے۔

”کیا ہوا بی بی! ایمبولینس میں کون کیا ہے؟“  
”وہ بیٹا! وہ بی بی کے منہ سے بات نہیں نکال رہی تھی۔“  
”جیسا بی بی لیا ہوا ہے؟“ اس نے چیخ کر بی بی کو بھونڈا ڈالا۔  
”وہ بیٹا! سارہ!“

”ہاں سارہ! سارہ کہاں ہے؟“ وہ اس کھونٹے لگی۔  
”سارہ نے اپنی کلائی لٹک کر کاشی کی۔“ بی بی بتاتے ہوئے رونے لگیں۔  
”نہیں۔“ اربیہ کو اپنے پیروں پر کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔ وہ پتے کی طرح لرز رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



بولنے والوں کو پسند نہیں کرتیں۔“

اس نے جیکھی نظر مجھ پر ڈالی۔

”یقیناً“ آپ بھی۔ اور شاید ہر کوئی یہ ہی کہتا ہے کہ ہم جھوٹے لوگوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتے۔ مگر خود بے چارے جھوٹ اور سچ کی پہچان ہی نہیں رکھتے۔“

”کیا بات ہے۔ آپ کو باتوں میں مکمل حاصل ہے۔“ میں نے فوراً ”داودی۔“

”شکریہ۔ ویسے میرا نام کلی خان ہے۔“

”جی میں جانتا ہوں آپ کا نام۔ آپ کی شخصیت کے مطابق ہی ہے۔“

”اچھا۔ ویسے کلی کے ساتھ بہت سے کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ کس آپ کا نشانہ بننے کی کوشش تو نہیں کر رہے؟“

آر آپ اجازت دیں۔ ویسے کانٹے تو کلی کی حفاظت کے لیے ہوتے ہیں۔“

”ہا ہا ہا۔“ وہ زور سے ہنس پڑی۔ ”میرے خیال میں ایسا نہیں۔ کانٹے تو کلی کو اس کے حقیقی مالک سے ملنے نہیں دیتے۔“

”یہ بھی درست ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”ہم دونوں کی دوستی اچھی رہے گی۔“

”شاید۔“ وہ مسکرائی۔

”تو پھر ایک چائے کا کپ ہو جائے؟“

”نہیں۔“ وہ فوراً ”بولی۔“ ”چائے تو میں تب پیتی ہوں جب میں اپنی اماں کی جھڑکیاں کھاتی ہوں۔“

”مطلب؟“ میں نے نا اچھی سے پوچھا۔

”اماں کی جھڑکیوں سے سر میں درد ہو جاتا ہے پھر چائے تو پینی پڑتی ہے۔“

”آپ کی اماں جھڑکیاں کیوں پیتی ہیں؟“

”وہی شادی کا رونا۔“ اس نے سر جھکا اور میں ہنس

دیا۔ پھر وہ کینٹین کی طرف میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

کچھ لوگوں نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

”یہ ہمارے معاشرے کا عام چلن بن گیا ہے۔“

میں نے خوا خواہ وضاحت دی۔ اس نے بھی سانس لی اور مسکرائی۔ ”آپ کا معاشرہ بہت چالاک ہے۔“

اس نے رائے دی۔

”کیسے؟“ میں نہا۔

”مرد و بار غلطی کر کے بھی پاک صاف اور لڑکی اگر کسی سے ہنس کر بھی بات کر لے تو مجرم ٹھہرا دی جاتی ہے۔“

”آپ بھی ایک مرد ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”میں حقیقت کو نہیں جھٹا سکتا۔“ میں نے جیسے اقبال جرم کیا۔

”میے میں دیں گی۔“ وہ چائے پیتے ہوئی بولی۔

”کیوں؟“ میں نے اچھی سے پوچھا۔

”بس میرے دل نے کہا ہے۔“ وہ کندھے اچکا کر

بولی۔

”آپ کا دل اور کیا کیا کہتا ہے۔ کچھ مجھے بھی اپنے دل کی باتیں بتائیں۔“

کیا بتاؤں۔ ہر جگہ سے زخمی ہے۔ جو بات سنیں گے آپ کی آنکھ بھیک جائے گی۔“

”مگر آپ دیکھنے میں تو ایسی نہیں لگ رہیں۔“

”ہندنا ہر چہ تو نہانے کے لیے ہے۔“

”یہ بھی آپ نے خوب کہا۔“ میں متاثر ہوا۔

”آپ چائے پیتیں۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔“

میں نے اس کے حکم پر فوراً ”گھونٹ بھرا۔“ تو پھر کچھ بتا دیا۔

”میں نے ایک بار پھر اصرار کیا۔“

”بھی تو دوستی کا آغاز ہوا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب پتا چل جائے گا۔“

”یہ بھی ٹھیک کہا۔“

”اچھا۔ میں چلتی ہوں۔“ اس نے اٹھنے کا اعلان کیا۔

”مجھے گھر جانا ہے۔ برتن دھوئے ہیں۔ ورنہ میری

ہمیشہ مجھ میں خوب برسیں گی۔

ورنہ اماں اتنے طعنے دیں گی کہ میرے سر میں درد ہو جائے گا۔“

”ایسا کیوں۔ آپ تو ان کی بیٹی ہیں۔“

”جب بیٹی کی عمر بڑھتی جاتی رہے تو وہ گھر کی ملازمہ بن جاتی ہے۔ چھوٹی ہمیشہ الگ روتی ہیں۔ کہ تمہاری وجہ سے ہماری باری کیسے آئے گی۔“ بنجید کی بات کر کے وہ مسکرانے لگی۔

”ارے نہیں۔ آپ اپنے گھر والوں کے بارے میں غلط سوچ رہی ہیں۔“

”اچھا۔ آپ کو کیسے اندازہ ہوا کہ میں غلط سوچ رہی ہوں۔“

”میرا مطلب وہ نہیں تھا۔“ میں ہلکا گیا۔

”مجھے دو غلے پن سے سخت نفرت ہے۔“ اس نے ایک دم سختی سے کہا۔

”آپ اتنی تلخ اتنی جیکھی میرا مطلب۔“ میں ڈرنے ہوئے بولا۔

”مجھے پتا ہے میں بہت بری ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“ میں شرمندہ سا ہو گیا۔

”میرے اپنے بھائیوں کا بھی میرے بارے میں یہ ہی خیال ہے کہ میں بہت بری ہوں۔ جوان کی بات نہیں مانتی۔“

”میرے خیال میں وہ معاشرے سے ڈرتے ہیں۔“ میں نے غیر شعوری طور پر اس کے بھائیوں کی حمایت کی۔

”کیا وارڈ۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے کچھ ایسا ویسا کر دیا تو ان کی عزت خاک میں مل جائے گی جبکہ باہر وہ خود کتنے ہی ایسے کام کرتے ہوں گے جو دوسروں کی عزت کو خاک میں ملا دے۔“

”آپ شادی کر لیں۔ آپ اتنی خوب صورت ہیں۔“ میں نے یک دم بات پلٹ دی۔

”ہا ہا ہا۔۔۔ شادی۔ ایک جیل سے دوسری

جیل۔ کوئی اچھا مشورہ دیں۔ اسلام میں کہیں بھی شوہر کی ماں کی خدمت میں کرنا نہیں لکھا لیکن آپ کا معاشرہ ہو کہ سسرال والوں کا غلام بننا چاہیے۔“

”آپ کو اس دنیا میں رہنے کے لیے سب باتوں کے لیے خود کو تبدیل کرنا پڑے گا۔ اس طرح تو آپ کے لیے جینا مشکل ہو جائے گا۔“

”میں ایسی دنیا میں جینے سے مرنا بہتر سمجھتی ہوں۔ جہاں انسان انسان پر حاوی ہو رہا ہے زبان کھتی ہے تو جھوٹ کا دھڑلگ جاتا ہے۔“

”کلی۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ مجھے آپ سے ڈر لگ رہا ہے۔“ میں واقعی خوف سا محسوس کرنے لگا۔

”ہاں۔ اب۔ آپ بھی مجھے نفسیاتی مریضہ کا لقب دے دیں۔ یہ ہی گفتگو کا ایندھن ہوتا تھا۔ مجھے معلوم تھا۔“ وہ بنجید کی سے بولی۔

”آپ کو کسی بات سے دکھ ہے شاید۔ آپ کی سوچ اتنی متنی کیوں ہے۔“ میں اس کے زرد پڑ جانے والے چہرے پر ہنسا کر بولا۔

”شاید میرا لڑکی ہونا میرا گناہ ہے۔“ وہ اداسی سے بولی۔

”آپ میں چلی ہوں۔“ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

”کیا پھر ملاقات کی امید رکھوں؟“ میں نے پُر امید نظروں سے پوچھا۔

”نہیں، جیکھی نہیں۔“

”کیوں؟“ میں بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”مستر سعد! میں ابھی اتنی کمزور نہیں ہوں کہ آپ کی تھوڑی سی دل جوئی سے پھل جاؤں۔ میری زندگی میں بہت دکھ ہیں اور میں مزید دکھ پالنا نہیں چاہتی۔“ اس نے وہ ٹوک انداز میں کہا۔

”لیکن۔ میری بات تو نیسے۔“ وہ چلنے لگی تو میں نے پکارا۔

”کلی۔ آپ۔۔۔ میں جو چاہ رہا تھا نہ بول سکا۔“

”آپ نے کہا مجھے معاشرے کے مطابق چلنا ہوگا تو یاد رکھیے۔ معاشرہ اس طرح کی ملاقاتوں کو پسند نہیں کرتا۔ صاحب۔ اللہ حافظ۔“





### وقت تھمتا نہیں،

لوگ چلتے ہوئے راستوں میں  
 بھڑکتے ہیں  
 اور بھڑکتے سہ کے لگے گھاؤ بھڑکتے ہیں  
 ساتھ چاہے میسا بھی ہو  
 کوئی صدیوں کی دُوری جگا کر چلا جلتے  
 یا پاس ہو  
 وقت رکتا نہیں  
 وقت کی آنکھ میں نقش کوئی بھی جمتا نہیں  
 وقت تھمتا نہیں

ارشاد ملک

راستوں میں اک نگر آباد ہے  
 اس تصور ہی سے گھر آباد ہے  
 کیسی کیسی صورتیں گم ہو گئیں  
 دل کسی صورت مگر آباد ہے

کیسی کیسی محفلیں سُونی ہوئیں  
 پھر بھی دُنیا کس قدر آباد ہے  
 بے خودی رہ سوا تو کیا کرتی مجھے  
 مجھ میں کوئی بے خبر آباد ہے  
 دُھوپ بھی سنو لاگئی ہے جس جگہ  
 اس خرابے میں سحر آباد ہے  
 سحر انصاری

جو ترے آستان سے لوٹ آئے  
 جنتِ دو جہاں سے لوٹ آئے  
 ماہِ وانجم کے ساتھ تھے ہم بھی  
 مگر ہم درمیاں سے لوٹ آئے  
 لگ گیا جی قفس میں جن جن کا  
 بارہا آشیاں سے لوٹ آئے  
 اب تو کعبے میں روشنی کر دو  
 اب تو کوئے بُتاں سے لوٹ آئے  
 ہائے جو گردِ راہ ہیں اب تک  
 وائے جو کارواں سے لوٹ آئے  
 احسان دانش

کمر باندھے ہوئے چلتے کویاں سب یاد بیٹھے ہیں  
 بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں  
 نہ چھوڑے نکلتے بادِ بہاری راہِ لگ اپنی  
 تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بے زار بیٹھے ہیں  
 تصورِ عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر  
 غرق کچھ اور دُھن میں اس گھڑی سے غلام بیٹھے ہیں  
 بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں  
 نہیں اٹھنے کی طاقت، کیا گرس لاچار بیٹھے ہیں  
 کہاں صبر و تحمل، آہِ ننگ و نام کیا شے ہے  
 یہاں روپیٹ کران سب کو ہم یک بار بیٹھے ہیں  
 مہلاگردشِ فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا  
 غنیمت ہے کہ ہم صورتِ یہاں دوچار بیٹھے ہیں  
 انشاء اللہ نان انشا



## ہفت گنا عید

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے،

”میں نے نزدیک سب سے زیادہ قابل رشک وہ مومن ہے جو ہلکا چٹکا (کم آمدنی والا) ہو۔ اسے نماز سے واقف نہ ملا ہو۔ (نقلی نماز اور تہجد زیادہ پڑھتا ہو) لوگوں میں گناہ ہو۔ اس کی پروا نہ کی جاتی ہو، اسے ضرورت کے مطابق رزق میسر ہو۔ (اتنا زیادہ رزق نہ ہو کہ بچا کر رکھا جائے) وہ اس پر صبر کرے (مزید کا لاچ نہ کرے) اسے جلدی موت آجائے۔ اس کا ترکہ معزز ہو اور اسے دھتے والیاں بھی کم ہوں۔

اہم معلومات،

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا کا نام عبدالمطلب، دادی کا نام فاطمہ بنت عمرو بن عائد ثانی کا نام بڑے بنت عبدالعزیٰ اور نانا کا وہب تھا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا نام عبداللہ اور والدہ کا نام آمنہ تھا۔

شمارہ - الہ آباد

حسن اخلاق،

حضرت علیؑ سے پوچھا گیا۔ انسان میں کتنے عیب ہوتے ہیں۔ جواب ملا بے شمار لیکن ایک خوبی سب پرچہ وال جتنی ہے اور وہ ہے حسن اخلاق۔

اقرام اکرم،

امام زہریؒ بہت بڑے محدث اور فقیہ گزرے

ہیں۔ ان کی قوت یادداشت غضب کی تھی۔ ایک بار بنو امیہ کے فرماں دوا ہشام بن عبدالملک نے امام زہریؒ سے دعا است کی کہ میرے لڑکوں کے لیے کچھ احادیث لکھوا دیجئے۔

امام صاحبؒ نے کتاب کو چار سو حدیثیں لکھوائیں اور ہشام کو بخود دیں۔

چند دن بعد ہشام نے ان کو امتحان امام زہریؒ سے کیا کہ وہ آپ کی چار سو حدیثوں والی کتاب کہیں گم ہو چکی ہے۔

امام صاحبؒ نے فرمایا: ”کوئی مضائقہ نہیں۔“ اور پھر کتاب کو ملا کر وہی چار سو حدیثیں لکھوا دیں۔ ہشام دوسری کتاب کے غلطے پر پہلی کتاب نکال لایا اور دونوں کا مقابلہ کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دونوں کتابوں کی کئی ہوتی احادیث میں ایک حرف کا بھی فرق نہیں تھا۔

(خوبصورت کتابیں۔ صدر کشف یوسف زنی) سندھو اجن۔ سالکھڑ

تشخیص،

”ڈاکٹر صاحب!“ یکم حاد نے کہا۔ ”براہ کرم مجھے بتائیں کہ میں کس مرض میں مبتلا ہوں۔ آخر مجھے تکلیف کیا ہے؟“

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے مرتابا پر مریض کو دیکھا اور بولے۔ ”عقلم خالقون! آپ بیک وقت تین امراض میں مبتلا ہیں۔ پہلا مرض یہ ہے کہ آپ ضرورت سے زیادہ بیماری بھرم میں ہیں۔ آپ کے موٹاپے کا علاج ہونا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ آپ کے دانت دیکھ بھال نہ ہونے کے سبب انتہائی بیمار نظر آتے ہیں۔ ان پر توجہ

دینے کی ضرورت ہے۔ آپ کا تیسرا اور سب سے خطرناک مرض نظر کی کمزوری ہے۔ آپ کو اپنی آنکھوں کے لیے نظر کے کسی اچھے چشمے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ میرے دفتر کے باہر آویزاں میرے نام کی پلیٹ پڑھیں تو آپ کو بخوبی علم ہو جائے گا کہ میں ہی آج ڈی ڈاکٹر ہوں اور مقامی یونیورسٹی میں پڑھاندا ہوں۔“ غرہ، اقرام کرچی

آرزو،

کہتے ہیں کہ خلیفہ عبدالملک نے وفات کے وقت اپنے عمل کی کھڑکی سے ایک دھوپی کو کپڑے دھوئے دیکھا تو اس نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔

”کاش میں اس دھوپی کی طرح ہوتا کہ اپنی محنت کی کمائی سے اپنا پیٹ پالتا۔ کاش میں خلیفہ نہ ہوتا۔“ ابو جازم نے یہ قول سنا تو کہنے لگے۔

”اللہ لکھ لے لوگ موت کے وقت اس بات کی تمنا کرتے ہیں جو ہمیں حاصل ہے لیکن ہم موت کے وقت ان کی حالت کی آرزو نہیں کرتے۔“

اسید جاوید۔ علی پور چٹھ

سوال سے پہلے دینا،

حضرت سعید بن العاصؓ نے وفات کے وقت اپنی اولاد سے کہا۔

”میری وصیت کون قبول کرے گا؟“

بڑے بیٹے نے کہا۔ ”میں۔“

کہنے لگے۔ ”میرا قصدا کہنا ہو گا۔“

پوچھا۔ ”کیتنا ہے؟“

کہا۔ ”اسی ہزار درہم۔“

پوچھا۔ ”کیوں لیا تھا؟“

جواب دیا۔ ”دو قسموں کے آدمیوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے۔ شریف النفس غریبوں کی اور حیا سے سوال نہ کر سکنے والوں کی۔ جو بخود ہو کر آتے تھے مگر خرم سے مانگ نہ سکتے تھے۔ فرط حیا سے چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ میں سوال کرتے سے پہلے ہی انہیں دے دیتا تھا۔“

قابل دید،

ایک چیف کانسبل ماہر حیوانیات بھی تھے۔ ایک دن ان کے گھر فون آیا جو ان کی بیوی نے دلیو کیا۔ ایک صاحب نے بریکٹان سے بلے میں پوچھا۔

”کیا ڈاکٹر صاحب کا گھر بھی ہے؟“

”جی ہاں! آپ کو جانو دول کے ڈاکٹر کی حیثیت سے ان کی مدد و درکار ہے یا بطور پولیس آفیسر۔۔۔“

دونوں حیثیتوں سے۔ ا۔ جواب ملا۔ ”ہمارا کتنا منہ نہیں کھول رہا ہے کیونکہ اس کے منہ میں ایک ڈاکو کی ٹانگ ہے۔“

عائش، تحریم۔ گجرہ

اقوال زریں،

ہ۔ عالم سے ایک گھنٹے کی گفتگو دس برس کے مطالعہ سے زیادہ بہتر ہوتی ہے۔

(اقوال بطیموس)

ہ۔ تاریخ کی اکثر ایسی کتابوں کا مکتبہ جی پر جھوٹے حاشیے نہیں چڑھائے گئے، بے حد مشکل ہے۔

(سنائیانا)

ہ۔ خاموشی دانش مندی کی علامت ہے تو یہی لیکن کبھی کبھی اس سے حماقت کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

(ولیم کوڈج)

ہ۔ تنگ نظروہ۔ ہے جسے دو برائیوں میں سے ایک کو منتخب کرنا پڑے تو وہ دونوں کو اختیار کر لیتا ہے۔

(بقراط)

ہ۔ خوشامدی شخص تمہاری برائیوں اور بھلائیوں دونوں کو پسندیدہ بتلائے گا۔

(خلیفہ مامون الرشید)

ناٹکہ، شمارہ۔ الہ آباد

اچھی بات،

دو قسم کے لوگوں سے ہمیشہ بچ کر رہو۔ ایک معروف اور دوسرے معزوف۔ کیونکہ معزوف لوگ اپنی مرضی سے اور معروف لوگ اپنے مطلب سے ملتے ہیں۔

حافظ سمیرا۔ ۱۵۷۔ این بی



## پھل دار درخت،

پھل دار درخت کے ڈالے کو لگتا ہے نہ اس کے مضبوط تنے کو۔ پھل جب بھی لگتا ہے لہڑنے والی شاخ کو لگتا ہے اور جہاں بھی لگتا ہے کاپتی ہوئی ڈالی کو لگتا ہے۔ جس قدر شاخ رکوع میں جلنے والی ہوگی، اسی قدر پھل کی زیادہ مال ہوگی۔ فائدہ درخت کو اس کا یہ ہے کہ پھل کی وجہ سے ڈالا بھی کھاڑے سے محفوظ رہتا ہے اور تنہا بھی۔

درخت کی بھی عزت ہوتی ہے اور درخت کی وجہ سے سارا بارغ عزت دار بن جاتا ہے۔  
(اشفاق احمد - زاویہ)

## استدعا،

ایک نوجوان نے جس پر ایک رئیس زادے کا بیٹا اڑنے کا الزام تھا۔ رنج کے سامنے اقرار کیا۔  
”میں جرم ہوں مجھے سزا دیجیے اور اس کے ساتھ بیوی سے بھی طلاق دلوا دیجیے۔“  
رنج نے جیت سے پہنچا ”مگر طلاق کیوں؟“  
نوجوان نے جواب دیا ”جب میں نے اس رئیس زادے کا بیٹا کھولا تو اس میں سے کچھ برآمد نہ ہوا۔ میری بیوی کی تصویر کے سوا۔“

نداء، فضا - کراچی

## خیال رکھنا،

زندگی میں دو لوگوں کا بہت خیال رکھنا۔  
1۔ وہ جس نے تمہاری حیات کے لیے سب کچھ مارا ہو۔ (تمہارا باپ)  
2۔ جس کی دعاؤں سے تم نے سب کچھ جیتا ہو۔ (تمہاری ماں)  
عزرا ناصر - کراچی

## بڑے لوگوں کی بڑی باتیں،

وہ بڑے لوگ سر بلند دیتے ہیں جو مکبر کے تاج کو دور چینگ دیتے ہیں۔ اگر انسان رنج یا

سرت کی فکر سے بند ہو جائے تو آسمان کی بلندی بھی اس کے قدموں کے نیچے آجائے گی۔

(سید سعید)

وہ کنول کا پھول تالاب میں کھلا ہو تو سب کو خوش لگتا ہے۔ کناسے پر کھڑے لوگ اسے سرایتے ہیں لیکن گندگی میں جا کر اسے ٹوٹنے کا حوصلہ ہر کسی میں جنم ہوتا۔  
(فاکٹر دیو داس)  
وہ خود غرض لوگ انڈوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان میں اپنے علاوہ کسی دوسرے کی گواہی نہیں ہوتی۔

(بلت گڑ)

وہ سیدھی اور صاف بات کہنے سے نقصان بہت محفوظ مگر فائدہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔

(لڈو میکالے)

شبنم ششاد - یزمان

## نئی نسل،

ایک نوجوان اپنے والد کے ساتھ کار میں کہیں جا رہا تھا۔ والد کار چلا رہے تھے، اس لیے کار بالکل آہستہ چل رہی تھی۔ والد اپنے بیٹے کو آج کل کے نوجوانوں کی خرابیوں اور لاپرواہیوں سے آگاہ کر رہے تھے کہ وہ کس قدر تیز رفتاری سے موٹر سائیکل اڑنا سیکھ چکے ہیں۔ اتنے میں اچانک ایک بچہ سائیکل چلاتے ہوئے کار کے سامنے آگیا۔ کار چونکہ رفتار تھی اس لیے والد نے آسانی سے بڑیک لگا دیے اور بچہ کار کی زد میں آنے سے بچ گیا۔ والد نے اپنی نصیحتوں کے ثبوت میں بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”دیکھا تم نے...؟ یہ تو میں کار چلا رہا تھا اور وہ آہستہ تھی لہذا حادثہ نہیں ہوا، اگر میری جگہ کار تیز چلا رہے ہوتے تو یقیناً بچہ کو درد دیتے ہوئے گر جاتے۔“  
”ڈیڈ! اگر میں کار چلا رہا ہوتا تو ایک گھنٹہ پہلے اس جگہ سے گزر چکا ہوتا۔“ بیٹے نے اطمینان سے جواب دیا۔  
صدف عمران - کے ڈی اے



خالہ جیلانی



گلبرگ مندی

منازلہ ناز بخوا

میں آگ عام سی لڑکی  
میری آگ عام سی خواہش  
آگن میں ہواک پیٹر  
اور پیٹر پر دم جھم بادش

شجاع آباد

کرن

اپنے ہی ہوتے ہیں جو دل پر وار کرتے ہیں عین عزتوں کو کیا خبر دل کی بات یہ دکھتا ہے شہلا شہزادی

چوک جمال خاندول

یہ کیا ہوا کہ بھرے آسمان کے آگن میں بچھڑ گیا وہ ستارہ جو ہمارے نام کا تھا بڑھاکے اس سے براہ و دم یہ سوچتے ہیں وہی بہت تھارے جو دعا سلام کا تھا

شمالہ عنایت چغتائی

سوچا کیے کہ ٹوٹ نہ جائے کسی کا دل گزری ہے اپنی عمر اسی دیکھ بھال میں خالدہ وہ بات تو اسے اب یاد بھی نہیں ہم جی کو خون کر گئے جس کے ملاں میں

شافیہ اسلم

کیوں کچھ سوچ کر میں ابتادل چھوڑا کیوں دیتی وہ اتنی ہی کر سکا وفا، جتنی اس کی اوقات تھی

عنفت جبین

آئینہ دیکھ کے خوش ہیں میری آنکھیں بے حد کہ میرے چہرے میں شبابت میری ماں کی ہے

سرت الطاف احمد

میرے دشمن بھی مجھے ہنتا ہوا چھوڑ گئے! کہنے لگے تیرے اپنے ہی کا ہی تھے رلانے کیلئے

نازلہ شاکر  
یقین اس کو نہیں آتا، وضاحت میں نہیں کرتا گزرجائے گی ساری عمر، شاید امتحانوں میں  
امبر گل

ہمیشہ حلقہ نا مہسرباں میں رہتے ہیں جو حق پہ ہوتے ہیں وہ امتحان میں رہتے ہیں حد کی آگ سے کس کس کا گھر جلاؤ گے کہ اہل عشق تو سارے جہان میں رہتے ہیں سندھو اجی

زیست میں جب شام غم ٹھہر گئی ہے بہت دود کہیں اندر داسی بکھڑ گئی ہے اے زندگی اب بھی ہم تنہا ہیں تو کیا ہوا کچھ اور گزرجائے گی، کچھ تو گزرجائے گی

صفیہ عباس خان

نہیں تھا زود اس کی ستم نوازیوں کا مجھے بھی حوصلے میرے خدا سے ملے میری انا کیوں کہتی ہے بار بار مجھے وہ محبت ہی کیسی جوا التجا سے ملے

یاسمین کنول

کیا ہوا اگر دیکھ کر نہ چھپیر لیتا ہے یہ تو تلی ہوئی کچھیر کے پہچان ابھی باقی ہے صفیہ کوکب گوئل

اسلام آباد

کیوں غریبوں سے کھلتی ہے رات روز آگ چاند بیسلی ہے رات شمعیں ساری بجھا کے جاتی ہے گھر کا معمول جانتی ہے رات



ایمن ہری پور تھوڑا  
ہجوم میں تھا وہ شخص کھل کر نہ دوسکا ہو سکا  
مگر یقین ہے کہ شب بھر نہ سو سکا ہو سکا  
وہ شخص جس کو سمجھنے میں مجھ کو عمر لگی  
پھر کر مجھ سے کسی کا نہ ہو سکا ہو سکا

نغمات بٹ لاہور  
سچ کہوں مجھ کو یہ عنوان برا لگتا ہے  
ظلم سہتا ہوا انسان برا لگتا ہے  
کسی قدر مصروف ہو گئی یہ دنیا اپنی  
ایک دن بھرے تو ہم ان برا لگتا ہے

طاہر ملک پسرور  
آیتے میں شاید کوئی بال آگیا  
پہلا سا آپ کی بات کا لہجہ نہیں رہا  
تو نہ رہا تو درد کو سا کھتی بنا لیا  
میں مجھ سے دودھ کر بھی تنہا نہیں رہا

نوال افضل کھن بکرات  
نوال افضل کھن بکرات  
مستقل بولتا ہی رہتا ہوں  
کتنا خاموش ہوں میں اندر سے

خسایم اعوان آخون باندی  
اب کے تجدید وفا کا نہیں امکان جاناں  
یا دیکھا مجھ کو دلائل تیرا یہاں جاناں  
ہم کہ روٹھ گئی ہوئی دُرت کو بھی منالیتے تھے  
ہم نے دیکھا ہی نہ تھا موسم ہجران جاناں

عزیز فرشتہ گوجرانوالہ  
اگر کسی سے مراسم بڑھانے لگتے ہیں  
تیرے فراق کے دکھ یاد آنے لگتے ہیں  
پلک جھپکتے ہی دنیا اُجاڑ دیتی ہے  
وہ بستیوں جنہیں بستے زمانے لگتے ہیں

فوقیہ بابا بوسے والا  
پھر تجھ پر یقین کر رہے ہیں  
وہ دل جو ہزار بار ٹوٹے  
مہوش دُور گوجرانوالہ  
تو مرا حوصلہ تو دیکھ داد تو دے کہ اب مجھے  
شوق کمال بھی نہیں، خوفِ زوال بھی نہیں

یاسین کنول پسرور  
تیرے بغیر جس میں گزرا یہ مٹی ساری عمر  
مجھ سے جب اُن کے مل کے تو وہ گھر ہی اور تھا  
ایضاً نا چکوال

مسنز قصیر آصف خان ملتان  
تیرے ہوتے ہوئے مغل میں ملاتے ہیں چراغ  
لوگ کیا سادہ ہیں، سوچ کر کو دکھاتے ہیں چراغ  
اپنی محرومی کے احساس سے شرمندہ ہیں  
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بھلاتے ہیں چراغ

فدیرہ ٹریٹ بکرات  
پیر دکنی شاخ گل کی، وحشتِ غزال کی ہو  
جو اس طرح ہو تو دوستی پھر کہاں کی ہو  
کوئی تو ہو جس پر اس کا گمان گزرتے  
کہیں کہیں تو مشابہتِ غر و غلال کی ہو

انیس لاکرن بہاول پور  
کسی کو کہاں ہے اب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے  
ہائے وہ روز و شب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے  
اب خواب ہو گئی ہے وہ رسم دوستی  
اک وہم سا ہے اب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

شازیہ بٹ لاہور  
انکار نہ اقرار بڑی دیر سے چپ ہیں  
کیا بات ہے سر کا بڑی دیر سے چپ ہیں  
اب کوئی اُشاہ ہے نہ بیخام نہ آہٹ  
بام و در و دیوار بڑی دیر سے چپ ہیں

سمیرا ملک گوجرانوالہ  
کبھی یوں بھی تھا کہ ہزار تیر جگر میں تھے تو کبھی نہ تھے  
مگر اب یہ ہے کسی مہربان کے تپاگ نے بھی دلا دیا



# حالاتِ مادی

ہمارے اندر اچانک ہی خوابانے لگتی ہے۔  
اور ہم خیال و پریشان رہ جاتے ہیں کہ کیا ایک  
وجود میں، کوئی دوسرا جہان بھی چپکے سے آباد ہو سکتا ہے  
وہ خواب بھی اپنے ہوتے ہیں وہ الفاظ بھی۔ کچھ ہوتے  
ہیں ایسے ہی دل کے برا سرار میکین۔ اجمدا سلام اجمدا  
کی یہ غریب و صدمت نظم، ایسی ہی زندگی جیسے والوں کے نام۔

## سورٹھ ساند کہہ ڈاڑھی ہے

یہی ڈاڑھی میں تحریر میں نیا ہی کی یہ نظم نئے سال  
برآپ سب بہنوں کی نذر۔

## نیاسال،

نیاسال ایسے  
ویران صحرائوں کی نیلی تہوں سے اُٹھتا  
خیابانِ دشت و جبل کی ٹھٹھکی خوشی میں  
برفیلی سیٹی بھلاتے  
دے پاؤں

رخ آلود شاموں کی خوشیاں  
اس کے قدموں کی آہٹ سیٹھے  
گزر گیا ہوں پر سائیاؤں میں نور کناں ہے  
درا آئی ہے شب کو در پہلوں در زوں سے  
بر سرِ شورِ جھونکوں کی بے مہر محنتِ نرک  
بہر مدت زندہ پائیوں پر پرندے

کناروں پر ایسا تادہ پیر زوں کی ننگا شاخوں کی  
جانب اڑے جا رہے ہیں  
میکین آنگنوں میں پھتوں پر  
دھڑکتے دلوں میں ہزاروں خیالوں کی  
شعین جلائے  
دے پاؤں آتے ہوئے سالوں کو دیکھتے ہیں

## قرۃ العین کہہ ڈاڑھی ہے

کسی طرح میں، کسی چھوٹے سے پل میں، کسی چھوٹی سی  
بات، کسی دُور بستی جہی کی "محبت" سے ایک نئی زندگی



# روشنِ حرف و ہواستان

آئینہ مقدسہ

میری منزل ہے کہاں، میرا ٹھکانہ ہے کہاں  
صبح تک مجھ سے پچھڑ کر مجھے جانا ہے کہاں  
سوچنے کے لیے اک رات کا موقع دے دے  
ہم تیرے شہر۔  
اپنی آنکھوں میں چھپا رکھے ہیں جگنو میں نے  
اپنی پلکوں پہ سجا رکھے ہیں آنسو میں نے  
میری آنکھوں کو بھی برسات دیکھنے کا موقع دے  
دے

ہم تیرے شہر۔  
آج کی رات میرا دردِ محبت سن لے  
کچکپاتے ہوئے ہونٹوں کی شکایت سن لے  
بھولنا ہی تھا تو اقرار کیا ہی کیوں تھا  
بے وفا تو نے مجھے پار کیا ہی کیوں تھا  
صرف دوچار سوالات کا موقع دے دے  
ہم تیرے شہر میں آئے ہیں مسافر کی طرح  
5۔ کلاسک شاعری میں میرا انتخاب مرزا اسد اللہ  
خان غالب کی یہ غزل۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں  
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصت کاروبار شوق کے  
نظوق نظامہ جمال کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے  
اب وہ رعنائی خیال کہاں

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں  
میں کہاں اور یہ وہاں کہاں

1۔ ابھی کچھ زیادہ دن تو نہیں گزرے ہیں دوچار  
سال پہلے کی بات ہے، زندگی بہت رواں دواں تھی۔  
گر میوں کی می دھوپ میں اور سردیوں کی ٹھنڈی راتیں  
ہمارے دم سے آباد رہتی تھیں۔ ہر دم قہقہے گونجا  
کرتے تھے اور جو کوئی کسی کو اداس دیکھ لیتے تو فوراً  
کہتے تھے۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا  
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا  
اور پھر وقت کا ظالم پنجہ ہم سب کو جدا کر گیا۔  
اکثریت کی شادیاں اور پھر داریاں اور اب ہم کہتے  
پھرتے ہیں۔

منیر اب بھی مان لے تو مقدر کی حقیقت کو  
جو ہے وہ بھی ضروری ہے، جو تھا وہ بھی ضروری تھا  
2۔ کبھی وقت تھا شاعری ہمارے ہر قدم پہ ساتھ  
ساتھ ہوا کرتی تھی اور اب دل ڈھونڈتا ہے فرصتیں  
وہی۔ بہر حال نون نقوی کے ساتھ تعارف ان کی  
مشہور غزل کے ساتھ ہوا۔

وہ روٹھا تو شہرِ خواب کو غارت بھی کر گیا  
پھر مسکرا کے تازہ شرارت بھی کر گیا

یہ دل اس سے پچھڑتا نہ تھا اک گھڑی  
آج اس کو بھولنے کی جرات بھی کر گیا

3۔ جناب ایہ نہ تھی ہماری قسمت کہ کوئی ہمیں دیکھ  
کربے ساختہ شعر دھتلا۔

ایہ شادی کی رات ہمارے شوہر نادر نے شعر  
سننے کی فرمائش ضرور کی تھی جو کہ ہم پوری نہیں  
کر سکے تھے۔

4۔ غلام علی کی آواز میں غزل جو ہمیں اتنی پسند ہے  
کہ جہاں کہیں سنیں، سر پہ اختیار دھنسنے لگتے ہیں اور  
اسری رحمن کی طرف جب بھی جاؤں تو اسے کہتی  
ہوں۔ ”پلیز غلام علی کو لگا دو“ اور وہ فوراً ”سمجھ جانی  
ہے کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔“

ہم تیرے شہر میں آئے ہیں مسافر کی طرح  
صرف اک بار ملاقات کا موقع دے دے

کئی دنوں سے یہ دن مجھ میں آکے ڈھلتا ہے  
کئی دنوں سے کسی دوسرے کی زد میں ہیں

کئی دنوں سے خیالوں کے طاق بھول پر  
کسی کے نام کا رکھا دیا جلاتا ہوں

کئی دنوں سے یہ سارے عشق جاری ہے  
کئی دنوں سے عجب دل کو بے قرار ہے

کئی دنوں سے

میری دائری میں تحریر کینی اعظمی کی یہ غزل آپ  
سب بہنوں کے نام۔

میں ڈھونڈتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا  
نئی زمین، نیا آسمان نہیں ملتا

نئی زمین، نیا آسمان مل بھی جائے  
نئے سفر کا کہیں کچھ نشان نہیں ملتا

وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل میرا  
کسی کے ہاتھ کا اس پہ نشان نہیں ملتا

وہ میرا گاؤں ہے وہ میرے گاؤں کے چولہے  
کہ جن میں شعلے تو شعلے دھواں نہیں ملتا

کھڑا ہوں کب سے میں چہرہ دل کے جنگل میں  
تمہارے چہرے کا کچھ بھی پتا نہیں چلتا



عائشہ ارما کہہ ڈاڑھی سے

بعض اوقات ہم بہت تنہا اور اداس ہوتے ہیں  
اداسی کی یہ کیفیت اس غزل میں لفظوں میں بیان کی  
گئی ہے۔ اداسی اور تنہائی کے شاعر ناصر کاظمی کی  
ایک خوبصورت غزل آپ کے لیے۔

مسلل بے کلی دل کو رہی ہے  
مگر جینے کی صورت تو یہی ہے

میں کیوں پھرتا ہوں تنہا مارا مارا  
یہ بستی چیں ہے کیوں سو رہی ہے

چلے دل سے اُمیدوں کے مسافر  
یہ نگرانی آج غالی ہو رہی ہے

نہ سمجھو تم اسے شوہر بہاراں  
غزال پتوں میں چھپ کر رہ رہی ہے

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر  
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

کہہ ڈاڑھی سے

میری دائری میں تحریر منوہ جیل کی غزل سب  
قاریاں بہنوں کی نذر۔

کئی دن سے اک آواز مجھ میں گونجتی نہیں  
کئی دنوں سے کوئی مجھ میں رت جگاتا ہوا

کئی دنوں سے سماعت کی دیواروں پر  
نہ کوئی چاند ہی اُترا نہ کوئی پھول کھلا

کئی دنوں سے یہ آنکھیں ہیں نیند سے بوجھ  
کئی دنوں سے ہیں بے نور مدد کے چاگل



## میری شادی کو بیلان ملے

ادارہ

گل پری مرزا لاہور

بسم اللہ سے ابتدا ہے میری  
سدا سب خوش رہیں یہ دعا ہے میری  
آپ سب کی جانی بچانی گل پری مرزا حاضر خدمت  
ہے۔ تعلق لاہور سے ہے۔ پیچھے سے افغانستان کے  
رہنے والے ہیں۔ لیکن دل و جان سے لاہور کو چاہتے  
ہیں کیونکہ ”نور کورے“ تعلیم  
کاش! ہم بھی پڑھے لکھے ہوتے  
تھیں لکھتے جان چال تعلیم کی داستان  
حافظ قرآن ہوں۔ تعلیم واجبی سی ہے، لیکن کوئی  
نہیں پہچان سکتا کہ مبدولت کتنا پڑھے ہوئے ہیں۔  
ابھی پچھلے دنوں میں نے ایک پڑھی لکھی اور نائکس  
فیملی کو خط لکھا۔ آپ یقین کریں کہ ان کے یہ الفاظ  
میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں کہ ”گل پری اتنا  
اچھا خط لکھا ہے کہ میں نے تین بار پڑھا اور دوسروں کو  
بھی پڑھا ہے۔ ہم نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں چا  
کر اتنا اچھا لکھنا نہیں سیکھا اور تم مجھے حیرت ہے کہ تم  
نے اتنا اچھا لکھنا کہاں سے سیکھا“ اب ڈیر قارئین!  
آپ تو جانتے ہیں ناکہ کہاں سے سیکھا ہے؟ خواتین  
اور شعل زندہ باد۔ آگے کے ارادے ہیں شادی کرنا۔  
ارے! ارے! ایران مت ہوں۔ واقعی جنوری یا فروری  
میں میری شادی خانہ آبادی ہے ان شاء اللہ مشاغل  
میں خواتین اور شعل پڑھنا اور اپنی ڈائری لکھنا شامل  
ہیں۔

(2) خامیاں

کبھی ہم بھٹکتے ہیں چاہتوں کی تیز بارش میں  
کبھی برسوں نہیں ملتے کسی ہلکی سی رنجش میں

خوبیاں

ہم خوشبو کے سوداگر ہیں اور سچا سودا کرتے ہیں  
جو گلاب پھولوں جیسا ہو بن و مومن ہی بک جاتے ہیں  
ہم شہر وفا کے لوگوں کا تم حال بھلا کیا جانو گے  
ہم دل کی بات چھپاتے ہیں اور آنسو بھی پی جاتے ہیں

(3) خواتین ڈائجسٹ سے میرا تعلق بہت ہی پرانا

ہے۔ اتنا پرانا کہ مجھے تھوڑا، تھوڑا یاد ہے کہ میں اپنے  
داواچی کے کمرے میں سینے سے شرابور ہو کر کمائیاں  
پڑھا کرتی تھی یہ الگ بات ہے کہ مجھے سمجھ میں آتی  
تھیں یا نہیں لیکن میرے خواب ریزہ ریزہ ”میں نے  
اپنے شعور میں پڑھی تھی اور لاسٹ قسط جب پڑھی تو  
آپ یقین جانیں میرا سارا دن روتے ہوئے گزر اٹھا۔  
جب گھر والوں کو پتا چلا تو صبح نے خوب مذاق اڑایا کہ  
گل پری کی ہیروئن مرغی ہے افسوس۔

پہلے رسالہ میری بہن مہنا یا بانی کسی سے منگو کر  
پڑھتی تھیں اور باقاعدہ اس پر کورچرھا کر چیسے کہ یہ کوئی  
بڑی ہی مقدس اور نایاب کتاب ہے۔ لیکن مجھ سے  
انتظار کی سونہر پلٹا نہیں جاتا۔ اس لیے اپنا رسالہ  
منگواتی ہوں۔

اچھا! اب آپ کو ایک دلچسپ بات بتاتی ہوں۔  
میری عادت ہے کہ جب بھی کوئی اچھی اسٹوری

پڑھوں اسے کسی نہ کسی سے ضرور ڈسکس کرتی ہوں  
اکثر اپنی بہن گل بیٹا باجی سے یا کسی اور کو سنا کر اس پر  
تبصرہ کرتی ہوں۔ پہلے پہل جب بھابھی کی نئی نئی  
شادی ہوئی تھی۔ میں اسے دل لگا کر پوری کہانی سناتی تو  
وہ بڑی خاموشی سے پوری کہانی سن کر کہتی۔

”گل پری! اس میں بہروں کون سی تھی“ دھت  
تیرے کی ساری رات کہانی سنی صبح پوچھا لیکن عورت  
تھی یا مرد۔ مجھے یقین ہی سے رائٹ کرنے کا بے حد شوق  
ہے۔ بچوں کے لیے طبع آزمائی کی تو کامیاب ٹھہری۔  
لیکن جب خواتین اور شعل کے لیے تحریر لکھی تو۔۔۔  
تو اسے رسالے والو!

یہی نہیں کہ بس اپنا حساب دینا ہے  
میری کہانیوں کے حشوں کا بھی جواب دینا ہے  
ہائے اللہ! رسالوں میں مصنفین کے ناموں کی  
لسٹ دیکھتی ہوں تو دل سے ایک ہوک سی اٹھتی ہے۔  
یا اللہ! رسالوں پر بھی مصنفین کے ناموں کی طرح  
جگہ گاہیں ہم۔ قارئین اچھے لفظوں میں یاد کریں۔  
کوئی ایسا افسانہ لکھ جائیں ہم لیکن۔ ان شاء اللہ کبھی  
نہ کبھی تو ضرور کامیابی نصیب ہوگی۔

نور حق شمع الہی کو بجھا سکتا ہے کون  
جس کا حای ہو خدا اس کو مٹا سکتا ہے کون  
ابھی تو فی الحال مجھے اتنی فرصت نہیں مل رہی  
کیونکہ۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے  
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

(4) سالگرہ۔ اپنی پیدائش کے متعلق جب بھی امی  
سے پوچھا تو جواب اس طرح کا ملتا ہے۔ ”لو کوئی فصل  
بیک کر تیار ہو چکی تھی اور مٹھوں کی پکی تھی۔“ لو کرلو  
گل اور منلو سا لگہ۔ البتہ۔

جو بات بتا نہیں سکتی اسے میں فرض کرتی ہوں  
چلو میں فرض کرتی ہوں ابھی میں پندرہ سال کی ہوں  
ہا ہا ہا۔

(5) میں اپنا پسندیدہ شعر بھی سنائوں گی۔ اقتباس بھی

اور لطیفہ بھی۔ اب حاضر خدمت ہوں، کچھ تو سیوا  
کرنے دیں۔

پسندیدہ اقتباس۔ ”اپنی اہمیت جتانے کے لیے کسی  
سے دور ہونا تو ضروری ہے، لیکن اس قدر نہیں کہ وہ  
آپ کے بغیر جینا سیکھ لے۔“

پسندیدہ لطیفہ۔ وہ رات کو اس سے ملنے چھت پر گئی  
تو اس نے اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا کہ ”جاناں!  
تمہارے ہاتھ بہت گرم ہیں اور بتا ہے گرم ہاتھ وفا کی  
علامت ہوتے ہیں۔“

اس نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”ایک سو دو بخار  
ہے مجھے۔ اڈا تو صی شاہ۔“  
پسندیدہ شعر۔

قاصد پیام شوق کو اتنا نہ کر طویل  
فقط کہنا یہ ان سے، آنکھیں ترس گئیں  
آپ کو میرا یہ تعارف کیسا گا؟ ضرور آگاہ کیجیے گا۔

## خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول



بساطِ دل

آمنہ ریاض

قیمت --- /- 500 روپے

منگوانے کا پتہ:

کتبہ عمران ڈائجسٹ: 37۔ اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021





## نادرہ خاتون پیارے عجب

خط بھجوانے کے لیے پتا  
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔  
Email: info@khawateendigest.com  
khawateendigest@hotmail.com

### فریحہ شبیر... شاہنکھڑ سرگودھا

وہیے تو خواتین، شعاع اور میرا ساتھ تین چار سال پرانا ہے مگر باقاعدگی سے پڑھنا ایک سال پہلے شروع کیا۔ جب فرحت اشتیاق کا ”جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو“ کی دوسری یا شاید تیسری قسط تھی۔ مجھے اتنی پسند آئی کہ پچھلی اقساط تو پڑھیں ہی ساتھ اگلے شمارے سے خود خریدنا اور اسے سنبھال سنبھال کر لکھنا شروع کر دیا۔

بات کروں گی نئے سال کے پہلے شمارے کی تو سب سے پہلے ٹائٹل، مختلف رنگوں کے پھولوں سے سجایا (جو بالوں میں لگے تھے) ایک دلی خوشی سے ہنسنار کر گیا۔ ”ہنسی سنی“ اور کرن کرن روشنی سے مستفید ہونے کے بعد انشاء جی کو پڑھا۔ ”نئے سال کی دہلیز پر“ سب کے جوابات ایچھے لگے۔

عنیزہ سید ”جو رکے تو“ کو رکے نہیں دے رہیں بلکہ بہت خوش اسلوبی سے لیے رواں دواں ہیں۔ بہت خوب! ”میرے خواب لوٹاؤ“ گنت جی بہت زبردست لکھ رہی ہیں۔

”زمین کے آنسو“ گنت سیما (مائی فیورٹ) اس قسط نے بہت دلایا اور بہت کچھ سوئے پر، کھوجنے پر مجبور کیا۔ ہر کردار ہی زبردست ہے، کچھ سکھاتا ہوا، کچھ سمجھاتا ہوا، اسکا ویلڈن گنت جی۔ ”تیرے میرے درمیان“ مہوش افشار کی بہت اچھی تحریر تھی۔ ہمیشہ کی طرح اچھا لگا پڑھ کر مکمل ناول ”برف کا موسم“ سارہ رضا جب لکھا خوب لکھا۔ اس تحریر نے بنایا بھی اور لایا بھی، بہت بھی دلانی

اور حوصلہ بھی اگرچہ یہ تحریر میری بہن (موننا) کو کچھ خاص پسند نہیں آئی مگر مجھ سے پوچھیں تو مجھے یہ بہت ہی انوکھی اور خاص لگی۔ افسانے سارے ہی ایچھے لگے اور ناول ”ہم سے بے زمانہ“ کی نوکلیاں بات ”ہنسی لڑائی“ ڈانس ٹیٹ اور طنز و مزاح سے بھرپور تحریر مزادے لگی۔ نمونہ بخاری کی تو کہانی بات ہے، ہم سب اسی انداز تحریر کے تو پڑوانے ہیں ”نیکم نمیز“ اور ”بجل علی“ سے ملاقات اچھی لگی کیونکہ نیکم تو میری بھی فیورٹ ہے۔

ج، فریحہ! آپ کا طویل خط بڑھاتہ ردائی اور محبت کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ اللہ تعالیٰ خواتین اور شعاع سے آپ کا تعلق ہمیشہ برقرار رکھے۔ آمین

متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ ”برف کا موسم“ آپ کی بہن کو متاثر نہ کر سکا۔ ان سے کہیں کہ ہمیشہ علیحدہ خط لکھ کر تفصیل سے اپنی پسند ناپسند کے بارے میں بتائیں۔ خط کے لیے علیحدہ لفافے کی ضرورت نہیں، وہ آپ کے لفافے میں خط لکھ کر ڈال سکتی ہیں۔

### رائیل سعید... نامعلوم شہر

میں پندرہ سال کی عمر سے شعاع اور خواتین کی قاری ہوں۔ ویسے تو سب رائنرز ہی اچھی ہیں مگر عمیرہ احمد، نمروہ احمد، گنت عبد اللہ، فائزہ افتخار اور گنت سیما کی کیا بات ہے۔ اور ہمیں ان تحریروں سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔

اُن سوال پوچھنا تھا آپ سے۔ اگر کوئی شعر یا اچھی بات لکھ کر بھیجنا چاہوں تو کیا طریقہ ہوگا۔

ج راتیں! خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں

آپ ہمیں کوئی بھی انتخاب شعر لطیفہ یا کوئی اچھی بات لکھ کر بھیجنا چاہتی ہیں تو جس طرح آپ نے خط لکھا ہے۔ خط کے ساتھ علیحدہ لفافہ پر اپنا انتخاب بھی لکھ کر اسی لفافے میں رکھ دیتیں۔

### اترا کر م... گاؤں سلیمان شریف

آپ نے میرا خط شامل کیا بہت خوشی ہوئی اپنے گاؤں کے بارے میں پڑھ کر غلطی ہو گئی تھی وہ بار دو دو کلومیٹر دور نہیں بلکہ آدھا کلومیٹر دور ہے ہمارا کی طرح خواتین اس بار بھی بہت اچھا تھا۔ افسانے، ناول شاعری سب کچھ اچھا۔

ج پیاری اقرا! بارڈر آپ کے گاؤں سے آدھا کلومیٹر دور ہے دو کلومیٹر نہیں۔ غلطی کی تصحیح کر دی ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

### فوزیہ افضل... فیصل آباد

ساتویں کلاس سے خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ زمین کے آنسو بہت زبردست کہانی ہے۔ لگتا ہے کہ ادیب فاطمہ کا ملن ایک سے ہو گا۔ ”تیرے میرے درمیان“ کہانی بھی بہت پیاری ہے۔ خواتین کی تمام کہانیاں ہی زبردست ہیں۔ میری دوست بھی بڑے شوق سے پڑھتی ہے۔

ج پیاری فوزیہ! خواتین ڈائجسٹ کی محفل میں خوش

آمدید۔ اتنا مختصر سا خط ہمیں بالکل اچھا نہیں لگا۔ صرف دو کہانیاں پڑھو! آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

### حبیب بخاری... ذریعہ اسماعیل خان

اپنے نام کے ساتھ پیاری لکھا دیکھ کر باجیس ہی حلق

”کرن کرن روشنی“ سے فیضیاب ہونے کے بعد سب سے پہلے دو رنگائی شمو کی طرف۔ نمونہ کے جوابی شیلی سے ایک اور ملاقات بے حد پسند آئی۔ مگر بتا نہیں کیوں کچھ ست سا لگا۔

مکمل ناول میں سب سے زیادہ نمبر لینے والی گنت سیما۔ ”زمین کے آنسو“ بلاشبہ ایک ایسی کاوش ہے جو عرصہ تک قارئین کے ذہنوں پر تحریر ہونے والی ہے۔ احمد رضا کو ٹریڈی کرکٹسٹ بنانا، پلنگز گت، پلنگز۔

بائی رہی ناولوں کی بات تو گنت عبد اللہ اور عنیزہ سید یہ دونوں تو ہیں ہی شاندار رائنرز۔ مگر میں عنیزہ سے اتنا گنا چاہوں گی کہ عنیزہ کاش آپ میری دوست یا بہن ہوتیں تو میری ”آٹھ“ بہنوں والی حسرت پوری ہو جاتی۔ (ہم ہاشم اللہ سے سات نہیں ہیں۔)

اور اب بالکل آخر میں ”میں چند الفاظ بہن شبنم اکرم کے لیے لکھنا چاہوں گی۔ آپ کا خط پڑھ کر مجھے اس قدر بے چینی رہی کہ۔ ساری رات ہی میں سو نہ سکی۔ میں آپ کی بہت اور دینی سوچہ بوجھ کی داد دیتی ہوں۔ دنیا واقعی فانی ہے۔ جو چیز اللہ دیتا ہے لینے بھی قادر ہے۔

ج پیاری حبیبہ! محض الفاظ تھیں بلکہ اپنی تمام مصنفین اور قارئین خصوصاً وہ جو ہمیں خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں ہمیں بے حد پیاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے آپ سب کی خوشیوں کے لیے دعا گو ہیں۔

خواتین کی پسندیدگی کا شکریہ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ آٹھ بہنوں کی حسرت کی وجہ بھی بتا دیتیں۔ سات کا ہندسہ تو بہت اچھا ہے۔ ہماری ساری کلاسک کہانیوں میں سات شہزادیاں ہوتی ہیں۔ پھر آپ کو آٹھ بہنوں کی حسرت کیوں؟

آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں آپ کا انداز تحریر تو اچھا ہے۔ یقیناً کہانیاں بھی اچھی ہوں گی۔

### شمرین اکرم... میرپور خاص سندھ

میرا تعلق خواتین اور شعاع سے بہت پرانا ہے اب جب کہ میری شادی کو بھی تین سال ہو چکے ہیں شعاع اور خواتین سے محبت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ میں اب بھی خاموش قاری ہی رہتی مگر مجھے فرحت اشتیاق صاحبہ کے ناول ”جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو“ نے آکسایا کہ اگر انہیں خراج تحسین پیش نہ کیا تو یہ تو زیادتی ہو گی نا؟ اور آل آپ کا رسالہ بہت شاندار ہے میرے فیورٹ رائنرز میں عمیرہ احمد، فرحت اشتیاق، نمروہ احمد، تیرہ رزاقی اور بھی بہت ہیں ”آپ کا بارود جی خان“ اور ”موسم کے پکوان“ کا



ج ثمرین باخواتین کی محفل میں خوش آمدید ہماری جانب سے اپنے شوہر صاحب کا شکریہ ادا کر دیں جو آپ کو باقاعدگی سے خواتین اور شعاع لا کر دیتے ہیں۔ فرحت اشتیاق تک آپ کی طرف پہنچا رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے آپ نے خط لکھا اب یہ سلسلہ جاری رکھیے گا۔

زندگی نے کئی کروٹیں لیں، بچپن گزرا۔ لڑکپن بھی جوانی کی حدود میں داخل ہوا۔ تبدیلی کئی شادی ہوئی اور اب تک اس شادی خانہ آبادی کے توسط سے دو کلیاں بھی گھر آگئیں مہکانے کو موجود ہیں۔ سسرال، میاں، بچے، دوست احباب میں سے اپنے پیارے ڈائجسٹوں کے گئے وقت نکالنا۔ خواتین اور شمع کا ساتھ یوں جیسے حیات کامل ہو جائے۔ سارے سلسلے بہترین ہیں اچھے لگتے ہیں پیارے نبی سے لے کر خوب صورت بیٹے تک سارا رسالہ کھول کے پڑھتی ہوں (واقفہ وقفے سے) خواتین کی بے شمار کامنیوں نے توجہ کھینچی۔ تبصرہ کرنا جاہلگرہائے سستی مجبوری اور بھی بہت کچھ اب سوچا قلم اٹھائی لوں۔

زین کے آنسو..... تبصرہ محفوظ..... کوہ گراں تھے ہم  
..... یقیناً مل توں یاد رکھی جانے والی حُرّ عجزہ سید اے  
تارے بانے..... سائے فقیر زندگی کے گرتا ہائی گھر بنی کھوئی  
مزا آجاتا ہے..... نعت عبد اللہ اپنے محبت بھرے انداز میں  
بہترین..... مسئلہ یہ نہیں کہ کس کو اچھا کہا جائے مسئلہ تو یہ  
ہے کہ کس کو زیادہ اچھا کہا جائے مجھے تو ہر اثر سے پیار  
ہے سب وہ پرانی لکھاری ہوں یا نئی آنے والیاں..... گلہ  
بھی ہے عید ہے..... تزیلہ ریاض سے، عید وہ احمد کوئی  
دی کو پیاری ہو، کیس اور تزیلہ ایسی پاکو پیاری ہو، کیس کہ

اپنی پیاری پڑھنے والیوں کو بھول ہی گئیں۔  
 کمائیاں میرے اندر جم گئی ہیں، کروٹیں بدلتی ہیں۔ مگر  
 صفحہ قرطاس پر نہیں بکھرتیں۔ جی چاہتا ہے چپ کا قفل  
 ٹوٹ جائے۔ جس جب حد سے بڑھ جائے تو بارش کا  
 امکان بڑھ جاتا ہے۔

ج ام عبید! چلیں اتنا تو ہوا کہ آپ نے خواتین کی محفل میں شرکت کی۔ ان شاء اللہ جلد وہ دوبار ش بھی ہوگی۔

مسز رشید احمد۔ تحصیل میلسی

میں 2002ء سے آپ کے پرچے پڑھ رہی ہوں، ان دنوں خود ڈاسا آسمان، خواتین ڈائجسٹ میں چل رہا تھا۔ اب خط لکھنے کی وجہ عزیزہ سید کا ناول ”جو رکے تو کہو گراں تھے ہم“ ہے۔ ماشاء اللہ بہت خوب صورتی سے لکھ رہی ہیں۔

اس نے علاوہ رخسانہ نگار عدنان بالکل غائب ہیں، مہاراجہ ملک، فرحت اشتیاق، جبین سرسبز ان سب سے بھی لکھوائیں۔ باقی آپ کے سب سلسلے بہت اچھے ہیں۔

رج: آپ نے اپنا نام نہیں لکھا، نام انسان کی شناخت ہوتی ہے، اپنی شناخت تو قائم رکھنی چاہیے۔

خوانسار: خانجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ، رخسانہ نگار پچھلے کچھ عرصہ سے مصروفیت کی بنا پر لکھ نہیں پا رہا۔ اس ماہ سے شعاع میں ان کا ناول ”ایک بھی مثال“ شروع ہو رہا ہے۔

میں تقریباً "4th کلاس سے شفاعت اور خواتین  
ڈائجسٹ بڑھ رہی ہوں۔ یعنی میرا اور آپ کا خاموش  
تعلق پچھلے نو سال سے ہے۔ ہماری ساری رائے ریزی بہت  
اچھا لگھتی ہیں۔ لیکن فرحت اشتیاق، ماما ملک، منموہا،  
عنیزہ سید، بشری سعید، نگہت عبداللہ کی تو تعریف کرنا  
ہمارے بس میں ہیں۔

اب آتے ہیں اس ماہ کے رسالے کی طرف توجہنا۔  
 نامنٹل بہت اچھا تھا۔ سارے سلسلے ہی زبردست تھے۔  
 عنینیزہ سید کی زبردست تحقیق ”کوہ کراں تھے ہم“ میں  
 - دادرماہ نور کا کردار بہت زبردست ہے۔ پلینز انہیں جدا  
 مت کیجئے گا۔ زمین کے آنسو فٹائنگ سیما جی، لیکن پلینز  
 احمد کو کسی طرح بچا لیتا۔ افسانے سارے ہی زبردست تھے  
 - گنت جی تھسی تے گریت ہو۔ کیا زبردست ناول ہے۔

میں نے بہت سے ناول پڑھے لیکن پتا نہیں کیوں مجھے ایک ناول نبیلہ ابرار کا ”میں کی کراں یار مناواں“ میرے ذہن سے نہیں نکلتا۔ کیا محبت خواب سفر کتابی شکل

ج پاری بشری! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔  
نبیلہ ابرار جہ اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان  
سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں ”محبت خواب سفر“ کتابی  
شکل میں آچکا ہے۔

ماڈل کے بالوں کا انداز بہت پیارا تھا۔ ”ہم سے ہے زمانہ“ دلچسپ کر خوشی کی انتہا نہ رہی۔ مجھے یہ سلسلہ بہت پسند ہے۔ مجھ کو بخاری ہر ماہ لکھا کرتی نا! موش افتخار کا ناول یوں تو بہت زبردست تھا مگر عادل کا انجام کچھ برا تو ضرور ہونا چاہیے تھا۔ سارہ رضا کا ناول بہت پسند آیا۔ ویسے ابن صفی میرے بھی پسندیدہ ناول نگار ہیں۔ میری بہت خواہش ہے کہ عمران سیریز اور کر نل فریدی پڑھوں مگر یہاں کے کسی بھی کتب فروش کے پاس نہیں ہیں۔ ابن انشاء کو میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ افسانوں میں راشدہ رفعت کا فسانہ بہت پسند آیا۔ تنہائیاں ڈرامے میں سارہ یوسف کی بہن کا کیا نام ہے؟ کیا وہ بھی کراچی کی ہے؟ ”میرے خواب لوٹاؤ“ تنہائیاں میں جلدی پڑھتی ہوں یا صفحات کم ہوتے ہیں۔

ج عاشرہ! ہمیں افسوس ہے پچھلے ماہ عاشرہ ارام کے بجائے آپ کا نام عاشرہ رانا شائع ہو گیا۔ سارہ یوسف کی بہن کا نام علشید یوسف ہے۔

”کوہ گراں تھے ہم“ اتیار فیکٹ ناول سب ناولز سے مختلف۔ زمین کے آنسو تھیں اپنے آنسو لگتے ہیں، ہر بار پڑھنے پر آنکھوں میں آنسو آنا لازم ہے۔ میرے خواب ٹوٹا ہوا دست زبردست جا رہا ہے مگر دست رفا رہا ہے۔ نئے سال کا شمار بہت خوب۔ خواتین کا ہر شمارہ اتیار فیکٹ کے مونی اور ڈائجسٹ آنکھوں و ہمانا، نہیں۔ میں یں آپلی مایہ کی، بہت لادلی ہوں 10 ممبر کو ان کی شادی ہو چکی ہے

ایحدہ کی، بہت لادلی ہوں 10 ممبر کو ان کی شادی ہو چکی ہے

اوہ فرحت آبی پلیز ہمیں کسی اور  
خوب صورت ملک کی سیر ضرور کروائیے گا۔ ہم بہت مختصر  
ہر آب کا آبد کے ہمارے نام میں شہر، ظفر کا خطا، رنجہ کر

دکھ ہوا۔ اقرا اکرم جی آپ کا بارڈر اتنا پیارا ہے میرے  
 بہنوئی بھی آپ کے بارڈر ڈیوٹی کرتے ہیں!

حج بیماری عفت! بہن کی شادی کی مبارک باد اور  
 دعائیں اللہ تعالیٰ انہیں خوش و خرم رکھے آمین۔ خواتین  
 ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ متعلقہ مصنفین تک  
 آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

میں تقریباً چھ سال بعد آپ کی محفل میں شریک  
ری ہوں وجہ یونیورسٹی میں لیچرار شپ اور شادی کی  
مصروفیات میں الجھ کر رہ گئی ہوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں  
ہے کہ میں نے شعاع اور خواتین چھوڑ دیے تھے۔ بس ایک  
ڈائجسٹ جو ایک دن میں حکم کرتی تھی ایک مہینے میں حکم  
کر دیتی تھی۔ جس چیز نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا۔ وہ حقیقت  
بھائی (جو ابھی انگلینڈ سے پاکستان آئے ہیں) کا بصرہ ہے جو  
انہوں نے میرے بیڈ روم میں پڑے خواتین اور شعاع  
ڈائجسٹ دیکھ کر کہا ”مائیں! شادی کے بعد بھی تمہاری  
لڑکیوں والی عادت نہیں گئی اور میں ان کے تبصرے پر بے  
ہوش ہوتے ہوتے پچی خراب آتے ہیں اس ماہ کے  
شمارے کی طرف۔ سب سے پہلی بات کرتے ہیں موش  
افکار کے مکمل ناول ”تیرے میرے درمیان“ کی پہلی قسط  
میں مصنفہ کی جو گرفت نظر آئی وہ آخری قسط میں کم تھی  
بہر حال انابیہ اور تیمور کے ملاپ نے کہانی کو چار چاند لگا  
دیے اور خاص طور پر یہ فقرہ جس نے میں کی جگہ ہم کالفت  
استعمال کر کے اس کی چار سالہ اذیت مٹادی تھی اس کے  
بعد تیرہ بخاری کا ناول ”ہم سے ہے زمانہ“ ہمیشہ کی طرح  
ترو تازہ کر گیا۔ شبلی اور جوادی کی حرکتوں نے کئی بار ہنسنے پر  
مجبور کر دیا۔

تراشیدہ رفعت کا افسانہ ”کمی ان کمی“ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو متعارف کروا گیا۔ تعلیم انسان کو بزدل نہیں بناتی بلکہ مروت سکھاتی ہے۔ باقی سب ناولٹ اور افسانے اچھے تھے۔

جبل علی اور نیلم میرے ملاقات اچھی رہی۔  
ج باری صفیہ! آپ تو ابھی کم عمر ہیں لیکن ہم نے تو  
70 سالہ خواتین کو بھی خواتین پر دھتے ہوئے دیکھا ہے۔  
ہمارے ہاں بہت سے ایسے خطوط آتے ہیں جن میں لکھا  
ہوتا ہے کہ وہ خواتین ڈائجسٹ کی ہیلپر پرچے سے قاری



ہیں اور اب وہ نانی دادی بن چکی ہیں لیکن خواتین کا مطالعہ جاری ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

تمنیت احمد۔ غازی پور

زرد رنگ کے درمیان خوب صورت نین نقش والی کھلے گلاب جیسی ماڈل بہت پسند آتی۔

”عنیزہ سید“ کا ناول اچھا جا رہا ہے لیکن کچھ کردار ابھی بھی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ ”میرے خواب لوٹاؤ“ بھی اچھا ہے۔ نگہت سیما کا ناول ”زینت کے آنسو“ پڑھ کر شاگ لگا۔ فلک شاہ اور عمارہ کی زندگی کے انکشاف نے روٹے کھڑے کر دیے۔ انسان غصے میں ایسی باتیں کر جاتا ہے کہ جس کے نتائج بھیانک نکلتے ہیں۔

افسانے سارے ہی اچھے تھے ”رنگین خواب“ میں انسان کی تنگی کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ ”کئی ال کی“ میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے۔ ایسی حقیقت کا سامنا پڑھی لکھی خصوصاً گاؤں کی لڑکیوں کو کرنا پڑتا ہے۔

ج. پیاری تمنیت! نگہت سیما نے وضاحت کی تھی، صرف امام حنیفہ کا کہنا ہے کہ اس صورت میں طلاق واقع ہو جاتی ہے یعنی فقہ حنفی کی رو سے طلاق واقع ہو جاتی ہے دیگر فقہوں میں ایسی صورت حال میں طلاق واقع نہیں ہوتی۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔

صاعقہ جبین۔ (بھلوان) سرگودھا

خواتین ڈائجسٹ گھر آتے ہی اس پر کور چڑھایا جاتا ہے تاکہ ناٹل خراب نہ ہو۔ پلیز آئی! عمیرہ احمد اور مریم عزیز سے بھی کچھ لکھوائیں۔

ج. پیاری صاعقہ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی کمائیاں ابھی پڑھی نہیں اگر اچھی ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

امبر گل۔ جھٹ (سندھ)

ہزاروں مشغلے ہیں جو مجھے مصروف رکھتے ہیں

مگر محسن وہ ایسا ہے کہ پھر بھی یاد آتا ہے کچھ یاد نہیں کہ آخری بار خواتین میں خط کب لکھا تھا سو اس بار سوچا کہ جنوری 2012ء کے خواتین پر کچھ تبصرہ کرنی چاہیے۔

سب سے پہلے ناٹل بہت ہی اچھا لگا مجھے اس بار اب بات کروں اس ناول کی جس نے اشارت سے ہی مجھے اپنے سحر میں لے لیا تھا جی عنیزہ جی کا ناول ”کوہ گراں تھے ہم“ اس کا ایک ایک کردار اپنی اپنی جگہ جیسے انگوٹھی میں گینے کی طرف فٹ ہے۔ اس کے بعد پیاری آتی ہے ساتھ جی کی مجھے بالکل ایسا لگتا ہے کہ راحت جیوں جو تیرید اہو گئی ہیں ”میرے خواب لوٹاؤ“ ناول بہت زبردست جا رہا ہے مگر جب پڑھنے لگتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے 4 صفحے جو 5 منٹ میں پڑھ کر ختم ہو جاتے ہیں پلیز اس کے کچھ صفحات تو پڑھاؤں۔ عجیب سی تشکیلی محسوس ہوتی ہے۔ موش افکار کا ناول اس بار بس سو سو لگا۔

آفریدی سعید بھائی محمد حفیظ جنید خان، عمر گل یہ بھی تو ہمارے ہیرو ہیں ناناں کے انٹرویو بھی ہیں۔

ج. پیاری امبر اطویل عرصہ بعد آپ نے خط لکھا، بہت خوش ہوئی۔ کبھی کبھی انسان ہر چیز سے اکتانے لگتا ہے۔ کوئی خاص وجہ بھی نہیں ہوتی پھر کبھی کسی چیز میں دل نہیں لگتا۔ اس کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ یہ بڑھ جانے تو نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ مازہ ہوا میں چل قدمی آپ کی ذہنی کیفیت بہتر بنا سکتی ہے۔

تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ شاہین رشید تنک آپ کی فرمائش پر بخار ہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

یاسمین کنول۔ پسرور ضلع سیالکوٹ

خوب صورت سرورق کے ساتھ سال نو لکھا ہوا خواتین موصول ہوا۔ مجل علی اور نیلم میر سے مل کر خوشی ہوئی۔ ”میرے خواب لوٹاؤ اور کوہ گراں تھے ہم“ اچھے جگہ پر ہیں۔ جنوری کی شام اور کئی ان کی بہترین افسانے لگے۔ غزلوں میں انور سعید کی غزل بہترین لگی۔ تیرے میرے درمیان کی آخری قسط پڑھ کر مزا آیا۔

باقی کراچی کے حالات پڑھ کر دل بہت دکھتا ہے۔ قائد کے شہر اور روشنیوں کے ٹکڑوں کی نظر لگ گئی تکتے سالوں سے حالات دیگر گول جیلے آرہے ہیں۔

ج. پیاری یاسمین! کراچی کے حالات کی ذمہ داری سب سے بڑھ کر کراچی کے شہریوں پر عائد ہوتی ہے اگر وہ حالات سنوارنے کا عزم کر لیں تو کوئی بھی حالات نہیں بگاڑ سکتا۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔

سندھو احسن۔ ساکن پھر

جنوری کا شمار بہت اچھا تھا اور سرورق بھی شان دار تھا۔ نو مہر میں فرحت اشتیاق کے ناول کی آخری قسط پڑھی اختتام اچھا تھا فرحت جی آپ میری فیورٹ رائٹر ہیں آپ آپ جلدی کچھ اچھا لکھیے گا پلیز اور شاہین رشید سے کہیں ”نند مصطفیٰ“ سے انٹرویو یوں پلیز۔

ج. پیاری سندھو احسن! ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نند مصطفیٰ کا انٹرویو شائع ہو چکا ہے۔ شاید آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ساتھ سعید۔ ڈنگہ شہر

اس بار خواتین منگوا لیا تو تیار چلا کہ خواتین تو ختم بھی ہو گیا۔ ہر دکان سے تیار کرایا لیکن میں ملا تو بہت دکھ ہوا، اب مجھے خواتین ڈائجسٹ چاہیے۔ کیا مجھ مل سکتا ہے؟ اس کے علاوہ میں خواتین ڈائجسٹ کی سالانہ خریدار بننا چاہتی ہوں اس کے لیے میں کیا کروں؟ خواتین ڈائجسٹ ہیٹ لیٹ ملتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

ج. پیاری ساتھ! خواتین ڈائجسٹ لیٹ ہو جانے کی بہت سی وجوہات ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ کراچی کے حالات ہیں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں خواتین آپ کو جلد مل سکے خواتین ڈائجسٹ کا ذمہ دار کا شمار آپ کو کھڑے بھجوا سکتے ہیں۔ آپ اپنا ایڈریس بھجوا دیں۔ ہم خواتین وی پی کر دیں گے۔ آپ کو سو روپے دینا ہوں گے۔

خواتین ڈائجسٹ کی سالانہ خریدار بننے کے لیے آپ 600 روپے مئی آرڈر کروں۔ آپ کو گھر بیٹھے پرچا ملتا رہے گا مئی آرڈر اس آرڈر پر کریں۔

خواتین ڈائجسٹ۔ 37 اور بازار کراچی اپنا ایڈریس صاف اور واضح لکھیں۔

ساتھ خورشید۔ راولپنڈی میں ”خواتین ڈائجسٹ“ 1997ء سے باقاعدگی سے

پڑھ رہی ہوں۔ خط لکھنے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو موش افکار کا ناول ”تیرے میرے درمیان“ بہت پسند آیا۔ اس کی تعریف کرنی تھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مجھے بھی لکھنے کا شوق ہے۔ اس کا طریقہ کار جاننا چاہتی ہوں۔

ج. پیاری ساتھ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعا میں۔ لکھنے کا طریقہ یہ ہے۔ صفحے کے ایک جانب اور سطر چھوڑ کر لکھیں اور بذریعہ ارجنٹ میل سروس بھجوائیں۔

آمنہ اجالا۔ ڈھرکی

سال نو جنوری کا خواتین ڈائجسٹ اس بار خلاف توقع کچھ جلدی مل گیا۔ سرورق نہایت ہی دلکش تھا۔ لمبی چوٹی میں رنگ برنگے پھول سجائے خوب صورت سی مکان کے ساتھ ماڈل بہت پیاری لگی۔ فہرست میں ای. اے. ف. ٹ. رائٹرز ٹاپا جیلانی اور نبیلہ عزیز کو نہ بیکر تنویر اہر مزا ہوئے۔ پلیز تنزیلہ ریاض، سعیدہ عزیز، آفریدی، سعیدہ حمید چودھری، فاراد ارشد اور ایک بہت ہی پیاری رائٹر ریحانہ آفتاب ہم آپ کی خوب صورت تحریروں کے شدت کے منتظر ہیں۔

سال نو کا ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے ہم دوسری مرتبہ مزا تب ہوئے جب اپنا بیچتا ہوا انتخاب رشتے، رابطے، کسی اور کے نام سے چھا ہوا لکھا۔

دو اقساط پر مشتمل موش افکار کا مکمل ناول ”تیرے میرے درمیان“ کے رشتوں کی منافقت کو عیاں کر رہی تھی لیکن سچائی کتنے ہی پردوں میں کیوں نہ چھپی ہو ایک دن سامنے آکر رہتی ہے اختتام حسب توقع بہت اچھا ہوا۔ ”برف کا موسم“ ساتھ رضا کا مکمل ناول بھی بے حس اور خود غرض رشتوں کا واضح عکس تھا۔

ج. پیاری آمنہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا انتخاب کسی اور نام سے شائع ہو گیا۔ آئندہ خیال رکھیں گے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ٹاپا جیلانی کا مکمل ناول موصول ہو چکا ہے۔ آپ جلد پڑھ سکیں گی۔

انجم فاروق۔ لاہور

جنوری کی شام اور کئی ان کی دونوں افسانے اچھے تھے۔ رنگر، خواب ستار کن نہیں تھا۔ ہم سے بے زمانہ



ناولٹ اچھی پیشکش تھی۔

زمین کے آنسو، تیرے میرے درمیان اور برف کا موسم یہ تینوں ناول بھی اچھے سبق آموز تھے۔ ڈاکٹر انور سدید کی غزل موجود تھی، یہ ہمارے گھر کے بالکل ہی سانسے رہائش پذیر نقاد ہیں۔ ”بیمار کا حال اچھا ہے“ انسانی زندگی کے داؤ بچ کا خوب صورت جائزہ ہے۔

جج انجم اخواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی تحریریں پڑھی نہیں۔ قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

صفیہ عباس خان۔ کروڑ لعل عین منقطع لہ 15

میں 8th کی طالبہ تھی جب سے میں یہ دونوں ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ اب میں ایم اے کر چکی ہوں اور ایک اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ نہ میں نے لیے ناول یا افسانے بھیجے، نہ کسی کے انٹرویو کی درخواست کی، نہ کبھی شاعری بھیجی، نہ آپ کے ڈائجسٹ میں کوئی نقص نکالا، نہ کھانا پکانے کی ترکیب بھیجیں، نہ کوئی فرمائش کی۔ جب بھی خط لکھا ہمیشہ تعریف کی پھر آپ میرا خط کیوں نہیں چھاپتے؟

اس بار ٹائٹل پہ ماڈل بہت اچھی لگی۔ سب سے پہلے نگہت سیمکا کا ”زمین کے آنسو“ پڑھا بہت اچھا جا رہا ہے۔

موش افتخار کا ”تیرے میرے درمیان بہت زبردست تھا۔“ ”برف کا موسم“ منفرد اور بہترین تھا۔ ایڈ بہت مزے کا تھا۔ شعاع اور خواتین پڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بہت سے مذہبی واقعات سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ شاعری مجھے بہت پسند ہے اور خواتین میں مجھے میری پسند کے سب شاعروں کی شاعری ملتی ہے۔

جج پیاری صفیہ! آپ ہمیں بے ناول اور افسانے بھجواتیں انٹرویو کی درخواست کرتیں۔ ڈائجسٹ میں نقص نکالتیں۔ کھانا پکانے کی ترکیب بھیجیں، ہم سے کوئی فرمائش کرتیں تب بھی ہم آپ کا خدا شاکر کرتے۔ یہ

سلسلہ صرف پرچے کی تعریف کے لیے نہیں شروع کیا گیا۔

آپ کے پچھلے خط شائع نہیں ہوئے تو اس کی صرف ایک وجہ ہے، وہ یہ کہ آپ کے خط ہمیں موصول ہی نہیں ہوئے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کے اشعار شائع کیے جا رہے ہیں۔

حبیبہ اختر۔ راولپنڈی

میں آپ کے تمام پرچے خاص طور پر خواتین، تقریباً بیس سال سے پڑھ رہی ہوں۔ تمام سلسلے واقعی بہت زبردست ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میں بھی لکھوں۔

جج حبیبہ اخواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ کہانیاں بھجوائیں اگر قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

ثمینہ کوثر۔ ڈوگر گجرات

ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ سب سے پہلے ”زمین کے آنسو“ نگہت سیمکا آپ کے کیا کہنے، میں فقط اتنا ہی کہوں گی ”احمد رضا“ کے لیے امید کا آخری دیار روشن رکھیے گا۔

اور ”میرے خواب لوٹاؤ“ زبردست جا رہا ہے ”تیرے میرے درمیان“ بہت اچھا تھا۔

اور میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ ”باروفا“ قسط وار شائع ہوا تھا یا ایک ہی قسط میں ختم ہو گیا تھا۔

جج پیاری ثمینہ اخواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعا میں۔ باروفا کی اقطار پر متمثل تھا۔ اب یہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ اس کو منگوانا چاہتی ہیں تو 200 روپے درج ذیل ایڈریس پر مئی آرڈر کریں

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی کتاب آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گی۔



ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی دی جیٹل یا ڈیٹا ڈیٹا کی تکمیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی حصے کے استعمال سے پہلے پبلشرس تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

## خیریاور سکی

### تبصیر نشاط

کر دیا کہ ماہرہ خان کی اپنے شوہر سے علیحدگی ہو گئی ہے۔ کیونکہ ماہرہ کے شوہر علی عسکری کو ان کے شوہر میں کام کرنے اور ان کے بعض نامناسب لباس پہننے پر اعتراض تھا۔ چنانچہ ان کی اپنے شوہر سے ہم نوائی نہ ہو سکی اور انہوں نے نامناسب لباس اور بیوی چھوڑنے کے بجائے خود انہیں ہی چھوڑ دیا۔ ماہرہ خان اور علی عسکری نے ابھی تک ان افواہوں کی تردید یا تصدیق نہیں کی ہے۔ ان دونوں نے اپنی پسند سے شادی کی تھی اور ان کے دوسرے بھی ہیں۔



### افواہیں

شعب منصور کی فلم ”بول“ متنازعہ موضوع کے باوجود سپر ہٹ رہی۔ فلم کی ہیروین بی بی کی دنیا سے آنے والی ماہرہ خان تھیں، مگر بول بالا صرف عمیمہ ملک کا ہی ہوا۔ کیونکہ ماہرہ خان اور عاطف اسلم تو اس میں ”بیبی“ ہیرو ہیروین ہی تھے۔ کہانی کا اصل مرکزی کردار تو عمیمہ ہی کا تھا۔ اس فلم سے ماہرہ خان کو توجہ کے بول نہ ملے تو انہوں نے دوبارہ بی بی کی ہم سفری اختیار کی۔ ان کی یہ ”ہم سفری“ بہترین ہے۔ چنانچہ ہر طرف ان کے اس ”خرومندانہ“ فیصلے کی دھوم مچ گئی۔ ان کی سیریل ”ہم سفر“ بلاک ہسٹرو اور خود ماہرہ خان ہزاروں یا شاید لاکھوں مداحوں کی مرکز نگاہ ٹھہریں۔

ان ہی میں سے کچھ نگاہوں نے تاڑ لیا کہ ماہرہ خان کی اپنے ہم سفر سے کچھ ان بن ہو گئی ہے۔ سو وہ ان دونوں اپنے بچوں کے ساتھ اپنے والدین کے گھر میں مقیم ہیں۔ تاڑنے والی ان نگاہوں کے یہ افسانے زبانوں تک بھی پہنچ گئے اور کہنے والوں نے کہنا شروع





(ذرا دھیان سے غمیمہ جی! سنجو بابا کی اصلی شیرنی کو پتا چل گیا تو وہ چرچا کر کے میں ایک لمحہ بھی نہیں ٹکا میں گی۔۔۔ اور پھر ہمیں بادل خواستہ ہی سہی ہمیں یہ کہنا ہے پڑ جائے کہ "لوٹ کے بدو گھر کو آئے")

وہیے تو مشرقی اور مغربی روایات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن فی زمانہ یونی مشرق کی ہو یا مغرب کی تقریباً "ایک ہی جیسے رویے کا مظاہرہ کرنی نظر آتی ہے۔ وہ زمانے گئے جب ہیوی اپنے سر تان کی پابند تھی۔ اب تو اکثر گھڑیاں ہیں۔ عوامی شوہروں کو اپنے اشاروں پر نچانی نظر آتی ہیں۔ نمرانی ثانیہ مرزا تو ان سب سے بھی ایک قدم آگے نکلیں کہ انہوں نے اپنے شعیب میاں کو سب کے سامنے "سر چیئل" ہی نہ چاہا والا۔ اور چیئل بھی کون سا؟ ثانیہ کے اپنے میکے کا چیئل۔ پیاری ہیوی کی فرمائش شعیب بھلائیے ٹال سکتے تھے، سو انہوں نے بھی سر ایوں کے سامنے خوب ٹھیکے لگائے۔ ثانیہ نے بھی ان کا ساتھ دیا اور حاضرین محفل



جھولی میں ڈال دیے گئے۔ فوری طور پر انہیں بڑے  
بزنر کی ایک فلم ”شیر“ بھی مل گئی۔ اپنی فلم میں  
حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے ایک پھر شاید عمیمہ  
شیر ”کو اس قدر بھانپ کہ شیر نے ان سے دوستی کر لی۔  
دوستی ہو اور تجھے تحائف کا سلسلہ نہ ہو“ کیسے ہو سکتا  
ہے بھلا۔ سو اس روایت پر عمل کرتے ہوئے شیر نے  
عمیمہ پر تحائف کی بارش کر دی۔ جس میں بیش  
قیمت ہیروں کا ہار بھی شامل ہے۔ کیونکہ یہ شیر کوئی عام  
شیر نہیں بلکہ جانے پہچانے ”سنجوبیا“ ہیں۔ سرحد پار  
کی اطلاعات کے مطابق بجنے دت عرف سنجوبیا اپنی  
اس نئی دوست پر بے حد مہمان ہیں۔ وہ ہالی ووڈ میں قدم  
جمانے کے لیے عمیمہ ملک کی ہر طرح سے مدد کر  
رہے ہیں۔ کیونکہ ایک تو عمیمہ پر دیہی اور پھر بجنے  
دت کی ہیروین (فلم کی) کچھ اور سوچنے کی اجازت  
نہیں) تو سنجوبیا انہیں تنہا کیسے چھوڑ سکتے تھے بھلا۔  
عمیمہ ملک اپنے سے دینی عمر کے شیر کی شیرینی بن  
کر بے انتہا خوش تو تھیں ہی، اب ان کی کرم فرمایوں  
پر بھی بے حد مسرور ہیں اور سنجوبیا کے سارے  
تحائف اپنی دوستی کا خراج سمجھ کر خوشی خوشی وصول کر

بعد میں بروگرام کے شرکاء کی چھپر چھاڑ کا جواب دیتے ہوئے شعب نے بتایا کہ میں نے اس کے لیے بہت محنت کی تھی۔ جان بنانے کے لیے ڈھیر سارا دودھ بھی پیا۔

اکاش: اتنی محنت ہر مرتبہ میچ سے پہلے کر لیں تو دوس  
میں سے صرف ایک میچ میں کارکردگی بہتر نہ ہو بلکہ کم  
از کم سات میں تو ہو ہی۔۔۔ ڈانس قلوب پر رفا رفس  
دیتے اور ٹانیہ کو اٹھاتے ہوئے شعیب یہ بھول گئے کہ  
انہوں نے اپنے کندھوں پر ملک و قوم کی عزت کا بار  
بھی اٹھایا ہوا ہے۔

ناچ گانا ان کے سرسالی ملک کی ثقافت سی، مگر سرسالی خاندان کی ہرگز نہیں ہوگی، کیونکہ ان کی اہلیہ کا تعلق ایک مسلمان گھرانے سے ہے۔ پھر ہماری قوم کا مزاج بھی شیعہ کو یاد رہنا چاہیے کہ فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والی کسی شخصیت کو ہم کسی حد تک نظر انداز کر بھی دیا کرتے ہیں کہ یہ ان کا کام ہے۔ لیکن کھیل، فنون لطیفہ کا حصہ نہیں ہے۔ اس لیے کھیلوں سے وابستہ شخصیات سے ہم سنجیدگی کی توقع رکھتے ہیں ویسے بھی پاکستانی کرکٹ ٹیم کا مذہبی اہمیت سب کے سامنے ہی ہے۔

ہماری حکومت کا حال اس مالی جیسا ہے جو ہر روز صبح کو اپنے پانچ کی دیکھ بھال کے لیے جاتا ہے اور جس بوہے یا درخت کے پتوں میں کیڑا لگے نظر آئے ان تمام پتوں کو کاٹ کر مطمئن ہو جاتا ہے، لیکن اگلی صبح پھر اس کے پودوں اور درختوں کے پتے کیڑوں نے کھا لیے ہوتے ہیں۔

○ ڈرون حملوں میں صرف بے گناہ لوگ نشانہ بنتے ہیں۔ اب تک جتنے افراد ہلاک ہوئے ہیں ان میں پونے دو سو تو صرف بچے ہیں۔

○ اس چیز کے طبی ماہرین کے مطابق بروقت کھانے سے جسم کو موٹاپے سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ کیونکہ وقت پر کھانا کھانے سے جسم متوازن اور تندرست رہتا ہے۔

○ فریج میڈیا کامولانا طاہر القادری کو خراج تحسین۔  
(میڈیڈسے پی پی)

○ ابھی کل تک امن کی آشا کا راگ الیا جا رہا تھا۔  
 اب یہ حال ہے گیارہ بھاری ریاستوں کے پیش۔  
 زائد شہروں سے شائع ہونے والے ہندی زبان کے  
 اخبار ”جانن“ نے ایک شراکتہ سرخی کے ساتھ  
 مضمون لکھا ہے ”پانچ منہ کی تیسری ایک بن دبانے  
 کی دیر۔“ اور پاکستان تباہ۔“

○ بلدیہ عظمیٰ اس وقت اپنی تاریخ کے سب سے بدترین بحران سے گزر رہی ہے۔ ادارے کے ملازمین کو کئی ماہ سے تنخواہیں بھی نہیں دیے سکی ہیں۔ رواں سال میں 6 کروڑ کی رقم سے زائد رقم مختلف اداروں کو بانٹ دی۔ ان میں کلفٹن کا ایک معروف نجی اسکول جیسس اینڈ میری بھی شامل ہے۔ جہاں پر صرف امراء اور صاحب ثروت لوگوں کے بچے پڑھتے ہیں۔ اس اسکول کو چالیس لاکھ روپے امداد کے نام پر دے دیے گئے۔

(ایکسپریس نیوز)



- خواتین ڈائجسٹ میں قارئین کی شرکت کے لیے یکن کے حوالے سے ہمارا ایک مستقل سلسلہ ہے ”آپ کا باورچی خانہ“ جس کے سوالات یہ ہیں۔
- 1: کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ پسند ناپسند غذائیت گھروالوں کی صحت۔
  - 2: گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں، کھانے کا وقت ہے۔ کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کر کے تواضع کر سکیں۔
  - 3: یکن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے، آپ یکن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟
  - 4: صبح کا ناشتا ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟ ایسی خصوصی چیز کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہیں۔
  - 5: گھر سے باہر کھانا کھانا فیشن بنتا جا رہا ہے۔ آپ مینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟ (1) جب کوئی لے جائے (2) کسی کی سالگرہ پر (3) یا کسی خوشی کے موقع پر۔
  - 6: کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مد نظر رکھتی ہیں؟
  - 7: اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟
  - 8: یکن کی کوئی ٹپ جو بننا چاہیں؟

## آپ کا باورچی خانہ

شائستہ ابوالحسن

- باورچی خانہ اور خاتون خانہ کلاچوی دامن کا ساتھ ہے اور یہ ساتھ شادی کے بعد ذمہ داری میں بدل جاتا ہے ہر اچھی اور گھر خاتون خانہ کی طرح مجھے بھی اپنے شوہر اور بچوں کو مزے مزے کی چیزیں بنا کر کھلانے کا شوق ہے اور مہمان آجائیں تو اور بھی اچھا لگتا ہے کہ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اور جب اللہ ہی رازق ہے تو اس کے بندوں سے کیا گھبرانا وہی انتظام کرے گا۔
- (1) بجٹی کھانے میں بچوں اور شوہر نام داری کی پسند تو لازمی ہے اور اگر اس میں غذائیت بھی شامل ہو جائے تو پھر کیا کہنے اور میاں جی کے دل تک رسائی بھی تو معدے سے ہی ہوتی ہے۔
- (2) اچانک مہمان آجائیں تو میں پریشان نہیں ہوتی کیونکہ فریزر میں شامی کباب، کوٹے اور بخینی بنا کر پیشہ رکھتی ہوں تاکہ نام بھی کم لگے اور مہمان داری
- انڈے  
مرچ پیسی ہوئی  
پداوھنیا  
ہلدی  
ٹماٹر  
پیاز  
اورک لسن  
ہری مرچ ہراوھنیا اوپر سے ڈالنے کے لیے  
اور کوکلب آئل
- چار عدد  
حسب ذائقہ  
ایک چائے کا چمچ  
ایک چائے کا چمچ  
آوھالی اسپون  
ایک عدد درمیانے سائز کا  
ایک عدد درمیانے سائز کی  
ایک چائے کا چمچ

ترکیب :

پہلے پیاز کو کٹ کر تھوڑی سی پیاز بچا کر باقی ساری پیاز گولڈن کر لیں پھر انڈے اور ہری مرچ ہراوھنیا چھوڑ کر سارے سالے آئل میں ڈال کر بھون لیں۔ انڈوں کو پھینٹ کر ایک فرانی پن میں تھوڑا سا پانی ڈال کر گرم کریں اور چھینے ہوئے انڈے اس میں دو منٹ پکائیں جب تک چائے تو جو لمبے سے اتار کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ٹکڑے کر لیں اور بھونے ہوئے سالے میں ڈال کر کچے سے کس کر دیں اوپر سے ہراوھنیا ہری مرچ اور پیاز ڈال کر دو منٹ دم پر رکھ دیں یقین کریں کہ دس منٹ میں مزے دار ڈش تیار ہے بالکل مغز کا مزاد بتی ہے جو لوگ مغز کھانے کے شوقین ہیں ان کو ضرور پسند آئے گی۔

(3) کھانا پکانے کی صفائی کرتی ہوں۔ پوچھا گیا کہ لال بیک کا سپرے ضرور کرتی ہوں تاکہ لال بیک نہ ہونے پائیں۔ صفائی کے مقصد کے علاوہ مجھے لال بیک سے ڈر بھی لگتا ہے۔

(4) ناشتے میں ہمیشہ بدل بدل کر بناتی ہوں اگر رات کا سالن ہوا تو پراٹھا بناتی ہوں، فرنیچ سوٹ یا کبھی کوئی سوٹ ڈش یعنی بین اور انڈوں کا حلوہ بناتی ہوں۔ اس کی ترکیب بھی حاضر خدمت ہے۔

بین اور انڈوں کا حلوہ

اجزا :

انڈے  
بین  
گھی  
چینی  
سبز الائچی  
میوہ

دو عدد  
چار کپ  
آوھاکپ  
آوھاکپ  
چار دانے  
اگر دل چاہے تو

ترکیب :

پنٹی میں گھی ڈال دیں پھر اس میں بین ڈال کر بھونیں۔ چمچ مسلسل ہلاتے رہیں تاکہ نیچے سے لگ نہ سکے الائچی دانے نکال کر ڈال دیں۔ ساتھ ہی چینی

بھی۔ چینی ٹھنکنے لگے تو انڈے پھینٹ کر ڈال دیں۔ پھر تیز ہاتھوں سے اس وقت تک بھونیں جب تک گھی الگ ہو جائے۔ عموماً ”یہ ڈش میں ناشتے ہی میں بنانی ہوں مگر میرے بچے کو میرے ہاتھ کا یہ حلوہ اتنا پسند ہے کہ وہ اکثر شام کی چائے پر بھی فرمائش کر کے بنوانا ہے۔ آپ بھی ٹرائی کیجئے گا۔ یقیناً“ آپ کے بچوں کو بھی پسند آئے گا۔

(5) باہر کھانا کھانا کم ہی ہوتا ہے۔ کبھی کوئی خاص موقع ہو یا مہمان کا موڈ دیکھ کر باہر چلے جاتے ہیں ورنہ نہیں۔

(6) کھانے موسم کے حساب سے ہی اچھے لگتے ہیں مثلاً ”سرہوں میں پائے“ ماش کی کچھڑی، گرمیوں میں بلکے پھلکے کھانے اور برسات میں بین کی روٹی، لسن کی چینی اور اچار کے ساتھ (منہ میں پانی آگیا نا؟)

(7) اچھے کھانے کے لیے ڈش کے لوازمات پورے ہوں اور محبت سے اللہ کا نام لے کر لپکایا جائے تو قسم سے گھر والے انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔

(8) کھانا پکانے سے پہلے میں بسم اللہ پڑھتی ہوں اور پھر درود شریف پڑھتی رہتی ہوں۔ اسماء الہی بھی پڑھتی ہوں۔ اس سے کھانے میں برکت بھی ہوتی ہے اور کھانا خوش ذائقہ بھی بنتا ہے۔

ان سوالات کے جواب بھجوا کر آپ بھی اس سلسلہ میں شرکت کر سکتی ہیں۔ ساتھ ایک عدد تصویر بھی بھجوائیں۔

اس ماہ آپ کا باورچی خانہ میں جس بہن نے انعام حاصل کیا ہے۔ ان کا نام ہے۔

شائستہ ابوالحسن۔ کراچی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے مبارکباد۔ دسمبر میں بشری نوید پاچوہ اور جنوری میں شیم افتخار ویر انعام کی حتمی قرار پائی تھیں۔

آپ سب بہنوں سے درخواست ہے کہ اپنے مکمل پتے بھجوا دیں تاکہ انہیں انعام ارسال کیا جاسکے۔





## موگہ پیکوالہ

خالہ جیلدنی

رس ملانی

اجزا :

دودھ

خشک دودھ

پھنگ پاؤڈر

انڈا

چینی

کھج

الائیچی

بادام پستے

ترکیب :

ایک کلو  
ایک کپ  
ایک چائے کا چمچ  
ایک عدد  
ایک کپ  
ایک کھانے کا چمچ  
پانچ عدد  
حسب ضرورت

اجزا :

چکن

شملہ مرچ

نٹاؤ کھج

دودھ میں چینی، الائیچی اور بادام، پستے ڈال کر لیاں

لیں۔ خشک دودھ میں پھنگ پاؤڈر، انڈا اور کھج (کھی  
اگر جما ہوا ہے تو بہت اچھا ہے) ملا کر گوندھ لیں۔  
ہاتھ کھنے کر کے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنالیں۔ دودھ میں  
جوش آجائے تو درمیانی آگ کر کے ساری نکلیں ڈال  
دیں۔ چمچ چلاتے رہیں۔ تھوڑی دیر بعد جب یہ بھول  
جائیں اور دودھ گاڑھا ہو جائے تو انار لیں اور ٹھنڈا  
کر کے پیش کریں۔

لال چکن

آدھا کلو

ایک عدد

دو کھانے کے چمچ

ٹماٹو پوری

ٹماٹر

پیاز

لہسن پیسٹ

کٹی سیاح مرچ

نمک

تیل

ترکیب :

آدھا کپ

ایک عدد

ایک عدد

ایک چائے کا چمچ

آدھا چائے کا چمچ

حسب ذائقہ

حسب ضرورت

پیاز، ٹماٹر اور شملہ مرچ کو چوکور کاٹ کر رکھ لیں۔  
چکن کی ہڈیاں نکال کر چھوٹی بوٹیوں کی شکل میں کاٹ  
لیں۔ کڑائی میں تیل گرم کر کے چکن ڈال کر فرائی  
کریں۔ پھر لہسن پیسٹ ڈال کر بھونیں۔ نمک،  
مرچیں اور ٹماٹو پوری ڈال کر پانچ منٹ پکھنویں۔ تیل  
الگ ہو جائے تو پیاز، ٹماٹر، شملہ مرچ اور کھج ڈال  
کر مکس کردیں اور تھوڑی دیر پکائیں پھر پیش کریں۔

روسٹڈ چکن سوپ

اجزا :

چکن بھینڈی

گاجر

مٹر

پیاز

کارن فلور

انڈا

مکھن

لہسن پیسٹ

پسی سرخ مرچ

پسی سفید مرچ

نمک

ترکیب :

تین پلاؤ  
آدھا کپ  
آدھا کپ  
ایک عدد  
دو کھانے کے چمچ  
ایک عدد  
ایک کھانے کا چمچ  
دو چائے کے چمچ  
آدھا چائے کا چمچ  
آدھا چائے کا چمچ  
حسب ذائقہ

اجزا :

چاول

چانپس

پیاز

سونف

دار چینی

بڑی الائیچی

چھوٹی الائیچی

کالا زیرہ

تیز پات

نمک

گھی

کشمیری پلاؤ

تین کپ

چھ عدد

چار عدد

دو کھانے کے چمچ

چار ٹکڑے

دس دانے

دس دانے

ایک چائے کا چمچ

چار پتے

حسب ذائقہ

آدھا کپ

دینی میں تقریباً "پندرہ کپ پانی ڈالیں۔ اس میں  
چانپس (بکری کی ٹانگ کی لمبی ہڈی بھی لی جاسکتی ہے)  
تیز پات، بڑی الائیچی، دار چینی، سونف اور نمک ڈال کر  
میں منٹ تک ہلکی آگ پر پکائیں۔ پیاز کو الگ سے  
براؤن کر کے ڈال دیں۔ پانچ منٹ پکانے کے بعد اتار  
کر ٹھنڈا کر کے چھان لیں۔ یہ تقریباً "سات کپ بخنی  
ہوگی۔ کم ہو تو پانی شامل کر لیں۔ ایک پتلی میں بخنی  
ڈالیں۔ ابال آجائے تو چاول ڈال دیں۔ اب کالا زیرہ  
اور چھوٹی الائیچی کے ساتھ نمک ڈالیں اور ایک کٹی  
ابال لیں۔ پانی خشک ہونے پر الگ سے گرم کیا ہوا گھی  
چاولوں کے اوپر ڈال کر ڈھکن بند کر کے دم لگادیں۔  
مزے دار کشمیری پلاؤ تیار ہے۔



سب کچھ بھول جائیں۔ بددعا جس کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے۔ وہ دلوں کا حال جانتا ہے۔ بلاوجہ کی بددعا میں قبول نہیں ہوتیں۔  
البتہ ایک بات بہت ضروری ہے کہ کسی ایسے سائیکائسٹ سے مل لیں۔ کچھ دوائیں ایسی ہیں جو آپ کی ذہنی کیفیت بہتر بنانے میں مدد دے سکتی ہیں۔ کچھ عرصہ یہ دوائیں استعمال کرنے سے آپ بہتر محسوس کریں گی اور اس طرح بلاوجہ کی ٹینشن سے نکل آئیں گی۔

### ایک بہن فیصل آباد سے

میں گھر میں سب سے چھوٹی ہوں اور کالج کی طالبہ ہوں۔ میرا قد تقریباً "پانچ فٹ" ہے، رنگ گندمی اور چہرے کے نقش عام سے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ گھر والے اور عزیز و اقارب اکثر اوقات میری رنگت اور چہرے اور نقوش کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ کسی جاننے والے کے گھر جاؤں یا کسی محفل میں تو یہی ذکر چھڑ جاتا ہے۔ بہن بھائی تو سفید اور خوب صورت ہیں۔ یہ کس پر ہے، کالی ہے، ناک دیکھو، اس کی آنکھیں یہ وہ وغیرہ۔ نقص نکالتے ہیں۔ جب سے شعور آیا ہے تب سے ایسی باتیں سننے کو مل رہی ہیں۔ یہ سن سن کر ذہنی ٹینشن کا شکار ہو گئی ہوں۔ ذہن پر بھائی کی طرف بھی صحیح طرح مبذول نہیں ہوتا۔ اب یہ حال ہو گیا ہے کہ کالج کی ہر لڑکی سے اپنا موازنہ کرتی ہوں اور بعد میں محسوس ہوتا ہے، میں اس کے مقابلے میں کمتر ہوں۔ عزیز و اقارب سے ملنا جلنا دھڑکتا ہے۔ بہت کم کسی کے سامنے جاتی ہوں۔ لوگوں کی باتوں نے اتنا بخانا دیا ہے کہ چہرے پر کڑھکی سی آگئی ہے اور عمر سے بڑی دکھائی دینے لگی ہوں۔ اکثر لوگ سمجھتے ہیں، میں بڑی، بہن ہوں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ تقریبات میں جانے کے لیے بناؤ سنگھار کروں تو مجھے فوراً احساس دلایا جاتا ہے، میں کیا لگ رہی ہوں۔ اپنی تیاری پر اندر رہی اندر شرمندہ رہتی ہوں، جی چاہتا ہے، کسی کو نے میں چپ چاپ بیڑی رہوں۔ دوسرے سمجھتے ہیں کہ میں مغرور ہوں، ٹیک چڑھی ہوں، بڑی شے جیسے خطابات دیتے ہیں۔ اگر کوئی تنقیدی لباس پہن لوں تو اب اپنا آپ برا لگنے لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے، جیسے میرا خوشیوں اور قیمتی چیزوں کو زیر استعمال لانے کا کوئی حق نہیں۔ حق صرف اس کو ہے جو خوب صورت ہے۔

پیاری بہن! آپ کا خط پڑھ کر افسوس ہوا۔ دراصل ہمارے ہاں لوگ خوبصورتی کے مفہوم ہی سے واقف نہیں ہیں۔ اپنی تعلیم، ذمہ داریوں، اخلاقیات اور اہلیت کو کو جمع کرنا اور اطمینان کے ساتھ پورا کرنا، اپنی اندرونی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور اپنی ذات سے دوسروں کو آرام، سکھ اور خوشیاں دینا ہی اصل خوبصورتی ہے۔

پیاری بہن! آپ اپنا مطالعہ بڑھائیں۔ فارغ وقت میں اچھی کتابیں پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ اصل چیز ظاہری خوبصورتی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جن صلاحیتوں سے نوازا ہے، انہیں اجاگر کرنے کا نام خوبصورتی ہے۔ دوسرے ایک غلط فہمی جس میں بیشتر لوگ مبتلا ہیں، وہ یہ ہے کہ صرف گوار رنگ ہی خوبصورتی کی ضمانت ہے حالانکہ میں سمجھتا ہوں اصل چیز شش ہے۔ آپ اپنی باطنی خوبیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں۔ اپنے لباس کی تراش خراش پر توجہ دیں۔ اچھے خیالات رکھیں، کیونکہ برے خیالات چہرے کو بگاڑ دیتے ہیں۔ منفی خیالات سے چھکارا پائیں۔ مندرجہ بالا تحریر کی روشنی میں خود کو تبدیل کر کے دیکھیں اور مجھے خط بھی لکھیں کہ اس سے آپ کو کیا فائدہ پہنچا۔ اب تو بہت سی ایسی کتابیں بازار میں ملتی ہیں جن میں رنگ نکھارنے، وزن کم کرنے اور شخصیت کو بہتر بنانے کے لیے مشورے ہوتے ہیں۔ آپ ان پر عمل کر کے بہت حد تک خود کو بہتر بنا سکتی ہیں۔

\*\*\*

آفسانی شخصیت کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایک ناقابل بیان اور ناقابل تشریح چیز ہے اور کچھ باتیں بعض لوگوں میں ہوتی ہیں اور بعض اس سے محروم ہوتے ہیں۔  
ماہرین نفسیات نے یہ انکشاف کیا ہے کہ شخصیت کی نشوونما تربیت کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔ شخصیت کا

انحصار سیکھنے پر ہے۔  
شخصیت سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کے ساتھ بھلائی یا خدمت کرنے کی یوزیشن میں ہو تو وہ بھلائی کا کام کرے اور دوسروں کی خدمت کرے اور دوسروں کے کام آئے۔ اس طور زندگی گزارنے سے خوشیوں، شادمانیوں اور مسرتوں کی دولت حاصل ہوتی ہے اور قلبی سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔  
ایمرن کہتا ہے۔

”مسرت اور شادمانی ایک عطر ہے اور اس کی خوشبو تم دوسروں تک اسی وقت پہنچا سکتے ہو جب چند قطرے اسے اوپر ڈال لو۔“  
لیکن اصل خوشی، مسرت اور شادمانی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب دوسروں کو مسرت و شادمانی پہنچانے کے لیے کسی صلے اور لالچ کے بغیر کام کیا جائے۔

ایک خاتون میں پشیمانی اور افسردگی کے آثار تھے، اس کا خیال تھا کہ اب وہ بوڑھی ہو چلی ہے اور چہرے پر جھریاں پڑنے والی ہیں۔ دراصل اس کے پاس اب کچھ کرنے کو نہیں تھا۔ اس کی دلچسپیاں بھی کم تھیں اور اس نے اپنے ارد گرد کے لوگوں کے بارے میں بھی سمجھی نہ سوچا تھا۔  
پھر کسی کے مشورے پر وہ چند گھرانوں کی مدد کرنے لگی۔ بعض کی روپے میسے کی مدد کے علاوہ ان کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے لگی۔ ان کی مشکلات میں ان کا ساتھ دینے لگی۔ اسے اس بات کی فرصت نہ رہی کہ کوئی بوڑھا خیال اس کے قریب آئے یا کوئی منفی سوچ اس کے پاس سے گزرے۔

\*\*\*

### ع۔ نامعلوم شہر

ماہرین نے خط لکھا ہے۔ گھر میں کسی وجہ سے ان کا جھگڑا ہوا تو انہوں نے ناز بابتیں کیں اور بددعا میں بھی دیں۔ بعد میں انہیں پشیمانی ہوئی تو سوچ سوچ کر ٹینشن کا شکار ہو گئیں اور جہاں جاب کرتی ہیں وہاں بھی ان کا رویہ خراب ہو گیا۔ اب اس کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہیں۔  
اچھی بہن! پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ ایک اچھی لڑکی ہیں کہ آپ کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے اور پشیمانی محسوس کرتی ہیں۔ جہاں تک گھروالوں کا تعلق ہے وہ آپ کے متعلق بھی غلط نہیں سوچیں گے لڑائی جھگڑے کے دور ان اس قسم کی باتیں منہ سے نکل جاتی ہیں لیکن انہوں نے آپ کے لیے کوئی بھی غلط نہیں سوچا ویسے بھی انہیں آپ کی ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ ہو گا اور وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ غصہ میں اکثر آپ کے منہ سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جو حقیقت آپ کہنا نہیں چاہتیں، اس لیے آپ اطمینان رکھیں کہ وہ آپ کے بارے میں غلط نہیں سوچیں گے اور نہ آپ کو غلط سمجھیں گے جہاں جاب کرتی ہیں، وہاں اپنے رویے کی معذرت کر لیں۔ اور



اس کے بعد صابن سے منہ دھولیں۔ شمد کے ذریعے  
کئی وٹامنز اور معدنیات حاصل ہوتی ہیں۔ آپ اسے  
روزانہ اپنے ناشتے میں شامل کریں۔ آپ چاہیں تو  
فروٹ جوس، دلیہ، دہی یا دودھ میں ملا کر استعمال کر سکتی  
ہیں۔ شمد حسن اور صحت کے لیے بہترین ہے۔  
فوری نتائج کے لیے درج ذیل نسخوں پر عمل  
کریں۔

سیب کے بیج باریک پیس لیں۔ رات کو ان کا گاڑھا  
لیپ ہونٹوں پر لگائیں۔ تین دن میں ہونٹ صحیح ہو  
جائیں گے۔

اس سے آسان نسخہ یہ ہے کہ چند گلاب کی پتوں کو  
پیس کر دودھ میں ملا لیں، اس پیسٹ کو لگا کر سوئیں،  
دوسرے تیسرے دن ہی فرق واضح ہونا شروع ہو جائے  
گا۔

### فائرہ..... کراچی

س : میری عمر تیس سال ہے..... گزشتہ ایک سال  
سے میری آنکھوں کے نیچے کالے حلقے بڑھ گئے ہیں۔  
میں نے کئی کریمیں اور گھریلو نسخے بھی استعمال کر لیے  
مگر اس سے فرق نہیں پڑا۔ مجھے کوئی ایسا علاج بتائیں  
جس سے یہ حلقے دور ہو جائیں۔

ج : آنکھوں کے نیچے حلقے پڑنے کی کئی وجوہات ہو  
سکتی ہیں۔ مثلاً "نیند کا پورا نہ ہونا" تازہ ہوا کی کمیابی،  
غیر متوازن غذا، پریشانی اور آنکھوں میں کھنچاؤ وغیرہ۔  
اپنی غذا میں وٹامن اے اور آئرن کا اضافہ کریں۔ یہ  
ایسیا آپ کو سبز یوں، خصوصاً "گاجر" پھلوں اور انڈے  
میں مل جائیں گی۔ گاجر، خوبانی اور پھلی میں بھی وٹامنز  
اور معدنیات ہوتی ہیں۔ اگر آنکھوں میں کوئی تکلیف  
ہے تو ڈاکٹر سے چیک کروائیں۔ پتلا نمکیہ استعمال  
کرنے سے خون کی گردش کم ہو جاتی ہے۔ اس طرف  
بھی توجہ دیں۔ پہلے اصل خرابی کا پتا لگائیں، پھر علاج  
اسی مناسبت سے کریں۔



امت الصبور

## سچی بھینس

### شازیہ..... کراچی

س : میری عمر چوبیس سال ہے اور میرے ہونٹ  
بہت بھینے ہیں۔ کیا اس کی وجہ وٹامنز کی کمی ہے؟ اگر ایسا  
ہے تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ رات سونے سے قبل  
ہونٹوں پر شمد لگاتی ہوں اور دن میں لپس جیل لگاتی  
ہوں مگر ان سب سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔  
ج : اصل میں آپ کے اندر نمی کی کمی ہو گئی ہے۔  
پینے والی اشیاء میں اضافہ کریں۔ روزانہ دس سے پارہ  
گلاس پانی، پھلوں کا رس اور سبز یوں کا جوس پیئیں۔ ان  
سے آپ کے جسم میں ضروری وٹامنز منتقل ہوں گے  
اور نمی کی کمی پوری ہوگی۔ اپنے ہونٹوں پر دن میں تین  
بار کولڈ کریم لگائیں۔ کچھ کھانے یا پینے سے قبل اس  
کریم کو ضرور صاف کریں۔ رات میں کریم لگا کر  
سوئیں۔ صبح کے وقت اسے کان سے صاف کریں اور